مؤلف

محمد إدریس زبیر

پی۔ایچ۔ڈی

علم حدیث

مصطلحات اور اصول

مؤلف

محمد ادریس زبیر

نام کتاب ------------ علم حدیث مصطلحات اور اصول

مؤلف ------------ ڈاکٹر محمد ادریس زبیر

ناشر ------------ الہدیٰ پبلی کیشنز، اسلام آباد

ایڈیشن ------------ اوّل

ISBN ------------ 978-969-8665-51-7

تعداد ------------ تین ہزار

قیمت ------------

تاریخ طبع ------------ 20 مارچ 2013ء، 7 جمادی الاول 1434ھ

ملنے کے پتے

اسلام آباد: 7-اے کے بروہی روڈ H-11/4 اسلام آباد، پاکستان

فون: +92-51-4866130-1 +92-51-4866125-9

Email: salesoffice.isb@alhudapk.com

www.alhudapk.com www.farhathashmi.com

کراچی: 30-اے سندھی مسلم کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی، پاکستان

فون: +92 -21-34528548 +92-21-34528547

امریکہ: PO Box 2256 Keller, TX 76244

Ph: (817)-285-9450 (480)-234-8918

Email: alhudaonlinebooks@ymail.com

کینیڈا: 5671 McAdam Rd Mississauga Ontario L4Z IN9 Canada

Ph:(905)-624-2030 (647)-869-6679

ww.alhudainstitute.ca

عنوانات کتاب

☆☆☆☆☆

تعارف

تحقیق وریسرچ کی مبادیات سے لے کران کی انتہاء تک جو ضابطے اور اصول ہو سکتے ہیں اور انہیں جو نام دیا جاسکتا ہے انہیں دے دیجئے مگر محدثین کی اس سلسلے میں امکانی کوششوں کی بھی داد دیجئے جو انہوں نے ایک تاریخ ساز اور عہد آفرین فن کو متعارف کرایا۔ اس علم کی تدوین کے بعد شاذ و نادر ہی کوئی نئی مصطلح متعارف ہوئی جو اس میں اضافے کا باعث بنی۔ آج بھی تحقیق کے تمام اصولی ضابطے اور سوتے وہیں سے پھوٹ رہے ہیں۔

ان اصطلاحات کے مصادر کیا ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں۔ خطیب بغدادی پر اللہ تعالی اپنی رحمتوں کی برکھا برسائے جنہوں نے اس فن میں ڈوب کر اس کے محاسن کو اجاگر کیا اور اسے مربوط شکل دی۔ شاید ہی کوئی مصطلح ہو جس پر ان کی وقیع کتاب یا تحریر نہ ہو۔

مصطلحات اپنی حیثیت منوا چکیں تو یہ بات بھی دیکھنے میں آئی کہ ان مصطلحات کو دیگر ماہرین علوم نے بھی استعمال کیا ہے۔ اور ہر ایک نے اپنے اپنے علم کے فنی تقاضوں کے مطابق اس کی تعریف و مراد لکھی اور بتائی۔ بالخصوص معتزلہ نے ان مصطلحات کی تعریف و مراد اپنی سوچ اور رجحان کے مطابق کی۔ ایسے فقہی اصول بنائے جن سے صحیح حدیث کو ضعیف، موضوع یا رائے وقیاس سے ٹکرا دیا جائے اور اصول حدیث کے آگے بند باندھا جا سکے۔ جس کا صلہ بھی انہوں نے خوب پایا اور معمولی شدھ بدھ والا بھی انجانے میں انہی کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ محدثین کی اولین جماعت تو اس رخنہ اندازی کو بخوبی جان کر اپنے موقف پر ڈٹی رہی اور ان عقل کے متوالوں کی تک بندیوں پر بصد افسوس آگاہ بھی کرتی رہی۔ اس لئے کہ اس کے نتائج انکار حدیث کے سوا کچھ نہ تھے۔ اور ہوا بھی یہی جس کا خدشہ پیارے رسول نے اپنی حدیث میں ظاہر کر دیا تھا۔ مگر متأخر محدثین نے انکار حدیث کے جہاں معقول جواب کے انبار لگائے وہاں اصول وقواعد کو بھی منضبط کیا اور انہیں بھی مصطلحات کا حصہ بنا دیا۔ اس کتاب کی یہی منفرد بات ہے کہ اصول حدیث کو اصول فقہ کا ہم پیالہ وہم نوالہ ثابت کیا گیا ہے۔

یہ مصطلحات واصول کیا ہیں ایک لمبی، تھکا دینے والی محنت وکوشش اور دیانت دارانہ نقد کا مختصر مگر عاجزانہ اعتراف واظہار۔ یہ سن لینا کتنا آسان ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف۔ مگر اس لفظ کے پیچھے انتھک محنت کا اندازہ صرف اسے ہو سکتا ہے جو تخریج حدیث کے مراحل سے اپنے آپ کو گزارتے ہیں۔

مؤلف

انتساب

ان شخصیتوں کے نام جن کی حدیث و علم حدیث
دوستی نے مجھے متأثر کیا۔

☆☆☆

مولائے کائنات! میرا ہر اچھا عمل میرے مشائخ کرام کے لئے صدقہ جاریہ بنا دے۔

آمین یارب العالمین

علم حدیث

امام شافعی رحمہ اللہ کے اقوال کی روشنی میں

جب میں اصحاب حدیث میں سے کسی کو دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں نے اصحاب رسول میں سے کسی کو دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی بھرپور جزا دے انہوں نے ہمارے لئے اصل (بنیاد) کو محفوظ کیا۔ انہیں یقیناً ہم پر فضیلت حاصل ہے۔

☆☆☆☆☆

☆......اصحاب حدیث کو لازم پکڑلو کیونکہ وہ انسانوں میں سب سے زیادہ صواب پر ہیں۔

☆☆☆☆☆

☆......اگر یہ دوات و روشنائی نہ ہوتی تو آج منبروں پر زندیق لوگ ہی خطاب کر رہے ہوتے۔

☆☆☆☆☆

☆......امام علی بن المدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أَعْرَاضُ الْمُسْلِمِينَ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ، وَقَفَ عَلَى شَفِيْرِهَا اثْنَانِ: الْمُحَدِّثُونَ وَالْحُكَّامُ.

مسلمانوں کی عصمت و عفت سے کھیلنا گویا کہ جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھے میں گرنا ہے، جس کے کنارے دو قسم کے لوگ کھڑے ہیں: محدثین اور حکام۔

☆☆☆☆☆

بے سند بات یا قول، محض چھلانگ ہے جو اخلاف کا اسلاف سے کٹا ہونے کا ثبوت ہے۔ دین میں هَاتُوا بُرْهَانَكُم یعنی مستند دلیل و سند ہی اساسی شے ہے تاکہ اخلاف، اسلاف سے جڑ جائیں۔

چند اہم اصطلاحات

آحاد: واحد کی جمع ہے۔یعنی وہ خبر جسے ایک راوی روایت کرے۔محدثین ہراس خبر کو کہتے ہیں جو متواتر کی شرائط نہ رکھتی ہو۔متواتر کے سوا تمام روایات اخبار آحاد کہلاتی ہیں۔

ائمہ ستہ: اس سے مراد وہ چھ ائمہ محدثین ہیں جنہیں صحیح احادیث کو جمع کرنے، ان سے فقہی مسائل استنباط کرنے، انہی پر عمل کرنے اور انہی صحیح احادیث کی طرف دعوت دینے کا شرف حاصل ہوا۔جن میں سب سے بڑے اور انتہائی محترم ومعزز امام محمد بن اسماعیل بخاری، پھر امام مسلم بن الحجاج القشیری، پھر بالترتیب امام نسائی، امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ رحمہم اللہ ہیں۔

اثر: عربی میں باقی ماندہ کو کہتے ہیں۔اصطلاح حدیث میں یا تو یہ لفظ حدیث کا ہم معنی ہے یا پھر صحابہ وتابعین کی طرف منسوب ان کے اقوال، افعال اور فتاوی وغیرہ۔اسی کی نسبت سے کچھ علماء اپنے آپ کو اثری کہا کرتے۔

اجزاء: یہ جزء کی جمع ہے۔مختصر کتابچہ کو کہتے ہیں جس میں یا تو ایک ہی موضوع سے متعلق احادیث جمع ہوتی ہیں یا پھر ایک ہی راوی کی احادیث۔

اربعین: حدیث کی ایک مختصر ابتدائی کتاب جس میں چالیس احادیث ہوتی ہیں یا پھر چالیس شیوخ سے چالیس شہروں میں جا کر یہ احادیث سنی ہوتی ہیں۔جیسے اربعین نووی اور اربعین بلدانیہ۔

استشہاد: کسی روایت میں اضافہ کے ثبوت کے لئے یا ابہام کے ازالہ کے لئے کوئی اور روایت بطور شاہد کے تلاش کرنا جو معنی حدیث کو درست کردے۔

استنباط: لغت میں کنویں سے ڈول نکالنے کو کہتے ہیں۔اصطلاح میں آیت یا حدیث یا سیرت نبوی وصحابہ سے کوئی شرعی مسئلہ یا حکم کشید کرنا کو کہتے ہیں۔

اسماء الرجال: یہ ایسا علم ہے جس میں حدیث کی سند کے ہر راوی کے نام، نسب، کنیت اور لقب کو اس لئے بیان کیا جاتا ہے تاکہ اس سے ملتے جلتے دوسرے راویوں کو نکھار دیا جائے اور ضعیف وثقہ میں فرق کیا جاسکے۔علماء

نے اس کی بیالیس سے زیادہ انواع لکھی ہیں۔

اصحاب سنن: یہ وہی چار ائمہ کرام ہیں جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے جنہوں نے السنن نام کی کتب لکھیں اور ان احادیث کو جمع کیا جن میں فقہی مسائل رسول اللہ ﷺ سے ثابت تھے اور یوں سب سے پہلے انہوں نے فقہی مسائل پر مبنی صحیح ترین کتب پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ یہ فقہ الحدیث کی کتب بھی کہلاتی ہیں۔

اصل: جڑ یا بنیاد کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں سند حدیث کی ابتداء جہاں سے ہوتی ہے اسے اصل کہتے ہیں۔

امام: علم دین کے انتہائی ثقہ، باعمل اور ماہر عالم کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع ائمہ آتی ہے۔ ہماری تاریخ میں بے شمار ائمہ کرام آئے۔ جو اپنے اپنے میدان کے ماہر ہونے کی وجہ سے امام کہلائے۔

باب: کتاب کا (Sub Chapter)، یہ وہ کتابی حصہ ہوتا ہے جس میں خاص مسئلہ کی طرف استنباط سے محدث راہنمائی کرتا ہے۔ اور جس کا مصدر اگلی حدیث ہے۔ یہی محدث کی فقاہت اور روایت کو ثابت کرتا ہے۔

تعارض: ایک ہی مسئلہ میں دو ہم پلہ مخالف احادیث کا ہونا۔ تعارض کہلاتا ہے۔ ورنہ یہ تعارض نہیں۔

ترجیح: بظاہر تعارض ہونے کی صورت میں دونوں احادیث میں جو قوی حدیث ہو اسے عمل واستنباط کے لئے زیادہ مناسب قرار دینا ترجیح کہلاتا ہے۔

تعدیل: راوی حدیث کی علمی، اخلاقی، اور اعتقادی حالت کے علاوہ اس کے حافظہ وغیرہ کو درست اور صحیح پانے کے بعد اسے ثقہ قرار دینا اسے تعدیل کہتے ہیں تاکہ اس کی حدیث قبول کی جا سکے۔

جامع: محدثین اپنی اصطلاح میں جامع اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں عموماً آٹھ قسم کی احادیث لکھی گئی ہوں۔

۱۔ احادیث عقائد وایمان   ۲۔ احادیث احکام   ۳۔ احادیث رقاق   ۴۔ احادیث آداب

۵۔ احادیث تفسیر   ۶۔ احادیث شمائل، تاریخ وسیر   ۷۔ احادیث فتن   ۸۔ احادیث زہد واخلاق

صحیح بخاری وصحیح مسلم دو ایسی کتب ہیں جنہیں جامع کہا جاتا ہے۔

جرح: راوی حدیث کی علمی، اخلاقی، اور اعتقادی حالت کے علاوہ اس کے حافظہ وغیرہ کو نادرست اور کمزور یا غلط پانے کے بعد اسے ضعیف قرار دینا اسے جرح کہتے ہیں۔

راوی: یہ وہ شخص ہے جو روایت حدیث کرتا ہے۔اس میدان میں اترنا گویا اپنے آپ کو ثقہ کہلوانا یا ضعیف کہلوانا ہوتا۔اس لئے بہت سے نااہل بھی ثابت ہوئے۔

سنت: صحیح حدیث سے ماخوذ فقہی،اعتقادی یا اخلاقی مسائل سنت کہلاتے ہیں۔دوسرے معنی میں سنت صرف رسول محترم ﷺ کے طریقے کو کہتے ہیں۔کسی اور کا طریقہ سنت نہیں کہلا سکتا۔

السنن سے مراد۔۔محدثین کے نزدیک۔۔وہ کتب حدیث ہیں جن کی احادیث کو ان کے مؤلفین نے فقہی ابواب کی ترتیب دی ہے۔جیسے کتاب طہارۃ،صلاۃ،زکوۃ،وغیرہ آخر تک۔اس لئے یہ فقہ الحدیث کی کتب ہیں۔ یہی وہ ترتیب ہے جسے بہت پسند کیا گیا اور یہی انداز تالیف ہے جو بعد کے فقہاء نے اپنی تصنیفات میں اپنایا۔

شیخین: امام بخاری وامام مسلم چونکہ ان محدثین میں سے ہیں جن کی فقاہت اور ثقاہت میدان حدیث میں سب سے برتر ہے اس لئے ان دونوں کو شیخین کے لقب سے کتب حدیث میں یاد کیا جاتا ہے۔

صحیحین: یہ نام بھی صحیح بخاری اور صحیح مسلم پر اس لئے چسپاں کیا گیا ہے کہ یہ دونوں صحیح احادیث روایت کرنے میں دوسری تمام کتب سے ممتاز ومنفرد ہیں۔

صیغہ تمریض: یہ وہ لفظ ہے جسے محدث روایت کے وقت اس وقت استعمال کرتا ہے جب اسے روایت کی صحت کا یقین نہ ہو۔جیسے: قِیْلَ، ذُکِرَ یارُوِیَ کے الفاظ۔

صیغہ جزم: یہ وہ لفظ ہے جسے محدث روایت کے وقت اس وقت استعمال کرتا ہے جب اسے روایت کی صحت کا یقین ہو۔جیسے: قَالَ، ذَکَرَ اور رَوَی وغیرہ کے الفاظ۔

طریق: راستہ کو کہتے ہیں اس کی جمع طرق ہے۔عموماً یہ لفظ سند کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

فقہ: قرآن وحدیث کے گہرے اور صحیح فہم کو کہتے ہیں۔یعنی قرآن کریم یا صحیح حدیث کی نص میں ڈوب کر ایک عالم اگر وقتی مسائل اور اشکالات کا حل نکالے خواہ ان کا تعلق عمل سے ہو یا حلال وحرام سے یا عقیدہ وایمان سے ہو اسے فقہ کہتے ہیں۔یہ مسائل چونکہ ہر دور میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اس لئے اسی دور کے علماء ہی اپنے اس گہرے دینی فہم سے اس کا جواب دینے کے اہل ہوتے ہیں۔اس لئے ہر وہ فقہ جو قرآن کریم اور صحیح حدیث سے ماخوذ ہو اور شخصی نہ ہو وہ اسلامی فقہ کہلاتی ہے۔مگر جو فقہ کسی امام کی طرف منسوب ہو اور اسی کی اقوال کے گرد گھومتی

ہو یا اسی کی طرف منسوب ہو وہ مذہبی یا شخصی فقہ کہلاتی ہے۔

متفق علیہ: جس حدیث کا متن صحیح بخاری و صحیح مسلم میں یکساں ہو مگر سند اپنی اپنی ہو اسے متفق علیہ کہتے ہیں۔

مروی: ہر وہ حدیث جو روایت شدہ ہو۔

مستملی: شیخ کی حدیث سننے کے بعد اسے بلند آواز سے مجمع میں دوسرے طلبہ تک پہنچانے والا۔ محدثین کرام نے محتاط مستملی متعین کئے ہوتے جو انتہائی چوکنے اور ہوشیار ہوتے۔

مقلد: کسی ایک امام کے مذہب کو بغیر دلیل کے ماننے والے کو کہتے ہیں۔ اس سے بہتر لفظ متبع یا مطیع کا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پیروکار کو یا آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرنے والے کو کہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

محدثین کے القاب

۱۔ **امیر المؤمنین فی الحدیث:** حدیث خُلَفَائِیْ مِنْ بَعْدِیْ سے یہ اصطلاح مأخوذ کی گئی ہے۔ محدثین میں یہ اعلیٰ ترین مقام و مرتبہ اور لقب ہے۔ معاصرین کے مقابلے میں جو حدیث اور علل حدیث میں اپنے حفظ، اتقان اور گہرائی میں لاثانی ہو۔ اور متاخرین کے لئے بھی وہ مرجع بن جائے۔ مثلاً: ابوالزناد عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ذکوان المدنی (م:۱۳۰ھ)، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن المبارک، شعبہ بن حجاج الواسطی، سفیان الثوری (م:۱۶۰ھ)، احمد بن حنبل، امام بخاری اور امام دارقطنی وغیرہ اپنے اپنے دور کے امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں۔ آج اس لفظ سے مراد امام بخاریؒ ہی لئے جاتے ہیں۔

ثِقَة: ایسا راوی جس میں عدالت، ضبط تام اور اتقان جیسی اعلیٰ صفات موجود ہوں۔ یہی لفظ اگر تکرار کے ساتھ ہو تو تعدیل کا اعلیٰ درجہ رکھتا ہے۔

ثَبْت: ایسا راوی جو عدل و ضبط کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو۔ اگر وہ ثقہ ہو تو تعدیل کا اعلیٰ درجہ اسے حاصل ہوگا۔

۲۔ حافظ: یہ لقب اس محدث کے لئے استعمال ہوا جو روایت ودرایت کا عالم و ماہر ہو۔ یعنی جو معنی ومفہوم حدیث کو بخوبی جانتا، سند حدیث پر گہری نظر ہو اور حدیث کے رواۃ کی جرح وتعدیل کا ماہر نیز ضعیف وصحیح حدیث میں فرق کرنا بھی جانتا ہو۔ جس نے شیوخ سے براہ راست علم حدیث حاصل کیا ہو۔ اس کا علم کتابی نہ ہو۔ اسے وہ اسانید متن سمیت ضرور یاد ہوں اور لکھی ہوئی بھی جن کی صحت پر علماء نقاد نے صاد کیا ہو یا جن رواۃ میں انہوں نے اختلاف کیا ہو۔ جیسے امام احمد بن حنبل، علی بن المدینی، یحیی بن معین اور امام بخاری رحمہم اللہ یگانہ روز گار حفاظ محدثین میں سے تھے۔ امام ابن حجرؒ (النکت ۱/۲۶۸) میں لکھتے ہیں:

حافظ حدیث ہونے کی چند شروط: یہ شروط جب کسی محدث میں جمع ہو جائیں تو وہ حافظ کہلانے کا مستحق ہے۔

۱۔ طلب حدیث میں شہرت ایسی ہو کہ رجال حدیث سے براہ راست احادیث سنی ہوں نہ کہ صحف سے احادیث لی ہوں۔

۲۔ رواۃ حدیث کے طبقات اور ان کے مراتب کی صحیح معرفت رکھتا ہو۔

۳۔ تجریح وتعدیل کی بھی اسے پہچان ہو، اور اپنے بکثرت حافظے اور متون کے استحضار کے ساتھ صحیح وسقیم میں تمیز کرنا کرنا جانتا ہو۔

۳۔ حاکم: جو تمام احادیث کا سندی اور متنی اعتبار سے اور جرح وتعدیل وتاریخ کے اعتبار سے احاطہ کر چکا ہو۔ جس سے علم حدیث کا بہت کم حصہ از بر ہونے سے رہ گیا ہو۔

۴۔ حجۃ: اسے تین لاکھ احادیث سند سمیت یاد ہوں اور احادیث کے ہر نکتہ پر اس کی گہری نظر ہو کہ وہ صحیح ہے یا ضعیف۔

۵۔ مُتْقِن: ضابط کو ہی کہتے ہیں۔ وہ جو ہر بات بڑی پختگی سے کرتا ہو اور اس پختگی میں کمزوری یا غلطی نہ ہو۔

۶۔ محدث: کسی بھی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ دینا کہ صحیح ہے یا ضعیف۔ حفظ حدیث اور فہم وعرفت کا متقاضی ہے۔ جو محدث حفظ کے ساتھ اپنی فہم وذکاء اور معرفت کو اس موقع پر نمایاں کرتا ہے وہ واقعی محدث

کہلانے کا مستحق ہے ورنہ نہیں۔خواہ اس نے کتنی ہی احادیث از بر کیوں نہ کر رکھی ہوں۔نیز محدثین اپنے فہم ومعرفت میں بھی مختلف درجات کے ہیں۔کوئی انتہائی اعلی مقام پر فائز ہے اور کوئی ادنی مقام پر۔اس لئے وقتاً فوقتاً اس کی تعریف میں مختلف آراء لکھی گئیں ہیں۔

أ۔تاج الدین سبکی لکھتے ہیں: محدث وہ ہوتا ہے جو اسانید وعلل کو جانتا ہو اسماء رجال اور سند عالی ونازل سے بھی اسے صحیح معرفت حاصل ہو۔بکثرت احادیث بطور خاص متون اسے از بر ہوں۔اس نے کتب ستہ کے علاوہ مسند احمد، سنن بیہقی اور معجم طبرانی وغیرہ اپنے مشائخ سے سنی ہوں۔اس کے علاوہ مزید ہزار کے قریب اجزاء حدیثیہ سے بھی شناسا ہو۔یہ محدث کا کم ترین درجہ ہوگا۔ان کتب کو سننے کے بعد وہ شیوخ حدیث کے پاس آتا جاتا ہے اور ان سے علل حدیث، وفیات رجال اور مسانید پر گفتگو کرتا ہے تب جا کر وہ محدثین کے ابتدائی درجات میں شامل ہوگا۔پھر اللہ تعالی جسے چاہے مزید نواز دے۔

ب. ابن سید الناس کہتے ہیں: ہمارے زمانہ میں محدث وہ ہے جو حدیث کی روایت ودرایت میں مشغول ہو۔اور رواۃ کے حالات کو جمع کرتا ہو۔اور اپنے زمانے کے رواۃ ورِدایات پر اس کی دسترس ہو۔اس میں وہ دوسروں سے ممتاز اس وقت ہوتا ہے جب حدیث میں اس کا خط پہچان لیا جائے اور وہ ضبط حدیث میں مشہور ہو جائے۔

ج. زرکشی کہتے ہیں فقہاء کی طرف سے محدث اسے نہیں کہا جاتا جو سند حدیث کو یاد کرلے اور اس کے راویوں کی تعدیل وتجریح کردے اور سماع سے کم پر اکتفاء کرلے۔

د. محدثین کے نزدیک محدث وہ ہے جو حصول علم کے بعد ہر عالم کی جمع شدہ روایات حدیث کا بھر پور مطالعہ کرے۔وہ بیشتر روایات اور رواۃ سے بھی واقف ہو۔ان کے مابین امتیاز کرنا بھی جان لے دیگر علماء کے ہاں اس کا حفظ بھی معروف ہو۔ضبط میں بھی اسے شہرت مل گئی ہو۔اس کی اکثر روایات صحیح ہوں اور متون کو یاد رکھنے کے ہمراہ وہ راویوں کے حالات، طبقات اور مراتب سے بخوبی واقف ہو۔وہ روایت اور درایت سے بھی آگاہ ہو۔محدث کہلاتا ہے۔

باب ۱

علم حدیث اور مختصر تاریخ

الحمد لله رب العالمين. والصلاة والسلام على نبينا وحبيبنا محمد، وعلى أزواجه أمهات المؤمنين، وذريته، وآل بيته، وأصحابه، وأهل بيته وأصحابه الطيبين الطاهرين ومن تبعه بإحسان إلى يوم الدين. أما بعد:

حافظ زین الدین عبدالرحیم العراقی نے شرح الفیہ تلخیص مقدمہ ابن الصلاح کی ابتداء میں اس فن کے بارے میں یہ لکھا:

عِلْمُ الحَدِيثِ خَطِيْرٌ وَقْعُهُ، كَبِيرٌ نَفْعُهُ، عَلَيهِ مَدارُ أكثرِ الأحكامِ، وبِهِ يُعرَفُ الحَلالُ وَالحَرامُ، وَلأهلِهِ اصْطِلاحٌ لابُدَّ لِلطالبِ مِنْ فَهْمِهِ۔ علم حدیث میں بڑا انتہائی احتیاط کا متقاضی ہے بڑا مفید ہے۔ بیشتر شرعی احکام کا دارومدار اسی علم پر ہے۔ حلال وحرام کی معرفت اسی کے فیض سے ہے۔ اس فن کے ماہرین نے اس کی مصطلحات متعارف کرائی ہیں جن کا فہم طالب علم کے لئے بہت ضروری ہے۔

تعریف: شیخ الاسلام ابوالفضل ابن حجرؒ کے نزدیک اس علم کی عمدہ تعریف یہ ہے:

مَعْرِفَةُ الْقَوَاعِدِ الْمُعَرِّفَةِ بِحَالِ الرَّاوِيْ وَالْمَرْوِيِّ مِنْ حَيثُ الْقَبُولِ وَالرَّدِّ۔ ایسے معلوم قاعدوں اور ضابطوں کا علم جن کے ذریعے سے کسی بھی حدیث کے راوی یا متن کے حالات کی اتنی معرفت حاصل ہو جائے: آیا راوی یا اس کی حدیث قبول کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ (النکت علی ابن الصلاح: ۲۲۵/۱)

اصول: اس تعریف سے درج ذیل باتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ سند اور متن کے حالات جانے بغیر کسی بھی حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کا علم نہیں ہوسکتا۔ یہی علم میزان ہے۔ ۲۔ اگر حدیث رسول کے لئے صحیح نسبت یعنی سند ومتن کے صحیح ہونے کا ہونا ضروری ہے تو صحابی وتابعی یا فقیہ ومجتہد یا کسی کے قول وفعل اور اس کے فتاوی کی نسبت (سند) کا ہونا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ بے سند بات شرعی مسئلہ نہیں ہوتی خواہ وہ کسی کی بھی ہو۔ کیونکہ شرع ایک علم ہے۔

۳۔احادیث لازماً کچھ مقبول ہوتی ہیں اور کچھ غیر مقبول۔

۴۔مقبول وصالح عمل یا غیر مقبول وغیر صالح عمل کا اصول، علم حدیث ہی بتاتا ہے۔

۵۔مسائل شرعیہ کشید کرتے وقت اصول حدیث بھی پیش نظر رہیں۔

امام شعبی اور امام عبدالرحمن بن مہدی رحمہما اللہ رائی کو یہ شعر سنایا کرتے:

دِيْنُ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ أَخْبَارُ نِعْمَ الْمَطِيَّةُ لِلْفَتَى الآثَارُ

لَا تَرْغَبَنْ عَنِ الْحَدِيْثِ وَأَهْلِهِ فَالرَّأْيُ لَيْلٌ وَالْحَدِيْثُ نَهَارُ

دین نبی محمد ﷺ اخبار واحادیث ہی ہے۔ایک نوجوان کے لئے یہی آثار ہی عمدہ سواری ہے

حدیث اور اہل حدیث سے منہ مت موڑو اس لئے کہ رائے رات کی مانند تاریک ہے اور حدیث دن کی طرح روشن

☆☆☆☆☆

تاریخ وتدوین زمانہ قبل وبعد

آپ ﷺ نے خود اس علم کو عام کرنے اسے اور اس کے مفہوم کو یاد کرنے اور اسے روایت کرنے کا ارشاد فرمایا اور اس کے حفاظ اور علماء کو بہت بابرکت دعا دی:

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَوَعَاهَا فَأَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا۔اللہ تعالی اس شخص کو تر وتازہ رکھے جو میری بات غور سے سنتا اور اسے اچھی طرح یاد کرتا ہے اور پھر اسے دوسرے تک ویسے ہی پہنچاتا ہے جیسے اس نے سنی ہوتی ہے۔

علم روایت اور علم درایت کی یہ بنیاد تھی جو آپ ﷺ نے فراہم کردی۔اسی کا نام محدثین کرام نے علم الحدیث رکھا۔جس میں حدیث کی نصوص اور اس کے تمام علوم شامل ہیں۔دعائے رسول کے حصول کے لئے انہوں نے اسے حفظ کرکے،اسے تلاش کرکے،اسے روایت کرکے اور پھر ہر حدیث کے رجال سند اور متن کی تحقیق کا حیرت انگیز میزان قائم کرنے کی کوشش کی۔

☆......علم حدیث کی تدوین سے قبل اور بعد کے مراحل کو جاننا ہی اس علم کی اصل تاریخ ہے۔یہ تاریخ ابتدائی تین صدیوں پر محیط ہے۔اس زمانہ کے علمائے حدیث کا میسر سرمایہ علم حدیث ہی وہ بنیاد ہے جس پر بعد میں مباحثات

ہوئے، ان کی تفصیلات طے ہوئیں اور پیدا شدہ اشکالات کی وضاحت کی گئی۔ اس لئے علم حدیث، تدوین حدیث کے بعد اپنے نکھار اور جوبن پہ آتے ہی منضبط ہونے لگا اور جلد ہو گیا۔ انہی تین صدیوں کے رجال حدیث ہی تو ہیں جو کسی بھی حدیث کو کھنگالتے ہیں اور اس کی تصحیح وتضعیف میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

☆......سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما ہی اولین افراد صحابہ ہیں جنہوں نے روایت وکتابت حدیث اور اس کی تحقیق وتلاش میں اور جرح وتعدیل میں بڑا نام پایا۔ دیگر صحابہ عبد اللہ بن عباس، عبادۃ بن الصامت، انس بن مالک رضی اللہ عنہم نے بھی اس شجرہ علم کی خوب آبیاری کی۔ روایت، کتابت، حفظ، رحلہ، نقد اور نقد رجال حدیث جیسے علوم کی صحیح معرفت کے بعد اسے خوب رواج دیا۔ امہات المؤمنین بالخصوص سیدہ عائشہ وسیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابیات کا بھی خاطر خواہ حصہ ہے۔ ان صحابہ کرام کی تعداد پچاس سے متجاوز ہے۔

☆......زمانہ صحابہ کرام اور ائمہ تابعین میں رجال حدیث پر نقد زیادہ تر حافظے پر مبنی ہوتی۔ یوں حدیث کا ہر راوی یا تو صحابی رسول ہوتے جو یقیناً عادل تھے یا تابعی کبیر تھے جو ثقہ ہوتے۔ ان میں کا ہر شخص صدق کو پانے اور بتانے کی بھرپور کوشش کرتا اور راوی کے بارے میں سخت گیر بھی ہوتا۔ مگر چند راویوں سے بلاشبہ وہم وخطا بھی ہوئی۔ جو ایک بشری لازمہ ہے عصمت تو صرف اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول محترم ﷺ کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ ائمہ حدیث نے ان کی خطأ سے متنبہ کیا اور جہاں تک ہو سکا اسے واضح کیا۔ ان صحابہ وتابعین نے ان راویوں پر جو نقدی کلمات کہے وہ مختصر ترین تھے۔

☆......تابعین کرام میں سعید بن المسیب، حسن بصری، عامر شعبی اور ابن سیرین رحمہم اللہ جیسے عظیم ائمہ وقت نے فتنہ شہادت عثمان ذوالنورین کے سر اٹھاتے ہی تفتیش کے مراحل میں سختی پیدا کر دی اور زاہد وقصہ گو حضرات اور اصحاب بدعت پر عدم اعتمادی کا اظہار کر کے ان کی جھوٹی عقیدت کو عقیدہ کا بگاڑ قرار دیا۔ اور ان کی مرویات کو ذرہ برابر وقعت نہ دی۔ اس دور میں گو کوئی کتاب مدون نہ ہو سکی مگر ان علماء کی توجہ روایت حدیث اور اس کی نقد وجرح پر ہی مرکوز رہی۔ ہر صحابی کو عادل قرار دیا اور ثقہ تابعی کبیر پر اعتماد کا اظہار کیا۔ انہوں نے ہی تعلیم وتدریس کی مسند پر براجمان ہو کر معاملہ حدیث کو مزید حساس بنا دیا، طالبان حدیث کی عقیدت کو صحیح رخ دیا۔ حفاظت حدیث کے بند باندھے۔ اسے صفحہ قرطاس پر رقم کیا اور صحیح وغلط، کذاب ومفتری کا پتہ دیا۔ ہاں جن سے اوہام وخطأ صادر ہوئی ان

سے آگاہ کیا۔اور پرمغز وضاحت کی۔ یہ لوگ چونکہ بہت کم تھے اس لئے زیادہ نقد و جرح نہ ہو سکی۔نتیجتاً متفرق مصطلحات بھی متداول ہونے لگیں۔اس طرح پہلی صدی ہجری گذر گئی۔

☆......دوسری صدی ہجری کے شروع میں ۔۔ جو اوسط تابعین کا دور ہے۔۔ کچھ راوی ایسے نمودار ہوئے جو مرسل اور منقطع روایت کرنے لگے۔اوراس شیخ کی بھی روایت عام ہونے لگی جس کی روایت حدیث میں بکثرت غلطیاں ہوتیں۔ یہ کام بتدریج دوسری صدی ہجری کے نصف تک بڑھتا گیا۔سیاسی فرقے بھی ظہور پذیر ہوئے جنہوں نے نفرت وتعصب کو ہوا دی۔عجمی ثقافت اسلامی اقدار پر حملہ آور ہونا شروع ہوئیں۔خرافی اور بدعتی اپنے مفروضہ مذہب کے لئے عمداً حدیث میں جھوٹ بولنے لگے۔چنانچہ اکابر علماءحدیث مجبور ہوئے کہ سند اور متن کی تفتیش ونقد کا دائرہ اب وسیع تر وسخت تر کر دینا چاہئے۔

☆......پہلی صدی ہجری کے وسط سے ہی حدیث کو نتھارنے کا عمل شروع ہوا۔شواہد ودلائل اکٹھے ہوئے جو سینوں میں محفوظ تھا اسے اپنے دروس میں دہرایا اور سفینوں میں بھی لکھا۔حلقات حدیث کی وسعت نے پوری اسلامی سلطنت میں اپنی جگہ بنالی۔علم حدیث کی اصطلاحات اور اصول کا چرچا مجالس علمیہ میں عام ہونے لگا۔رجال حدیث کا ذکر بھی ان کے ہمراہ رہا جو مختلف کتب اور رسائل میں بین السطور بکھرے اقوال وملاحظات کی صورت میں تھے جنہیں بتدریج ضبط تحریر میں لایا گیا۔

☆......امام زہری رحمہ اللہ نے سرکاری سرپرستی میں جو عظیم الشان تدوینی کام سرانجام دیا وہ اپنے مستقل ثمرات امت کو دے گیا۔مصروشام اور یمن وعراق میں پھیلے جید علماء وفقہاء کی مشارکت سے ان کا کام مزید سہل اور مجمع علیہ ہوگیا۔احادیث واقوال اور فتاوی میں فرق اور جھوٹ وسچ میں امتیاز کرنے کی ابتداء سیدنا عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے کردی جو خاص توفیق اور عنایت ربانی ہے۔امام مالک رحمہ اللہ بھی ان کے شاگرد تھے جو اپنی کاوشوں،سوچ کے دھاروں اور تعلیم کے حلقوں میں اسی تمیز کو ہی پروتے گئے۔کتاب موطأ لکھی تو احادیث مرفوعہ اور اقوال موقوفہ ومقطوعہ کے انبار لگائے۔

☆......امام شعبہ بن الحجاج (م:۱۶۰ھ)، ہشام بن ابو عبد اللہ دستوائی (م:۱۵۴ھ) امام عبد اللہ بن المبارک (م:۱۸۱ھ)،سفیان بن عیینہ(م:۱۹۸ھ) اور پھر یحیی بن سعید القطان (م:۱۹۸ھ) وغیرہ نے رجال حدیث پر اپنی

جرح وتعدیل کی۔اسی طرح ان کے شاگردوں نے بھی رواۃ پر جرح وتعدیل کی۔امام مالکؒ کے اثرات اہل عراق سے مناقشوں کے بعد ان کے تلمیذ خاص امام شافعیؒ پر بھی ہوئے جنہوں نے الرسالہ میں اصطلاحات حدیث اور اصول فقہ وحدیث کو علمی زیرکی کے ساتھ یکجان ثابت کیا۔اس علم کو شفاف بنانے کے دو مراحل نظر آتے ہیں:

۱۔**غیر مدون صورت میں**: اس مرحلے میں اصول حدیث سے متعلق متقدم علماء کے ان تبصروں اور بکھری ابحاث اور اقوال کو جمع کیا گیا جو حدیث یا سند سے متعلق بین السطور کوئی نقد یا اہم نکتوں کی صورت میں ہوتے۔یا کسی کتاب کا کوئی ایسا باب ہوتا یا ایک ہی موضوع پر مشتمل جزء یا اجزاء ہوتے۔مثلاً امام شافعیؒ (م:۲۰۴ھ) نے الرسالہ اور الأم میں صحت حدیث کی شرائط،خبر واحد کا حجت ہونا، راوی کا حافظ ہونا، غلط راویوں سے احتراز، روایت بالمعنی، مدلس کی حدیث کو اس وقت قبول کرنا جب وہ حدیث کے سماع کی صراحت کردے۔موضوع، ضعیف، منکر، مدلس، ثقہ، خبر واحد، علم ظنی وعلم یقینی وغیرہ جیسی مصطلحات کا تعارف کرایا۔کبار تابعین کی مراسیل، نیز حدیث مرسل حجت ہے یا نہیں؟ وغیرہ جیسے مباحث کو انہوں نے علماء تابعین وتبع تابعین کے نقدی تبصروں اور مابین السطور نقدی نکتوں سے اخذ کیے۔مثال کے طور پر:

> بابُ خبرِ الواحِدِ: قَالَ لِي قائِلٌ: اُحْدُدْ لِي أَقَلَّ مَا تَقُومُ بِهِ الْحُجَّةُ عَلَى أهلِ العِلْمِ حَتّٰى يَثْبُتَ عَلَيْهِمْ خَبَرُ الْخَاصَّةِ۔ فَقُلْتُ: خَبَرُ الواحِدِ عَنِ الوَاحِدِ حَتّٰى يَنْتَهِيَ بِهِ إِلَى النبيِّ ﷺ، أَوْ مَنِ انْتَهَى بِهِ إِلَيه دُونَهُ، وَلَا تَقُومُ الْحُجَّةُ بِخَبَرِ الْخَاصَّةِ حَتّٰى يَجْمَعَ أموراً:خبرواحد کے بارے میں باب: مجھے کہنے والے نے کہا: میرے لئے معمولی حد مقرر کردیجئے جو اہل علم پر حجت بن جائے تاکہ خاصہ کی خبر ان پر ثابت ہو جائے۔میں نے کہا: واحد (فرد) کی خبر واحد (فرد) سے ہو یہاں تک کہ وہ نبی کریم ﷺ تک جا کر منتہی ہوجائے۔یا اس پر جا ختم ہو جو آپ ﷺ سے نیچے کا راوی (صحابی) ہو۔اور خبر خاصہ اس وقت تک حجت نہیں بن سکتی جب تک کہ اس میں درج ذیل چند امور نہ ہوں۔
>
> مِنها: أن يكونَ مَنْ حَدَّثَ بِهِ ثِقَةً فِي دِينِهِ، مَعْروفاً بِالصِّدقِ فِي حَدِيثِهِ، عَاقِلاً لِمَا يُحَدِّثُ بِهِ، عَالِماً بِمَا يُحِيلُ مَعَانِي الْحَدِيثِ مِنَ اللَّفْظِ، وَأن يَّكونَ مِمَّنْ يُؤَدِّي الْحَدِيثَ بِحُرُوفِهِ كَمَا سَمِعَ، لَا يُحَدِّثُ بِهِ عَلَى الْمَعْنَى لِأَنَّهُ إِذا حَدَّثَ بِه عَلَى الْمَعْنَى وَهُو غيرُ عَالِمٍ بِمَا يُحِيلُ مَعْنَاهُ: لَمْ يَدْرِ: لَعَلَّهُ يُحِيلُ الْحَلَالَ إِلَى الْحَرَامِ، وَإِذَا أَدَّاهُ بِحُرُوفِهِ فَلَمْ يَبْقَ وَجْهٌ يُخَافُ فِيه إِحَالَتُهُ الْحَدِيثَ۔ان

میں ایک تو یہ ہے کہ جس سے وہ روایت کرے وہ اپنی دین داری میں ثقہ ہو، سچائی میں معروف ہو، جو بیان کرے اسے سمجھتا بھی ہو۔ معانی حدیث اگر بتانا چاہے تو ان الفاظ کو بھی بخوبی جانتا ہو، ایسا راوی ہو جو حدیث کے الفاظ وحروف کو ویسا ہی روایت کرے جیسا اس نے سنا ہو۔ الفاظ حدیث کو معناً روایت نہ کرے۔ کیونکہ عالم نہ ہونے کی صورت میں معناً روایت کرنے والے کو کیا معلوم کہ وہ حلال کو حرام کی طرف لے جائے۔ مگر جب اس حدیث کو حروف سمیت وہ ادا کرے گا تو پھر کوئی خدشہ نہیں رہتا کہ وہ حدیث کیا بن گئی۔

حافظاً إذَا حَدَّثَ بِهِ مِنْ حِفْظِهِ، حافظاً لِكِتَابِهِ إذَا حَدَّثَ مِنْ كِتَابِهِ، إذَا شَرِكَ أهلَ الْحِفْظِ فِي الحديثِ وَافَقَ حَدِيثَهُمْ، بَرِيْئاً مِنْ أن يكونَ مُدَلِّساً: يُحَدِّثُ عَمَّنْ لَقِيَ مَا لَمْ يَسْمَعْ مِنْهُ، وَيُحَدِّثُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مَا يُحَدِّثُ الثِّقَاتِ خِلَافَهُ عَنِ النبيِّ ﷺ۔ جب حدیث اپنے حافظے سے روایت کرے تو اسے حدیث بخوبی یاد ہو اور اگر اپنی کتاب سے روایت کرے تو اپنی کتاب کا بھی محافظ ہو۔ جب محدثین کے ساتھ روایت میں شریک ہو تو ان کی حدیث سے موافقت کرتا ہو۔ وہ تدلیس سے بری ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ جس شیخ سے ملاقات تو کی مگر اس سے وہ حدیث روایت کرے جو اس سے سنی ہی نہ ہو۔ اور نبی کریم ﷺ سے وہ حدیث روایت کرے جسے ثقات اس کے خلاف روایت کرتے ہوں۔

ويكونُ هَكَذا مَنْ فَوقَهُ مِمَّنْ حَدَّثَهُ، حَتّٰى يَنْتَهِيَ بِالحديثِ مَوصُولا إلَى النبي ﷺ، أو إلَى مَنِ انْتَهَى بِهِ إلَيهِ دُونَهُ، لِأنَّ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُم مُثْبِتٌ لِمَنْ حَدَّثَهُ، وَمُثْبِتٌ عَلَى مَنْ حَدَّثَ عَنْهُ، فَلَا يَسْتَغْنِيْ فِي كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ عَمَّا وَصَفْتُ۔۔الخ۔ اسی طرح اوپر والے راوی بھی انہی صفات کے حامل ہوں۔ رسول اللہ ﷺ تک سبھی شیوخ اتصال کو ثابت کریں۔ یا آپ ﷺ سے نیچے جس راوی تک سند جا کر رکتی ہے وہاں تک متصل ہو۔ کیونکہ ان میں کا ہر راوی یہ ثابت کر رہا ہوتا ہے کہ میں نے اوپر والے سے حدیث سنی ہے۔ اور اسے بھی جس نے اس سے حدیث روایت کی ہے۔ اس لئے سند کا کوئی بھی راوی ان مذکورہ صفات وشرائط سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ کی اس تفصیلی گفتگو پر یوں وضاحت کرتے ہیں:

وقَدْ تَضَمَّنَ كلامُ الشافِعِيِّ هٰذَا جَمِيْعَ الشُّرُوطِ الْمُتَّفَقِ عَلَيهَا بَيْنَ أهْلِ الْحَدِيثِ فِي حَدِّ مَنْ تُقْبَلُ رِوَايَتُهُ۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی یہ ساری گفتگو ان تمام متفقہ شروط پر مشتمل ہے جو محدثین کے ہاں ایک مقبول راوی کی ہو سکتی ہیں۔

شیخ احمد شاکرؒ نے الرسالۃ میں اسی گفتگو پر یوں حاشیہ آرائی کی ہے:

ومِنْ فِقْهِ كلامِ الشافِعِيِّ فِي هٰذَا البابِ وُجِدَ أَنَّهُ جَمَعَ كُلَّ الْقَوَاعِدِ الصَّحِيْحَةِ لِعُلُومِ الْحَدِيثِ الْمُصْطَلَحِ۔ وَأَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ أَبَانَ عَنْهُ إِبَانَةً واضِحَةً، وَأَقْوىٰ مَنْ نَصَرَ الحَدِيثَ، وَاحْتَجَّ لِوُجوبِ الْعَمَلِ بِهِ، وَتَصَدّٰى لِلرَّدِّ عَلَى مُخالِفِيهِ، وَقَدْ صَدَقَ أَهْلُ مَكَّةَ وَبَرُّوا إِذْ سَمَّوهُ: نَاصِرُ الْحَدِيثِ۔ امام محترم کی اس عمدہ فقہی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ علوم حدیث (مصطلحات) کے تمام صحیح قواعد کو انہوں نے جمع کر دیا ہے۔ وہی اولین شخص ہیں جنہوں نے اس موضوع کو خوب نکھارا ہے۔ نصرت حدیث میں سب سے زیادہ وہ جان دار ثابت ہوئے۔ انہوں نے حدیث پر عمل واجب اور قابل حجت بتایا۔ اوران شرائط کے مخالفین کی بھی خوب خبر لی۔ اہل مکہ نے امام محترم کے بارے میں جو کہا صحیح کہا اور مناسب کہا: وہ ناصر حدیث ہیں۔

ان کی کتاب اختلاف الحدیث بھی ایسا مواد رکھتی ہے۔ جس کی بے شمار مثالیں اسلامی ادب کو فقہی اور علمی رنگ دیتی ہیں۔

☆......امام احمدؒ بن حنبل (م:۲۴۱ھ) نے بھی اس علم کے مباحث میں خاطر خواہ حصہ ڈالا جن کے فوائد کا علم ہمیں ان کے اور ان کے شاگردوں کے مابین ہونے والی سوال و جواب کی نشست سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ امام اہل السنہ ہی اس قربانی کے سبب کہلائے جو انہوں نے جبر وقہر اور استبداد کی رعونت کے سامنے صحیح سنت رسول کا استدلال مانگا۔ عقلی تک بندیوں کے سامنے بند باندھے اور نصوص سے امت کو راہنمائی کا درس دیا۔ یہ ظاہر پرستی تھی نہ ہی مصلحت بلکہ ایک عبرت آموز سبق تھا جو ہمیشہ کے لئے نصوص کے مقابلے میں ذاتی رجحان وعقلی قیاسات کی بے وقعتی کا امت کو دے گئے۔

☆......امام ابوعبداللہ الحمیدی (م:۲۱۹ھ) نے علم حدیث پر جو نکتہ سنجی کی ہے اسے بالتفصیل امام خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الکفایۃ میں ذکر کیا ہے جس کا ایک مختصر کتابچہ بھی بن سکتا ہے۔ وہ حدیث جو قابل احتجاج ہو اس کی وضاحت انہوں نے کی۔ حدیث معنعن کے حکم کا ذکر بھی انہوں نے چھیڑا اور راوی پر کون سی جرح قبول کی جائے اور کون سی نہیں۔ جیسے مباحث امام ابوعبداللہ الحمیدیؒ سے بالتفصیل نقل کئے ہیں۔

☆......امام علی بن المدینی نے علوم حدیث کے موضوع پر بے شمار کتب لکھیں۔ وہ اور یحییٰ بن معین (م:۲۳۲ھ) رحمہما اللہ یار غار تھے اور دونوں ایک ہی شاہراہ پر گامزن۔ ان حضرات کی کتب اور ان سے منقول اقوال (تاریخ

یحییٰ بن معین) شاہد ہیں کہ اصول اور مصطلحات حدیث، علماء حدیث کے مابین متداول تھیں۔ ان کے معاصر مؤلفین نے اپنے لائق تلامذہ کو یہ علم پڑھایا اور ہزاروں کے مجمع میں پڑھایا جسے روایت کرنے کی اجازت بھی دی۔ متأخرین کے بہترین لوگوں نے اس خزانے کو سمیٹا اور اپنے ذوق تالیف کو شہ دے کر اسے مزید اجالا دیا۔ علی بن المدینی رحمہ اللہ کا منہج مصطلح ونقد حدیث خاصا معروف ہے۔

☆...... امام عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی (م:۲۵۵ھ) کا السنن میں لکھا نفیس مقدمہ علم حدیث کا شاہکار ہے۔ زمانہ جاہلیت، صاحب سنت جناب رسالت مآب ﷺ کا تعارف، آپ ﷺ کے ابتدائی حالات، معجزات، صفات، واخلاق، ذکر وفات، اتباع رسول وسنت رسول کا ادب واحترام، آپ ﷺ کے اوامر ونواہی وغیرہ کا تفصیلی ذکر بھی اس میں ہے۔

☆...... اس منہج سے نہ صرف امام بخاری (م:۲۵۰ھ) (کتب تواریخ ثلاثہ) بلکہ اصحاب خمسہ اور امام ابوزرعہ رازی (م:۲۶۴ھ) رحمہم اللہ بھی متأثر ہوئے۔ جہاں علوم حدیث پر بہت پر مغز اور علمی نکات ملتے ہیں۔

☆...... تیسری صدی ہجری کی متنوع تصنیفات حدیثیہ میں اصول حدیث کے درایتی مباحث کا جابجا ذکر ملتا ہے۔ بطور خاص کتب تاریخ رجال میں۔ کوئی ایک مستقل کتاب اس موضوع پر نظر نہیں آتی۔ یہ وہ مباحث تھے جو روایت حدیث کے ساتھ ہی اٹھے اور مدون ہوتے گئے۔ مگر جب خلیفہ محترم عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے حکم سے سنت مطہرہ مدون ہوئی تو علماء کا جمع سنت، تألیف سنت، اس کے انتخاب اور ترتیب میں ذوق مختلف ہوتا گیا۔ ہر طبقہ کے علماء نے اپنے انتخاب کو منفرد انداز میں مرتب کیا۔ ان کتب میں بعض احادیث پر حکم لگایا گیا اور کہیں معلول روایت کی علت درج تھی۔ بعض راویوں پر نقد تھی۔ ان تصنیفات میں اسناد کے بارے میں مقتدر علماء کے اقوال بھی تحریر تھے۔ اور متقدمین نے سند یا متن کے لئے جو خاص تنقیدی اصطلاحات استعمال کیں وہ بھی مذکور تھیں۔ ان مجالس کا بھی ذکر تھا جن میں کسی بھی روایت یا حدیث پر بحث ہوئی۔

☆...... جب رواۃ کے حالات وواقعات سے متعلق گفتگو ہوئی تو جرح وتعدیل کا آغاز ہوگیا اور جس میں متعدد اقوال کی وجہ سے وسعت آتی گئی بحث نے گہرائی اختیار کی۔ حدیث روایت ہوئی اور صحیح وسقیم کو نکھارا جانے لگا۔ متعدد علوم کی تصنیفات تالیف ہوئیں سند میں رواۃ کے احوال پر کتب تاریخ، طبقات، وفیات، معرفۃ الوحدان،

اکابر کی اصاغر سے روایت، مدلسین وکذابین کی اقسام، خبر کے احوال پر بھی کتب تالیف ہوئیں جیسے کتب العلل، قبول ورد کے الفاظ اوران کے مراتب، حفاظ محدثین کی جرح وتعدیل کے الفاظ کی وضاحت، اور علم اصول حدیث کی متعدد انواع جن کے بارے میں ابن الملقن کا کہنا ہے کہ اس کی انواع دوسو سے بھی زائد ہیں۔ امام ابوحاتم ابن حبان نے صرف ضعیف حدیث کی انچاس اقسام ذکر کی ہیں۔

☆...... صحیح بخاری میں اور بالخصوص کتاب العلم میں بھی علوم الحدیث کے بے شمار نکات ہیں۔ نیز امام بخاری رحمہ اللہ کی تینوں تواریخ بھی انہی اصطلاحات کو ضمناً لئے ہوئے ہیں، جرح وتعدیل اس پر مستزاد ہے۔ امام مسلمؒ کا انتہائی جامع مقدمہ صحیح، جسے اگر حدیثی اصطلاحات کا دیوان قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ امام محترم نے اس موضوع کو اپنے جاندار زور بیان سے مثالیں دے کر پیش کیا ہے۔ امام ابوداود رحمہ اللہ کا لکھا رِسَالَةُ أَبِی دَاوٗدَ إِلٰی أَهْلِ مَكَّةَ اور السنن میں امام النسائی کے بہت سے اصولی وحدیثی مباحث بھی قابل توجہ ہیں۔ سنن ترمذی میں تصحیح، تحسین اور تضعیف حدیث سبھی علوم حدیث کا لطیف اظہار ہیں۔ قاضی ابوبکر ابن العربیؒ اپنی کتاب عارضة الأحوذی میں لکھتے ہیں:

> وَلَيْسَ فِي قَدَرِ كِتابِ أبي عيسى مِثْلَهُ حَلَاوَةُ مَقْطَعٍ، وَنَفاسَةُ مَنْزَعٍ، وَعَذُوبَةَ مَشْرَعٍ، وفِيهِ أربعةَ عَشَرَ عِلْماً فَرَائِدَ: صَنَّفَ۔ أی الأحاديثَ عَلَى الأبوابِ، وَذٰلِكَ أقربُ لِلْعَمَلِ، وَأَسْنَدَ، وَصَحَّحَ، وَأَشْهَرَ، وَعدَّدَ الطُّرُقَ، وَجَرَّحَ، وَعَدَّلَ، وَأَسْمٰى، وَأَكْنٰى، وَوَصَلَ، وقَطَعَ، وأَوْضَحَ الْمَعمولَ بِهِ وَالْمَتْرُوكَ، وَبَيَّنَ اخْتِلَافَ الْعُلَماءِ فِي الرَّدِّ وَالْقَبُولِ لِآثارِهِ، وَذَكَرَ اخْتِلافَهُم فِي تَأوِيْلِهِ، وَكُلُّ عِلْمٍ مِنْ هَذِهِ الْعُلُومِ أَصْلٌ فِي بابِهِ فَرْدٌ فِي نَصَابِهِ۔ امام ابوعیسی ترمذی کی کتاب جیسی کوئی کتاب نہیں جو جملوں کی حلاوت، عبارت کی نفاست اور استفادہ کی لذت اپنے اندر رکھتی ہو۔ اس کتاب میں چودہ منفرد علوم ہیں: انہوں نے احادیث کو ابواب کے تحت لکھا۔ جو عمل کے اعتبار سے زیادہ قابل فہم ہے۔ انہوں نے سند پیش کی، حدیث کو صحیح قرار دیا، اسے مشہور بتایا، حدیث کے متعدد طرق پیش کئے، جرح وتعدیل بھی کی، راوی کا نام لکھا اس کی کنیت بھی پیش کی، سند حدیث کو موصول کیا، اور مقطوع بھی۔ معمول بہ کی وضاحت کی اور متروک کی بھی۔ آثار میں علماء

حدیث کے اختلاف ردوقبول کو بھی پیش کیا اور یہ اختلاف اپنے مفہوم میں بھی ذکر کیا۔ان علوم حدیث میں ہر علم اپنے موضوع میں ایک اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔اور اپنی ذات میں منفرد بھی ہے۔

امام ابوعبداللہ محمد بن عمر بن رشید رحمہ اللہ قاضی ابوبکر ابن العربی کی اس گفتگو پر اپنی نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جو کچھ قاضی محترم نے لکھا ہے اس میں کچھ تو اپنا تداخل (interruption) ہے مزید یہ کہ جو علوم انہوں نے گنوانے کی کوشش کی ہے وہ گنوا نہ سکے۔اگر وہ ان کا بھی شمار کرتے تو تعداد میں یہ چودہ سے کہیں بڑھ جاتے۔امام ترمذیؒ نے حدیث کو حسن بھی قرار دیا، اور غریب بھی بتایا، متابعت اور انفراد کی بھی بات کی، زیادات الثقات کو بھی ذکر کیا، مرفوع اور موقوف کے فرق کو بتایا، اور مرسل وموصول کو بھی واضح کیا، المزید فی متصل الأسانید بھی پیش کی، صحابہ کی ایک دوسرے سے روایت بھی بتائی، اور اسی طرح تابعین کی بھی۔صحابی کی تابعی سے روایت کی مثال بھی پیش کی، اوران صحابہ کا بھی شمار کرڈالا جنہوں نے تابعی سے حدیث کوروایت کیا۔کس کی صحبتِ رسول ثابت ہے اور کس کی نہیں؟ اس پر بھی انہوں نے گفتگو کی نیز اکابر کی اصاغر سے روایت کا بھی ذکر کیا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی السنن کے آخر میں ایک جزء بنام العِلَلُ الصَّغِیْرُ بھی تصنیف فرمائی جس میں جرح وتعدیل، اسناد کا لازماً ہونا، ضعفاء سے روایت کرنا، ان کی حدیث کب قابل احتجاج ہوگی؟ اور کب نہیں؟ روایت بالمعنی، بعض کبار محدثین کے بارے میں اہم معلومات، تحمل واداء حدیث کی صورتیں؟ حدیث مرسل کا حکم، اور خود ان کی اپنی اصطلاح حدیث حسن اور حدیث غریب وغیرہ جیسے مباحث ہیں۔

☆......امام ابوالحسن أحمد بن عبداللہ بن صالح العجلی (م:۲۶۱ھ) کی کتاب الثقات میں بھی جرح وتعدیل اور بعض مصطلحات کا تذکرہ ملتا ہے۔تاریخ أبی زرعة الدمشقی (م:۲۸۱ھ) رجال وعلم حدیث پر تبصروں سے مملو کتاب ہے۔ان کے شاگرد رشید امام ابوبکر الخلال احمد بن احمد بن ہارون (م:۳۱۱ھ) نے اسے کتاب التاریخ وعِلَلُ الرِّجَال کا نام دیا ہے جس میں امام ابن شہاب الزہری (م:۱۲۴ھ)، امام اوزاعیؒ (م:۱۵۷ھ)، اور امام مالکؒ بن انس کے اصول ومصطلحات کا تذکرہ بھی ہے۔

☆......ان کتب میں رواۃ کی توثیق وتضعیف، جرح وتعدیل، بعض ثقات رواۃ کی بعض پر تفضیل، نیز مدلس وغیر مدلس، حافظ واحفظ، فقیہ وغیر فقیہ کے مابین افضلیت، حدیث وخبر دینے، اجازت، سماع وقراءت اور اداء حدیث کے اصول اور ان کی مستعمل مصطلحات حدیثیہ کا بھی ذکر ہے۔ کون صحبت رسول اللہ ﷺ سے فیض یاب ہوا اور کون محروم رہا۔ بعض موالی اور ان کے موالی کا ذکر بھی ہے۔ متفق اور مختلف فیہ رواۃ حدیث پر بحث بھی ہے۔ رواۃ کے انساب، القاب، کنیتیں، مولد، وفیات اور ان کے کچھ شیوخ کا تذکرہ ملتا ہے۔ قدریہ، خوارج، زنادقہ، مقربین سلطنت اور خروج کرنے والوں کا بھی جا بجا ذکر ہے۔

☆......امام یعقوب بن سفیان الفسوی (م: ۲۷۷ھ) کی کتاب **المعرفة والتاريخ** بھی علم مصطلح پر بکھرے بکھرے موتی رکھتی ہے۔ امام ابوبکر احمد بن عمر بن عبدالخالق البزار (م: ۲۹۰ھ) کے مختصر کتابچہ میں متروک اور مقبول راوی پر خاصی علمی بحث تھی جس کا تذکرہ حافظ عراقیؒ نے اپنے الفیہ کی شرح میں کیا ہے۔

مگر چوتھی صدی ہجری کے وسط میں یہ رجحان غالب آ گیا کہ کیوں نہ ایسے مباحث وقواعد کو یک جا مرتب کر کے کتابی شکل دی جائے۔ اس لئے مصطلحات کی جامع ومانع تعریفات متأخرین میں قرار پکڑ گئیں۔

۲۔ **مدون صورت میں**: اس مرحلہ میں یہی چیدہ موتی باہم پروئے گئے۔ لڑی سے جب لڑی ملتی گئی تو اصول حدیث بنتے گئے اور اس موضوع پر کتب آنا شروع ہوگئیں۔ ہر اصول صرف صحیح حدیث کو قبول کرنے اور ضعیف وموضوع حدیث کو رد کرنے کا بنا مثلاً: ثقہ راوی اگر ثقات کی مخالفت کرے تو ثقہ کی روایت ضعیف قرار دے کر ثقات کی روایت کو ترجیح دی جائے یا ایک حدیث میں رسول اکرم ﷺ کا حکم ہو اور دوسری حدیث میں عمل کا ذکر ہو تو اصول یہ بنایا کہ ہم حکم کے پابند ہیں اس لئے حکم کو لیا جائے گا اور عمل آپ ﷺ کے لئے خاص گردانا جائے گا۔

☆......یاد رہے ہر مصطلح کسی بھی حدیث کی ایک طویل تحقیق وتفتیش کا لب لباب یا اس پر مختصر تبصرہ ہے۔ مثلاً محدث کا کسی حدیث کو سادہ لفظ میں صحیح، ضعیف یا موضوع کہہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ محدث نے اس متن حدیث کو سمجھنے کے لئے اس حدیث کے دیگر تمام متون مختلف کتب سے تلاش کئے۔ سند میں راویوں کے نام، ان کی کنیتیں، انساب اور القاب تک کو پہچانا، شاگرد واستاد کی ملاقات، ان کی ثقاہت وعدالت یا ضعف وارسال، نیز

اخذ واداء کے الفاظ اور فرق وغیرہ اور اسانید کے رواۃ کا باہم مقابلہ کیا۔ ان کے الفاظ ومعنی کے ضبط کو دیکھا۔ کتب بھی دیکھیں، مشائخ سے سنا اور راوی کو دیکھا بھی۔ پھر آخر میں یوں کہہ دیا: یہ حدیث صحیح ہے یا یہ حدیث ضعیف و موضوع ہے وغیرہ۔ چنانچہ یہ ایک قاعدہ اور ضابطہ قرار پایا کہ جب کوئی علم حدیث کا ماہر عالم کسی حدیث کو صحیح کہہ دے تو یہ ایک مصطلح ٹھہرے گی اور اپنی تمام تر شروط کے ساتھ قابل قبول ہوگی۔

☆......کسی ضعیف حدیث کو صحیح اور صحیح کو ضعیف قرار دینے کے اصول صرف درایتی نہیں بلکہ روایتی بھی ہیں۔ یہیں پر اصول فقہ بھی اصول حدیث میں ضم ہو جاتے ہیں۔

☆......یہی وہ قواعد ہیں جن کے اطلاق اور تطبیق (Implementation) سے کسی بھی حدیث کی صحت وضعف کا پتہ چل جاتا ہے۔ ان پر بے شمار کتب بھی لکھی گئیں۔ جن کا تاریخی تذکرہ امام ابن حجرؒ (م:۸۵۲ھ) نے کیا ہے۔

☆......باضابطہ اولین کتاب سب سے پہلے قاضی ابومحمد الحسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد رامہرمزی (م۔۳۶۰ھ) نے لکھی۔ جس کا نام المحدث الفاصل بین الراوی والواعی رکھا۔ ابتدائی کتاب ہونے کے باوجود پھر بھی اس میں بے شمار علمی فائدے ہیں۔ کتاب فن روایت اور اس کے آداب کو متنوع صورت میں اجاگر کرتی ہے۔ اپنی کتاب میں درایت حدیث پر سیر حاصل بحث کی جو تیسری صدی ہجری کے ائمہ حدیث کے نقدی تبصروں اور الفاظ پر ہی مبنی تھا۔ بہت سے مباحث کی۔۔ بقول حافظ ابن حجر۔۔ پھر بھی اس میں کمی رہی۔

☆......حافظ ابوعبداللہ بن مندہ (م:۳۹۵ھ) رحمہ اللہ نے بھی قرائت وسماع، مناولہ اور اجازت حدیث پر ائمہ حدیث کی شروط ایک جزء میں جمع کیں جس کا ذکر حافظ سبط ابن العجمی نے اپنی کتاب التبیینُ لأسماءِ المُدَلِّسین میں کیا ہے۔

☆......امام ناقد ابن حبان البستی (م:۳۵۴ھ) نے اپنی حدیثی کتاب التقاسیمُ والأنواعُ کا جو مقدمہ لکھا وہ اصول حدیث کا شاہکار ہے۔ دوسری کتاب المجروحین اور تیسری کتاب الثقات کے مقدمے بھی اصول حدیث اور مصطلحات کے مباحث سے مملو ہیں۔ بالخصوص پہلی دو کتب کے مقدمے تو علوم حدیث کی تاریخ اور اس کے اہم مباحث اور قواعد کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔ اسی صدی کے شروع میں امام ابوسلیمان حمد بن محمد بن ابراہیم

الخطابی (م:۳۸۸ھ) نے اپنی کتاب مَعَالِمُ السُّنَنِ کا مختصر مقدمہ لکھا جس میں انہوں نے حدیث کی تقسیم صحیح حسن اور ضعیف میں کر ڈالی۔ یہ اولین کوشش تھی جو روایات حدیث کی تقسیم کی کی گئی۔ امام ابوالحسن علی بن محمد بن خلف القابسی (م:۴۰۳ھ) نے مختصَرُ موطاِ عَنْ مالِکٍ کتاب جو اَلْمُلَخَّصُ لکھی جس کے مقدمے میں اتصال، انقطاع، الفاظ اداء اور حدیث مرفوع ودیگر انواع پر بحث کی۔

☆......امام حاکم ابوعبداللہ نیسابوری (م:۴۰۵ھ) نے معرِفَۃُ علمِ الحدیثِ لکھی جو ابن خلاد رامہرمزی کی کتاب کا تکملہ تھی۔ جس میں مصطلح الحدیث کے علاوہ اس کتاب کے بعض الفاظ کی شرح اور مثالیں بطور وضاحت دی گئیں۔ امام حاکمؒ نے اس میں جن ابحاث کو سمیٹا ان میں اسناد عالی ونازل، موقوف ومرسل، اور منقطع، معنعن، معضل اور صحیح وسقیم ودیگر انواع کی تقسیم تھی۔ جن کی تعداد باون تک پہنچ گئی۔ یہ وضاحت بھی اس میں موجود ہے کہ یہ تمام مصطلحات اور اصول حدیث تیسری صدی ہجری کے ائمہ حدیث کا ہی منہج ہے۔ بہر حال یہ کتاب غیر مرتب اور مزید تحقیق طلب تھی۔ ابونعیم اصفہانی (م:۴۳۰ھ) نے بھی زیادہ تر امام حاکمؒ کے طریقہ کار کو اپنا کر مستخرَج علی معرفۃِ علومِ الحدیث تصنیف کی اس لئے کہ مستخرج کتاب کا مزاج ہی یہی ہوا کرتا ہے۔ یہ کتاب بھی تشنہ رہی اور بعد والوں کے لئے بہت کچھ کرنے کو باقی رہ گیا۔

☆...... پانچویں صدی ہجری میں حافظ مشرق **امام ابوبکر خطیب بغدادیؒ** (م۔۴۶۳ھ) نے علوم حدیث پر بہت لکھا، ان ابحاث کو سمیٹا، مرتب کیا، کہیں تفصیل دی تو کہیں تقسیم بھی کی۔ انہی کے بارے میں ابوبکرؒ بن نقطہ الحنبلی نے **التقیید** میں لکھا:

كُلُّ مَنْ أَنْصَفَ عَلِمَ أَنَّ الْمُحدثِينَ بَعْدَ الْخطيبِ عِيالٌ علَى كُتُبِهِ۔ جو بھی منصف ہے وہ بخوبی جان لے گا کہ محدثین کرام، خطیب بغدادی کے بعد ان کی کتب کے محتاج ہیں۔ (التقیید)

یعنی سبھی ان کی کتب سے علم حدیث کی غذا لیتے اور مستفید ہوتے ہیں۔ امام ابن حجرؒ نے انہیں یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:

قَلَّ فَنٌّ مِنْ فُنُونِ الْحديثِ إلَّا وَقَدْ صَنَّفَ فِيهِ كتاباًمفرداً۔ فنون حدیث میں شاید ہی کوئی فن ایسا ہو جس

پر انہوں نے مستقل کتاب نہ لکھی ہو۔

ان کتب میں سب سے عمدہ اور وقیع کتاب الْكِفايَةُ فِي عِلْمِ الرِّوايَةِ ہے جو علوم حدیث اور اس کی روایت کے اصول وقوانین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا منہج مؤلف نے مقدمہ میں یوں واضح کیا ہے:

فِي هٰذَا الكِتَابِ: مَا بِطَالِبِ الْحَدِيثِ حَاجَةٌ إلى مَعْرِفَتِهِ، وبِالْمُتَفَقِّهِ فَاقَةٌ إلَى حِفْظِهِ، وَدِرَاسَتِهِ مِنْ بَيَانِ أُصولِ عِلْمِ الْحَدِيثِ وَشَرَائِطِهِ، وَأَشْرَحُ مِنْ مَذَاهِب سَلَفِ الرواةِ وَ النَّقَلَةِ فِي ذٰلِكَ مَا يَكْثُرُ نَفْعُهُ وَتَعُمُّ فَائِدَتُه۔ اس کتاب میں وہ کچھ ہے جس کی معرفت ایک طالب حدیث کے لئے ضروری ہے۔ اور فقیہ بننے کے خواہشمند بھی اس کے حفظ اور مطالعے کے ضرورت مند ہیں کہ اصول علم حدیث اور ان کی شرائط کی وضاحت ہو۔ اس سلسلے میں، میں نے پہلے رواۃ اور حدیث کے ناقلین کے مذاہب کو بھی واضح کیا ہے جن کا ان شاء اللہ بہت نفع اور عام فائدہ بھی ہوگا۔

امام خطیبؒ بغدادی کی علوم حدیث پر دوسری اہم کتاب، الجَامِعُ لِآدَابِ الشَّيْخِ وَالسَّامِعِ ہے۔ جس میں شیخ اور شاگرد یا سامع کے حدیث سننے اور بیان کرنے کے آداب کو انتہائی عقیدت مندی سے بیان کیا ہے اور اسلاف کی مثالیں دے کر حدیث، اس کی مجالس کا ادب واحترام نیز مشائخ حدیث کی شخصیت، دروس حدیث کی تیاری اور سامعین کی حاضری، سننے و لکھنے کے آداب وغیرہ کے مباحث شامل ہیں۔

☆......ابو العباس احمد بن فرح اللخمی اشبیلی دراز قد، بارعب اور وجیہ شخصیت کے مالک عالم حدیث تھے۔ انہوں نے علم حدیث پر ایک بڑا ملیح غزلیہ قصیدہ لکھا جسے امام دمیاطی اور الیونینی نے سنا۔ یہ شائع ہو چکا ہے جس کے کل بیس اشعار تھے۔ اس کا ایک شعر امام ذہبی رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ (۳۸۴/۵۲) میں لکھا ہے:

غَرَامِيْ صَحِيْحٌ وَالرَّجَا فِيْكِ مُعْضَلُ　　　وَحُزْنِيْ وَدَمْعِيْ مُرْسَلٌ وَمُسَلْسَلُ

میری محبت بالکل صحیح ہے اور تیرے بارے میں امید ٹوٹی پھوٹی (معضل) ہے میرا غم اور میرے آنسو بہہ (مرسل) رہے ہیں اور مسلسل بہہ رہے ہیں

☆......اسی صدی کے حافظ حدیث امام ابو یعلی الخلیل بن عبداللہ بن احمد الخلیلی (م:۴۴۶ھ) نے ایک انتہائی عمدہ کتاب اصول حدیث: مصطلح، تراجم رجال، نقد رجال اور نقد احادیث پر لکھی جس کا نام الإرشاد فی معرفة

علماءِ الحدیث رکھا۔ اس کی نفاست: تقدیم، مصطلحات حدیث، ان کی شرح اور مثالوں میں عیاں ہوتی ہے۔ ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک محدثین کے پنگھٹ کا صاف وشفاف علم، اقوال زریں سمیت انہوں نے پیش کیا ہے۔ امام بیہقیؒ (م: ۴۵۸ھ) نے بھی **المَدْخَلُ إِلَى السُّنَنِ الْكُبْرٰى** کتاب لکھی۔ جس کا دوسرا حصہ طبع ہوا ہے مگر پہلا جزء ابھی تک طبع نہیں ہو سکا جس میں علوم الحدیث اور اس کی مصطلحات پر مکمل بحث ہے۔ محقق محترم ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی نے اس جزء کی نقول اور اقتباسات کو مختلف کتب سے تلاش بسیار کے بعد شائع کیا ہے۔ امام ابن کثیرؒ نے مقدمہ ابن الصلاحؒ کے بعد امام بیہقیؒ کی اس کتاب کو علم حدیث کا مرجع ثانی قرار دیا ہے۔ **المَدْخَلُ** میں چوتھی صدی ہجری کے علماء حدیث کے اصول روایت اور اس کے قواعد سے متعلق اقوال بہ اسناد منقول ہیں۔

☆......حافظ مغرب امام ابوعمر یوسف ابن عبد البر اندلسی (م: ۴۶۳ھ) نے موطأ کی شرح **التَّمْهِيْدُ لِمَا فِي الْمُوَطَّأِ مِنَ الْمَعَانِي وَالْمَسَانِيدِ** کا ایک انتہائی نفیس مقدمہ لکھا جو علم حدیث اور مصطلحات حدیثیہ کی ابحاث میں بہت ہی جامع وشامل اور انتہائی مفید ہے۔ حافظ ابن الصلاحؒ اپنی کتاب **مَعْرِفَةُ أنواعِ عِلْمِ الْحَدِيثِ** میں اس سے بھی مستفید ہوئے ہیں۔

☆......امام علیؒ بن احمد بن سعید اندلسی (م: ۴۵۶ھ)، جو ابن حزم الظاہری کے نام سے شہرت رکھتے ہیں کی کتاب **الإحْكَامُ فِي أُصولِ الأحْكَامِ** میں علوم حدیث کے قواعد ومصطلحات بھی ہیں مگر یہ انہی کی اختراع ہیں نہ کہ محدثین کرام کے۔

☆......قاضی عیاض بن موسیٰ یحصبیؒ (م۔۵۴۴ھ) کے نصیب میں **الإلْمَاعُ إِلَى مَعْرِفَةِ أصولِ الرِّوايَةِ وَتَقْيِيْدِ السَّمَاعِ** جیسی مختصر مگر مفید کتاب تھی جس میں اصول روایت، طرق تحمل حدیث، ان کی حجیت نیز الفاظ اداء حدیث اور اس کے آداب جیسے اہم مباحث ہیں۔ اس کتاب میں مصطلحات حدیثیہ پر کوئی خاص گفتگو نہیں۔ مقدمہ صحیح مسلم کی شرح **إكْمَالُ الْمُعْلِمِ بِفَوَائِدِ مُسْلِمٍ** میں علوم حدیث کے بعض اہم مباحث کا تذکرہ ہے۔ چونکہ قاضی عیاضؒ ایک اصولی اور فقیہ بھی تھے اس لئے ان کی اس شرح میں فقہاء، اصولیین اور متکلمین کے اقوال کی بھرمار ہے جس کا غلبہ متاخر محدثین پر بھی نظر آتا ہے۔

☆......ابوحفص میانجی یا میانشی جو عمر بن عبدالمجید بن عمر القرشی نزیل مکہ (م:۵۸۰ھ) تھے انہوں نے بھی مَالاَ یَسَعُ الْمُحَدِّثَ جَهْلُهُ نامی کتاب لکھی۔ یہ ایک مختصر اور مفید کتابچہ ہے جس کا غالب حصہ امام حاکمؒ کی کتاب معرفۃ علوم الحدیث اور امام خطیبؒ بغدادی کی کتاب الکفایۃ سے منقول ہے۔

☆......امام ابوالسعادات مبارک بن محمد (م:۶۰۶ھ) ابن الاثیر کی کتاب جَامِعُ الأصولِ کے مقدمہ کا باب ثالث علم حدیث اور اس سے متعلقات کا شاہکار ہے۔ فصیح عبارت، بہتر اسلوب ولطافت میں یہ اپنی مثال آپ ہے۔ باب کے آغاز میں ہی انہوں نے اعتراف کیا کہ میری یہ محنت امام ترمذیؒ، امام حاکمؒ، اور خطیب بغدادیؒ کی کتب کی مرہون منت ہے۔

☆...... ابوبکر محمد بن موسی الحازمی (م: ۵۸۵ھ) کی شُروطُ الأئِمَّةِ الْخَمْسَةِ، ابوالفضل محمد بن طاہر المقدسی (م:۶۰۷ھ) کی شرُوطُ الأئِمَّةِ السِّتَّةِ، ابوطاہر احمد بن محمد السِّلفی (م:۵۷۶ھ) کی الوَجِيزُ فِي ذِكْرِ الْمَجازِ وَالْمُجِيزِ، (تحقیق وتخریج ڈاکٹر فرحت ہاشمی) وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔ اس فن میں بے شمار کتب ہیں مگر آخر میں دو اہم کتب کا تعارف ضروری ہے جن سے علم حدیث کوئی جہت ملی۔ ان میں پہلی کتاب کے مصنف:

☆..... علومُ الحديث یامُقَدِّمَةُ ابنِ الصلاحِ یہ ابوعمرو عثمان بن الصلاح عبدالرحمٰن شہرزوری (م:۶۴۱ھ) کی تصنیف ہے۔ دمشق کے مدرسہ اشرفیہ میں تدریس حدیث کے دوران انہوں نے اس فن کا گہرا مطالعہ کیا۔ بالخصوص امام خطیب بغدادی کی کتب سے مستفید ہوئے۔ اسے سمیٹا، نئی ترتیب دی اور پھر تھوڑا تھوڑا کر کے املاء کرایا۔ اور پینسٹھ انواع علوم حدیث بیان کیں۔ مگر کتاب ویسی مرتب نہ ہو سکی جیسا اس کا حق تھا۔ اس کتاب کے بعد علم حدیث کا فن اپنی جولانیوں سمیت ختم گیا۔

مقدمہ ابن الصلاح میں علماء کی دلچسپی

چونکہ مؤلف نے اس کتاب میں اہم مباحث پرو دیئے تھے۔ دیگر بے شمار محاسن کی وجہ سے یہ کتاب ہر طالب علم، محدث اور عالم کے لئے مشرب علم بن گئی۔ وہ اس کے اسلوب بیان، مختلف النوع موضوعات اور متعدد علمی فوائد کے ایسے فریفتہ ہوئے کہ انہوں نے اس کی متعدد شروحات واختصارات لکھے۔ حاشیے چڑھائے اور نظم بندی کی۔

حافظ عراقی رحمہ اللہ (م: ۸۰۶ھ) نے مقدمہ ابن الصلاح کی شرح لکھی جس کا نام انہوں نے اَلتَّقْیِیْدُ وَ الإِیْضَاح رکھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (م:۸۵۲ھ) نے بھی الإِفْصَاح عَنْ نُکَتِ ابْنِ الصَّلاح نام کی شرح لکھی۔ امام نووی رحمہ اللہ (م:۶۷۶ھ) نے اس مقدمہ کا اختصار الإِرْشَاد کے نام سے لکھا پھر اس کی ایک اور مختصر لکھی جس کا نام انہوں نے التَّقْرِیْب رکھا۔ جس کی شرح امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (:۹۱۱ھ) نے تَدْرِیْبُ الرَّاوِیْ لکھی۔ پھر اس کا اختصار بدرالدین محمد بن ابراہیم بن جماعۃ (م: ۷۳۳ھ) نے المَنْهَلُ الرَّوِیّ کے نام سے لکھا۔ المَنْهَل کی شرح بدرالدین کے پوتے عزالدین محمد بن ابی بکر بن جماعۃ (م:۸۱۹ھ) نے المَنْهَجُ السَّوِیّ کے عنوان سے لکھی۔ اسی طرح مقدمہ کا اختصار امام اسماعیل بن کثیر (م:۷۷۴ھ) نے بھی اختصارُ عُلومِ الْحَدِیْثِ لکھا۔ جس کی شرح البَاعِثُ الْحَثِیْثِ کے عنوان سے علامہ احمد محمد شاکر نے لکھی۔ حافظ البلقینی (م: ۸۰۵ھ) نے بھی مقدمہ کا اختصار لکھا جو مَحَاسِنُ الاِصْطِلاَحِ وَتَضْمِیْنُ کِتَابِ ابْنِ الصَّلاحِ کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔

اس کتاب کو نظم میں بھی لکھا گیا۔ حافظ عراقی رحمہ اللہ نے نَظْمُ الدُّرَرِ فِی عِلْمِ الأَثَرِ کے نام سے ہزار اشعار پر مبنی اس کا الفیہ لکھا۔ اس الفیہ میں انہوں نے کچھ اضافہ بھی کیا اور دو شرحیں بھی اس کی خود لکھ ڈالیں۔ پہلی شرح فَتْحُ الْمُغِیْثِ کے نام سے ہے اور دوسری أَلْفِیَةُ الْعِرَاقِی کے عنوان سے۔ پھر اس الفیہ عراقی کی شرح امام شمس الدین سخاوی (م:۹۰۲ھ) نے فَتْحُ الْمُغِیْثِ ہی کے نام سے لکھی۔ جو بہت مکمل اور عمدہ شرح ہے۔ اسی طرح الفیہ العراقی کی شرح شیخ زکریا انصاری (م: ۹۲۸ھ) نے بعنوان فَتْحُ البَاقِی لکھی۔ امام سیوطی نے بھی اس الفیہ پر کچھ اضافہ کر کے پانچ دنوں میں اس پر الفیہ لکھا۔

☆ ......دوسری منفرد، مختصر مگر جامع کتاب نُخْبَةُ الْفِکَرِ فِی مُصْطَلَحِ أَهْلِ الأَثَرِ ہے۔ جس کے مؤلف امام ابو الفضل أحمد بن علی بن محمد المعروف بابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ (م:۸۵۲ھ) ہیں۔ پھر خود اس کی شرح بھی لکھی جو نُزْهَةُ النَّظَرِ فِی تَوضِیْحِ نُخْبَةِ الْفِکَر کے نام سے ہے۔ علماء حدیث نے اس پر توجہ دی۔ کیونکہ یہ مختصر، مرتب، محقق اور اہم مباحث پر مشتمل کتاب تھی نیز اس میں چند ایسے مباحث تھے جو مقدمہ ابن الصلاحؒ میں نہیں تھے۔ اس لئے یہ کتاب مدارس وعلماء کے ہاں اہمیت اختیار کر گئی جس کی شروحات، مختصرات اور حواشی اور نظم بکثرت

لکھی گئیں جن کا احاطہ کرنا شاید آسان نہیں۔ امام ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

میں نے بھی احباب کے اصرار پر ایک کتاب لکھی جس کا نام **نُخْبَةُ الْفِكَرِ** رکھا ہے۔ پھر اس کی ایک شرح لکھی جو **نُزْهَةُ النَّظَرِ** کے نام سے ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس میں متکلمین اور فقہاء کی ضروریات کو میں نے پیش نظر رکھا ہے۔ (شرح نخبۃ الفکر: ۲۔۵)

☆..... علم حدیث میں جن متاخر علماء نے حصہ لیا ان میں امام نوویؒ (م: ۶۷۶ھ)، ابن دقیق العید، الذہبی، ابن کثیر (م: ۷۷۴ھ)، عراقی (م: ۸۰۶ھ)، ابن حجر (م: ۸۵۲ھ) اور سیوطی (م: ۹۱۱ھ)، سخاوی رحمہم اللہ شامل ہیں انہوں نے بالترتیب اختصار در اختصار، نظم اور شرح جیسا کام اسی مقدمہ ابن الصلاح پر کر ڈالا۔ **التَّقْرِيْبُ، الِاقْتِرَاحُ، الْمُوقِظَةُ، الباعِثُ الحَثِيثِ، النُّكَتُ عَلَى كتابِ ابن الصلاحِ، أَلْفِيَة** جیسے عمدہ کام اس کتاب کی خدمت ہیں۔ اس علم میں انتہائی جامع کتاب محمد بن ابراہیم (م: ۸۴۰ھ) نے لکھی جو **تَنْقِيْحُ الأَنْظَارِ** کا عنوان رکھتی ہے۔ اور جو ابن الوزیر کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی طرح نخبۃ الفکر کی ایک قابل قدر شرح شیخ عبدالروف المناوی (م: ۱۰۳۱ھ) نے **اليَوَاقِيْتُ الدُّرَرِ فِيْ شَرْحِ نُخْبَةِ الفِكَرِ** لکھی۔ جدید تصنیفات میں قابل قدر کام **تَوْضِيْحُ الأَفْكَارِ** از امیر صنعانی (م: ۱۱۸۲ھ)، **قَوَاعِدُ التَّحديثِ** از جمال الدین قاسمی (م: ۱۳۳۲ھ) اور **تَوجِيهُ النَّظرِ** از شیخ طاہر جزائری (م: ۱۳۳۸ھ) کی کتب ہیں۔ اس طرح ایک راہنما کتب کا خاطر خواہ ذخیرہ بھرپور نقد و تبصرے کے بعد دستیاب ہو گیا۔ آج بحمد اللہ علم حدیث خَيْرُ الْكَلَامِ مَا قَلَّ وَدَلَّ کے اصول پر قائم اور اہل فکر کے لئے ایک راہنما و دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

علم حدیث کی انواع

۱۔ **علم حدیث روایۃ:** یہ حدیث کا وہ علم ہے جس کا تعلق صرف روایت حدیث سے ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے:

هُوَ عِلْمٌ يُعْلَمُ بِهِ أَقْوالُ النَّبِيِّ ﷺ وَأَفْعَالُهُ وَتَقَارِيْرُهُ، وَضَبْطُهَا وَرِوَايَتُهَا وَتَحْرِيْرُ أَلفَاظِهَا۔

رسول اللہ ﷺ کے ہر قول و فعل اور تقریر، نیز ان کا ضبط، روایت اور حدیث کے الفاظ کی صحیح تحریر کا علم۔

علماء حدیث نے اس تعریف میں ''روایت'' سے مراد درج ذیل معنی لئے ہیں۔

۱) روایت: لغت میں بات کو دوسرے تک پہنچانے کا نام ہے۔اصطلاح میں حدیث کو دوسرے تک پہنچانا اور جس نے بیان کی ہے یعنی قائل کی طرف مخصوص الفاظ سے اسے منسوب کرنا۔ جیسے: حَدَّثَنَا، یا أَخْبَرَنَا، یا سَمِعْتُ یا عَنْ۔ پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اسے حاصل کرنا اور پھر آگے پہنچانا۔ جو کچھ بھی نہ پہنچائے وہ راوی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی حدیث بیان کرے مگر اسے قائل کی طرف منسوب نہ کرے تو اسے روایت نہیں کہتے۔

۲) روایت حدیث میں متن اور سند کے الفاظ کا صحیح ضبط ہو اور متعلقہ تمام احادیث کی اسانید کا احاطہ بھی۔

۲) راوی کے نام کی تحقیق وتصدیق ہو نیز جس شیخ سے روایت کی اس کے مبینہ الفاظ اور انداز اداء کا بخوبی ضبط۔

۳) رواۃ اور متن کے احوال کی بحث سے اجتناب کیا جائے۔

فائدہ: روایت حدیث کے ذریعے سنت رسول، ایام رسول اور امور رسول ضبط تحریر میں آکر محفوظ ہو گئے۔ مختار قول کے مطابق صحابہ کرام کی طرف منسوب بات بھی اس میں شامل ہو سکتی ہے۔

روایت بالمعنی: یہ یاد رکھئے! کہ افعال، تقریر اور صفات رسول سے متعلق تمام احادیث معناً ہی روایت ہوں گی۔ یعنی یہ صحابی رسول کے اپنے الفاظ میں ڈھلی ہوں گی جو اس کی اپنی نظر، سوچ اور فکر کے مطابق ہوں گے۔ یہ احادیث تمام حدیثی مواد میں ستر فی صد سے زائد ہیں۔ ان احادیث میں لفظی تغیر، کمی وبیشی یا تقدیم وتاخیر صحابی سے ممکن ہے۔ مگر کیا متأخر راویوں کے لئے ایسا کرنا جائز ہے؟ اس کا جواب آگے آ رہا ہے۔
ہاں آپ ﷺ کے ارشادات جو سارے حدیثی مواد میں بیس فیصد سے بھی کم ہیں۔ انہیں بلفظہ ادا کرنا ویسا ضروری ہے جیسا راوی نے اپنے شیخ سے سنا ہوتا ہے۔ جن میں کسی تبدیلی، کمی وبیشی یا تقدیم وتاخیر کی قطعاً اجازت نہیں۔ لیکن اگر راوی، حدیث کے مخصوص الفاظ بھول جائے اور اسے یہ یقین ہو کہ اس کا مفہوم یہ ہے تو کیا وہ وقت ضرورت ان الفاظ کو معناً بیان کر سکتا ہے؟ محدثین کا اصول یہ ہے کہ ایک عادل راوی بھی ایسا کرنے کا مجاز نہیں۔ بلکہ وہی الفاظِ حدیث بیان کرے جو آپ ﷺ کے ہیں۔ مگر کچھ محدثین ان حدیثی الفاظ کو دو حصوں میں منقسم کرتے ہیں:

ا۔ جو الفاظ حدیث مشروع اذکار کے ہیں اور جن کے مخصوص الفاظ ہیں انہیں بدلنا جائز نہیں۔ اگر راوی انہیں بھول گیا ہے تو توقف کرلے۔

۲۔ دوسری قسم ان الفاظ کی ہے جن سے لفظی نہیں بلکہ ان کا مفہوم اجاگر ہوتا ہے۔ اور جن کا تعلق آپ ﷺ کے افعال، تقریرات اور عام اجتماعی معاملات سے ہے۔ ان الفاظ میں چند شروط کے ساتھ تبدیلی کی جاسکتی ہے:

أ۔ یہ روایت ایسے متقن اور ضابط عالم سے ہو جو حدیث کو لغت کے اعتبار سے سمجھتا ہو اور مراد حدیث کو بھی۔ جیسے امام ابن شہاب الزہری رحمہ اللہ۔

ب۔ ضرورت اس کی داعی ہو مثلاً راوی لفظ حدیث کو بھول رہا ہو اور اس کے معنی کا بخوبی حافظ ہو اور اسے صحیح جامہ پہنا سکتا ہو۔ وہاں الفاظ حدیث اسے یاد دلا دیے جائیں۔ اور اگر الفاظ حدیث کا حافظ ہو پھر تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا الا یہ کہ اسے مخاطب کو سمجھانے کی ضرورت پیش آجائے۔

ج۔ الفاظ حدیث ایسے نہ ہوں جو عبادت کے لئے ہی بیان ہوئے ہوں جیسے اذکار کے الفاظ۔ کیونکہ ایسے اذکار کے الفاظ توقیفی ہوا کرتے ہیں جنہیں بالمعنی روایت نہیں کیا جاسکتا۔

د۔ اگر کسی حدیث کو بالمعنی روایت کرنا بھی ہو تو حدیث بیان کرنے کے بعد أو کَمَا قَالَ ﷺ جیسے الفاظ ضرور کہے جو سامع کو یہ باور کرادیں گے کہ لفظ حدیث تو نہیں بلکہ اس کا معنی پیش کیا گیا ہے۔

یہی تقسیم اور مفہوم ہی درست ہے کیونکہ اگر ہم انہی الفاظ کی روایت پر ہی زور دیں تو ہر حدیث مشکوک ہو جائے۔ مثلاً: حدیث کے یہ الفاظ: زَوَّجْتُکَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرآنِ۔ اور دیگر روایات میں مَلَّكْتُكَهَا بھی آیا ہے۔ یہی اس کا معنی ہے جو صحیح بخاری میں بار بار پیش کیا گیا ہے۔ اگر ہم اسے غیر جائز کہیں تو پھر شریعت کو دیگر زبانوں میں پیش کرنا بھی غیر جائز ہوگا۔ اگر زبان کو شریعت کی تبلیغ کے لئے بدلا جاسکتا ہے تو پھر حدیث کے ایک لفظ کو دوسرے عربی لفظ میں ہی بدلا گیا ہے۔ عالم حدیث اگر اس لفظ کو بھول جائے اور وہ اس کے ملتے جلتے مفہوم میں اسے بیان کردے تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ تسلی کی بات یہ ہے کہ ایسا صرف بہت ہی کم احادیث میں ہوا ہے۔ مگر بعض لوگوں نے اسے اپنے فقہی اختلاف کا سبب وموضوع بنالیا ہے۔ حالانکہ ہے سب کا اپنا اپنا استنباط۔ ہمیں بھی

حدیث نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَاً سَمِعَ ۔۔کی رو سے ثقات وعادل رواۃ حدیث سے حسن ظن رکھنا چاہئے۔باقی جس صحابی نے بِنَبِيِّكَ الَّذِيْ أَرْسَلْتَ کو بِرَسُوْلِكَ پڑھا تھا تو آپ ﷺ نے دراصل تبدیلی معنی کی وجہ سے تصحیح فرمائی۔ کیونکہ رسول تو فرشتہ بھی ہوسکتا ہے۔جبکہ آپ ﷺ نے اس دعا میں دونوں صفات نبی اور رسول کو جمع کر دیا تھا۔

۲۔ **علم حدیث درایۃً:** یہ حدیث کی حقیقت جاننے کا علم ہے۔جس کی تعریف یہ ہے۔

عِلْمٌ يُتَعَرَّفُ مِنْهُ حَقِيقَةُ الرِّوايَةِ، وَأحكامُهَا، وشُروطُهَا وشُروطُ الرُّواةِ وَأَصْنافُ الْمَروِيَّاتِ، وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهَا۔ یہ علم روایت کی حقیقت اور اس کے احکام وشروط کا علم دیتا ہے۔نیز رواۃ کی شروط اور مرویات کی اقسام اور ان سے متعلق دیگر امور کا شعور دیتا ہے۔

درایت سے مراد: حدیث کی سند اور متن کا درست فہم وادراک درایت کہلاتا ہے۔جس میں بحث وتنقید کے بعد سند ومتن کے صحیح یا ضعیف ہونے کا حکم بھی لگایا جاتا ہے۔استدلال کا یہی توازن ہی درایت کہلاتا ہے۔

حقیقت روایت سے مراد ہے: سنت وحدیث کو آگے نقل کرنا اور جس سے لی اسی کی طرف اسے منسوب کرنا۔حقیقت روایت ہے۔

شروط سے مراد راوی حدیث کا تحمل۔۔۔یعنی حدیث کو کس کس طریقے سے حاصل کیا۔اسے تحمل حدیث کہتے ہیں جس کے آٹھ طریقے ہیں جن میں سماع، قراءۃ، اجازہ ومناولہ وغیرہ شامل ہیں۔

اصناف روایات: یعنی حدیث متصل ہے یا منقطع، مرسل ہے یا مدلس وغیرہ کی تفصیل۔یا مرویات کی اقسام کیا ہیں۔مثلاً مسانید، معاجم واجزاء وغیرہ کا تفصیلی تعارف۔احادیث ہیں یا آثار۔

خلاصہ:

علم الحدیث روایۃً: ایسا علم جس میں رسول کریم ﷺ کی طرف منسوب اقوال، افعال، تقریر یا اوصاف کے ضبط اور اس کے الفاظ کی تحریر پر مشتمل مباحث ہوں۔کہ ان کی روایت کیسے ہوئی؟

علم الحدیث درایۃً: چند قوانین جن کے ذریعے سے سند ومتن کے حالات کا علم ہو۔یا وہ قوانین جو راوی

اور مردی کی حالت بتادیں کہ انہیں قبول کیا جائے یا رد؟

اصول وقواعد:

...... آپ ﷺ نے جو کچھ کہا اور کیا منجانب اللہ ہوتا ہے۔ ورنہ نعوذ باللہ یہ شریعت سازی ہوتی جس کی آپ ﷺ کو اجازت نہیں تھی۔ (الجاثیۃ: ۱۸، الشوری: ۲۱، ۱۳، المائدۃ: ۴۸)

...... غیبی اور متشابہ امور بھی احادیث میں ہیں جن پر ایمان بلا ریب ہونا ضروری ہے۔ ان میں عقلی تک بندی درایت نہیں بلکہ ایمانی کمزوری ہے۔ اسی لئے صحت حدیث کے لئے سند ومتن دونوں پر زیادہ نظر ہونی چاہئے جو محدثین نے رکھی۔

...... علم حدیث میں غور وخوض کی صلاحیت ہے۔ جس کا بھرپور مظاہرہ روایت اور درایت میں کیا گیا ہے ورنہ مصطلحات اور دیگر علوم الحدیث میں جو گہرائی، دقت اور اختصار ہے وہ فکر وتدبر حدیث کے گہرے شواہد ہیں۔

...... درایت حدیث میں مقصد شریعت، فہم حدیث، اصول وفروع میں نص حدیث کی حدود اور ان میں رہنے کا اسلوب آجاتا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے درست فرمایا تھا:

الْحَدِيثُ الصَّحِيحُ لَا يُعْرَفُ بِرِوَايَتِهِ فَقَطْ، وَإِنَّمَا يُعْرَفُ بِالْفَهْمِ وَالْحِفْظِ وَكَثْرَةِ السَّمَاعِ۔
(معرفۃ: ۵۹) حدیث صحیح محض روایت سے نہیں بلکہ اسے فہم، حفظ اور کثرت سماع سے جانا جاسکتا ہے۔

...... محدثین نے ایسی حدیث کی بالکل تصحیح نہیں کی جو عقل یا قیاس جلی کے خلاف تھی۔ ہاں اس حدیث کی ضرور تصحیح کی ہے جسے عقل بافت نہ کرسکے۔ محدثین کبھی بھی نقد حدیث سے غافل نہیں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاذ، منکر، مضطرب اور موضوع وغیرہ اصطلاحات کو ان کے علاوہ کوئی اور متعارف نہ کراسکا۔ ڈاکٹر صبحیؒ صالح لکھتے ہیں:

حدیث نبوی کے متن یا عبارت کا درس ومطالعہ اور کتب روایت کا حفظ واہتمام اس وقت تک بے کار ہے جب تک اس کے پہلو بہ پہلو درایت حدیث نہ ہو یعنی اس کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر نہ کرلیا جائے۔ درایت حدیث ہی وہ فن ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کے اقوال وافعال کا تاریخی تفصیلی اور

تجزیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

درایت حدیث کا علم، حدیث نبوی کی عبارت سے وہی تعلق رکھتا ہے جو علم تفسیر کو قرآن کریم سے ہے یا احکام کو واقعات سے۔ درایت حدیث سے متعلق بیشتر مباحث، حدیث کے ابتدائی دور میں جداگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ موضوع، غرض وغایت اور طرز و انداز کے اعتبار سے یہ مباحث بالکل منفرد تھے جب تدوین حدیث اور تصنیف و تالیف کا دور آیا تو ہر عالم نے ایک الگ شعبہ چن لیا۔ اور اس طرح درایت حدیث سے متعلق علوم، کئی قسموں میں بٹ گئے۔ مگر علوم الحدیث کا نام سب اقسام پر حاوی ہے۔

......علماء نے ان دونوں اقسام کے یہ چند نام بھی تجویز کئے ہیں۔

علوم الحدیث، مصطلح الحدیث، اصول الحدیث۔

اس علم کے بارے میں صاحب درمختار نے کیا ہی خوب نقل کیا ہے۔

العُلُومُ ثَلَاثَۃٌ: علوم تین ہی ہیں: عِلْمٌ: نَضَجَ وَمَا احْتَرَقَ وہ علم جو پکا مگر جلا نہیں۔ وعِلْمٌ : مَا نَضَجَ وَ احْتَرَقَ وہ جو پکا نہیں اور جل گیا ہے۔ وَعِلْمٌ : نَضَجَ وَ احْتَرَقَ۔ وَھُوَ عِلْمُ الحدیثِ. وہ علم جو پکا اور جل گیا یہ علم حدیث ہے۔

علم مصطلح کیوں؟

مصطلح یا اصطلاح کا معنی ہے: اتِّفَاقُ قَوْمٍ عَلَی وَضْعِ الشَّيْءِ۔ کسی شے کو بنانے میں قوم کا اتفاق۔ یا لغوی معنی سے دوسرے معنی کی مراد بیان کرنے کے لئے کسی لفظ کا استخراج، اصطلاح کہلاتا ہے۔ اس میں لغوی معنی کی کبھی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جیسے: صلاۃ، زکوۃ یا حج وصوم وغیرہ۔

علماء حدیث نے حدیث کے علم میں اپنے استعمالات کو جو عرفی نام دیا وہ اصطلاح یا مصطلح کہلایا۔ مثلاً: یہ حدیث ضعیف ہے۔ یا فلاں راوی مدلس ومنکر ہے۔ یا یہ حدیث معلق، مسلسل یا منقطع ہے وغیرہ۔ ایسی مصطلحات کی وضاحت بھی انہوں نے خود کی ہے۔ ایک اور خاص بات اس کے قواعد واصول ہیں۔ مثلاً: وصل اور ارسال کی

تعریف کے بعد یہ جاننا کہ ان دونوں میں تعارض کی صورت میں کیا قاعدہ ہے؟ اس کے لئے یہ مصطلح تَعَارُضُ الْوَصْلِ وَالاِرْسَالِ متعارف ہوئی۔ صحیح وحسن اور ضعیف احادیث میں یا صحاح کے مابین کس حدیث کو یا صحیح ومرسل میں کس حدیث کو کس قاعدہ کی رو سے ترجیح دی جائے۔ رجال صحیحین اور ان کی شروط یا معتزلہ ومتکلمہ اور منکرین حدیث کے حدیث کو غیر مقبول قرار دینے کے وضع کردہ اصولوں کا جواب بھی ان قواعد ومصطلحات کے روشنی میں دیا گیا ہے۔ ضمناً حدیث کی تحقیق کا طریقہ کار متعین کر دیا، کتب حدیث کے مراتب وطبقات بھی گنوا دیے گئے۔ کتب حدیث کے مختلف ناموں مثلاً جامع، سنن، مستخرج، مستدرک، مسند، معجم، اجزاء، اور کتب اطراف وعلل نیز اربعینات بھی انہی مصطلحات کا ثمرہ ہیں۔ ان مصطلحات کی تعداد ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔

کچھ فرد مایہ قسم کے لوگ بھی جب حدیث میں مشق آزمائی کرنے لگے تو حدیث کی پہچان کے لئے ان اصطلاحات کا مقید کرنا اور متعارف کرانا اور ضروری ہو گیا تھا۔ اس علم کی رو سے وہ افراد جو محدثین کا مقام حاصل کرنا چاہتے تھے اپنی نااہلی کے سبب صف محدثین سے خارج کر دیے گئے۔ اور ان کی غیر محتاط روش تھم گئی۔ نیتجتاً مسلک ومذہب سے بالا ہو کر اصول حدیث اور اصول فقہ دوش بدوش چلنے لگے اور اختلافی مسائل میں ترجیح قائم کرنے کا میزان بن گئے۔

یہ علم بھی بتدریج تحقیق ومناقشہ سے متعارف ہوا۔ ایسی آسان اصطلاحات کا استعمال ان سے شروع ہو گیا۔ مثلاً جب دو احادیث میں تعارض دیکھا۔ اگر ان میں جمع وتوفیق ممکن دیکھی تو کہہ دیتے: اب ان میں کوئی اضطراب نہیں۔ اس طرح اصطلاح مضطرب وجود میں آئی۔ دیگر اصطلاحات مثلاً صحیح وسقیم، منکر ومعروف، مرسل، وآحاد وغیرہ بھی ایسی ہی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اسی طرح متواتر وعلم ظنی کی مصطلحات بطور وضاحت مستعار لیں تاکہ حدیث کا معاملہ خالص رہے۔

☆......درایت کا یہ ضابطہ کہ خبر واحد سے کتاب الٰہی پر زیادتی جائز نہیں بہت کمزور تھا۔ اس لئے کہ یہی اصول: وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔ جیسی خبر واحد پر منطبق نہ ہو سکا۔ اس لئے محدثین کو مصطلح خبر واحد کی جامع تعریف متعارف کرانا پڑی۔

☆......بعض صحیح احادیث کچھ فقہاء ومفتی تابعین کو نہیں پہنچ سکی تھیں اسی لئے انہیں اپنی رائے پر انحصار کرنا

پڑا۔ یہ ان کی درایت تھی۔ دیگر فقہاء و تابعین و تبع تابعین نے اس سلسلے میں صحابہ کرام کی پیروی کی اور صرف وہ عمومات یعنی عام الفاظ پر چلے اور انہی کے مطابق فتوی دیا۔ جب تیسرے طبقہ تابعین میں ان احادیث کی شہرت ہوئی تو انہیں گمان ہوا کہ یہ احادیث کچھ کہہ رہی ہیں اور ہمارے مشائخ کے عمل اور متفق علیہ طریقے کچھ؟ اس لئے انہوں نے مشائخ کا عمل، ان کے طریقے اور بہت سے فقہی مسائل احادیث قبول کرتے ہوئے رد کر دئے۔

☆...... درایت کا ایک مفروضہ یہ بھی بنایا گیا کہ ہوسکتا ہے ایک حدیث طبقہ صحابہ یا تابعین میں صحیح ہو اور بعد کی سند میں وہ ضعیف ہوگئی ہو؟ اس لئے پہلے فقہاء کا استدلال صحیح حدیث پر تھا جسے بعد میں ضعیف کہا گیا؟ سوال یہ ہے کہ وہ آخر کون سی حدیث تھی جو استدلال کا مصدر تو بنی مگر وہ مل نہ سکی بلکہ وہ گم ہوگئی؟ کیا کوئی فقیہ یا اس کا شاگرد ایسی احادیث کو ضبط تحریر میں نہ لا سکا؟

☆...... علماء صحابہ و تابعین کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر مسئلہ میں حدیث کی تلاش کرتے تھے۔ جونہی انہیں کوئی حدیث اپنے استدلال کے خلاف ملتی وہ فوراً اپنی رائے و اجتہاد سے کنارہ کش ہو جاتے۔ اس روش نے حدیث پر عمل کرنا باعث فخر بنا دیا تھا۔

...... ان اصطلاحات نے عام و خاص پر بڑا مثبت اور گہرا اثر ڈالا ہے۔ وہ یوں کہ فقہ، وعظ اور ترغیب و ترہیب جیسی کتب میں جب سے احادیث کی تصحیح کے لئے تخریج اور نقد شروع ہوئی ہے اس نے نہ صرف سب کی آنکھیں کھول دی ہیں بلکہ مسلمان کو یہ شعور بھی بخشا ہے کہ وہ بھی صرف صحیح حدیث کو ہی اپنا مطمح نظر بنائے۔

☆☆☆☆☆

وَلَا تَکُ کَالدُّخَانِ یَعْلُوْ بِنَفْسِهِ   عَلَی طَبَقَاتِ الْجَوِّ وَهُوَ وَضِیْعٌ

دھواں مت بنو جو فضا کی پہنائیوں میں اپنے آپ کو بلند تو کر لیتا ہے مگر پھر بھی وہ حقیر ہی ہوتا ہے

علم، ظن اور یقین

علم: اس سے مراد مخلوق کا علم ہے۔ کسی چیز کا صحیح ادراک، علم کہلاتا ہے۔ اور اس کا عدم ادراک جہل۔ کسی چیز کا ایسا ادراک کہ اس میں جزم نہ ہو وہ شک ہوتا ہے اور اگر جزم ہو مگر مطابق واقعہ نہ ہو وہ جہل مرکب ہے۔ مثلاً: اگر کوئی پوچھے کہ پاکستان کب بنا؟ تو جواب اگر یہ ہو: مجھے معلوم نہیں۔ تو یہ جہل ہے۔ لیکن اگر اس سوال کا جواب یہ ہو: سن ۱۹۴۷ میں یا ۱۹۴۸ میں۔ تو یہ شک ہے۔ اور اگر جواب یہ ہو۔ سن ۱۹۴۰ میں۔ تو یہ جہل مرکب ہے۔ اور اگر جواب یہ ہو سن ۱۹۴۷ میں۔ تو یہ علم ہے۔

قَالَ حِمَارُ الْحَكِيمِ تومَا: لَو أَنْصَفَ الدَّهْرُ كُنْتُ أَرْكَبُ

فَإِنَّنِي جَاهِلٌ بَسِيطٌ وَصَاحِبِي جَاهِلٌ مُرَكَّبُ

حکیم توما کے گدھے نے کہا: اگر زمانہ میرے ساتھ انصاف کرتا تو میں سوار ہوتا۔ کیونکہ میں تو محض سیدھا سادھا جاہل ہوں مگر میرا مالک جو میرے اوپر سوار ہے وہ جاہل مرکب ہے۔

علم کی علماء نے دو قسمیں بتائی ہیں۔

۱۔ **علم ضروری**: وہ علم جو بغیر غور و استدلال کے حاصل ہو اسے علم ضروری کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانی بوجھی معلوم شے ہے۔ جیسے یہ علم کہ آگ گرم ہوتی ہے اور کعبہ مسلمانوں کا قبلہ ہے اور محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں۔ حواس خمسہ بھی اسے معلوم کر لیتے ہیں۔

۲۔ **علم نظری**: لفظ نظر کے متعدد معانی علماء لکھتے ہیں۔ جن میں سے ایک رؤیت عینی بھی ہے۔ اور دوسرا غور و فکر کا نتیجہ بھی۔ یہی معنی یہاں مراد ہیں۔ احکام شریعت کا صحیح علم غور و فکر اور استدلال کا نتیجہ ہی ہوا کرتا ہے بشرطیکہ غور و فکر کرنے والا ان صلاحیتوں کا مالک ہو۔ اس کا دوسرا نام علم مکتسب بھی ہے۔ ناظر و مفکر میں یہ صلاحیتیں مکمل موجود ہوتی ہیں کہ اس کے تمام عقلی و حسی آلات و اعضاء ٹھیک کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کی نظر دلیل پر ہوتی ہے۔ آیا وہ پختہ و بھرپور دلیل ہے یا نہیں؟ شبہات پر اس کی نظر نہیں ہوتی۔ ناظر استدلال کی تمام شروط سے بھی آگاہ ہے؟

ظن: مرجوح کے مقابلے میں راجح جانب کو ظن کہتے ہیں اور مرجوح وہم ہوتا ہے۔ امام راغب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ظن کے بعد اگر أن ہے تو یہ معدوم اشیاء کے ساتھ مخصوص ہوگا خواہ وہ قول ہو یا عمل۔ اور اگر أنَّ مثقلہ یا مخففہ ہو تو ظن قوی متصور ہوگا۔

☆......قرآن کریم میں لفظ **ظن** انہتر بار صرف وہم و شک یا جھوٹ کے معنی میں نہیں بلکہ یقین و علم کے معنی میں آیا ہے۔ اور بعض مقامات پر مذمت کے معنی میں اور کچھ مقامات پر معنی تحسین میں بھی آیا ہے۔ معنی مذمت میں فرمایا: ﴿اجتنبوا كثيراً من الظن فإن بعض الظن إثم﴾ بہت سے گمان کرنے سے بچو اس لئے کہ کچھ گمان گناہ ہوا کرتے ہیں۔ سبھی ظنون کی مذمت اس آیت میں نہیں کی گئی۔ اور تحسین کے لئے: ﴿الذين يظنون أنهم ملاقوا ربهم وأنهم إليه راجعون﴾ جو یہ ظن رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور بلاشبہ اس کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ گویا قیامت کے وقوع اور اللہ سے ملاقات کا ظنی عقیدہ، ایمان کی علامت ہے۔ وہ اس طرح کہ مر کر انسان آخر کہاں جاتا ہے؟ آثار و قرائن کو دیکھ کر انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ اس آیت میں دیکھئے: ﴿وظن أنه الفراق﴾ اسے یقین ہو چلا کہ اب جدائی کی گھڑی آ ہی گئی۔ یہاں ظنی عقیدہ بمعنی یقین ہے۔ خواہ اس سے پہلے اس کا ایمان تھا یا نہ تھا۔ ظن پر احکام کا دارومدار بھی ہے: جیسے: ﴿فإن طلقها فلا جناح عليهما أن يتراجعا إن ظنا﴾۔ اگر دوسرا شوہر طلاق دے دے تو اب پہلے شوہر اور مطلقہ بیوی اگر رجوع کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں بشرطیکہ اگر دونوں ظن کریں کہ وہ اللہ تعالی کی قائم کردہ حدود کو پامال نہیں کریں گے۔ ہمارا سارا عدالتی نظام ظن پر قائم ہے۔ اس لئے لفظ ظن اپنے کئی احتمالات کے ساتھ مختلف معانی میں اپنی اپنی جگہ استعمال ہوگا۔ ہر جگہ اسے ایک ہی پنجابی والا مفہوم نہیں دینا چاہئے۔

☆......قرآن کریم کے علاوہ ہر علم پر لفظ ظن کا اطلاق ہوا ہے۔ علم فقہ کے بارے میں متقدمین کا کہنا ہے: الفِقْهُ مِن بابِ الظُّنُونِ۔ فقہ تو سراسر ظنیات کا باب ہے۔ امام بیضاویؒ واحد فقیہ ہیں جو بہ شدت اس بات کے قائل ہیں: فقہ قطعی علوم میں سے ہے۔ یہ بات محدثین تو نہیں کہتے مگر یہ بحث ضرور کرتے ہیں کہ آیا خبر واحد علم یقین کا فائدہ دیتی ہے یا علم ظنی کا۔ جیسے امام ابن حجرؒ فرماتے ہیں: أَخْبارُ الآحادِ تُفِيدُ الظَّنَّ۔ خبر واحد ظن کا معنی و فائدہ دیتی ہیں۔ جس

سے مراد غلبہ ظن ہے۔ جو یقین کے قائم مقام ہے۔ ظن کے کچھ درجات ہیں جن میں اعلیٰ ترین درجہ: غلبہ ظن کا ہے۔

☆...... محدثین نے ہر حدیث کو ظن کے معنی میں لیا۔ اس کی تحقیق کی۔ ظن سے نکلے اور بات کی تہہ تک پہنچ کر کہا کہ یہ حدیث ضعیف ہے یا یہ حدیث صحیح۔ محدثین کرام نے حدیث میں علامات کو پا کر اسے ظن سے نکالا اور اسے یقین دے دیا۔ ضعیف، ومنکر اور مرسل وغیرہ کی اصطلاحات ہوں یا صحیح وحسن کی یہ سبھی اسی ظن سے نکلے ہوئے نتائج ہیں۔

☆...... احادیث کے بارے میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ سب ظنی ہیں یقینی نہیں۔ بعض اہل علم نے حدیث کی تعریف میں ظن کا لفظ استعمال کیا تو لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ احادیث کا معاملہ ہی ظنی ہے جیسے امام ابن حجرؒ فرماتے ہیں: أَخْبَارُ الآحَادِ تُفِیْدُ الظَّنَّ۔ خبر واحد ظن کا فائدہ دیتی ہیں۔ اس لئے بارشاد الٰہی یہ لوگ ایسا فیصلہ کر بیٹھے: ﴿إن الظن لا یغنی من الحق شیئا﴾ ظن صحیح اور سچی بات کا فائدہ ہی نہیں دے سکتا۔ اس لئے احادیث ظنی ہیں ان کا ماننا یا ان پر عمل کرنا مفید نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ تُفِیْدُ الظَّنَّ والی بات اس وقت کی ہے جب اصول فقہ میں معتزلی خیالات پروان چڑھ رہے تھے ورنہ متقدم محدثین میں حدیث کے لئے ظن کی اصطلاح کا وجود عنقا ہے۔ باقی ظن کیا واقعی حق کے مقابلے میں فائدہ دے سکتا ہے؟

☆...... صرف دین نہیں بلکہ دنیا کے اکثر معاملات ظن غالب پر چل رہے ہیں جیسے عدالتی فیصلے یا حکومتی قوانین، انٹرویوز، مناصب، تجارت ومعاشرت وغیرہ۔ جس کا انکار ہم نہیں کر سکتے ورنہ بدگمانی اور نفرت جگہ لے گی۔ معاشرتی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر دین نے اکثر احکام ومسائل کو ظن غالب کی بنیاد پر بیان کیا ہے اور انہیں شرعی حیثیت دی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر معاملات دنیا نہیں چل سکتے۔ زنا کے اثبات، مالی معاملات اور نکاح وطلاق کے بارے میں گواہ مقرر کرنے اور گواہی لینے کا حکم دیا ہے جو ظن کا ہی فائدہ دیتی ہے۔ پھر ظن غالب کی بنیاد پر جج کا فیصلہ ہوتا ہے کہ گواہ نے گواہی صحیح دی ہے۔ اگر ظن غالب، حق کے مقابلہ میں نہیں تو اس پر عمل کیونکر نہ ہو؟ جیسے: ﴿فإن طلقها فلا جناح علیهما أن یتراجعا إن ظنا أن یقیما حدود الله﴾ (البقرۃ: ۲۳۰)۔ یعنی اگر ظن غالب ہو کہ میاں بیوی حدود الٰہی کے پابند رہیں گے تو طلاق دے کر رجوع کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح ﴿إن الظن لا یغنی

من الحق شیئاً﴾ میں ظن کا معنی لاعلمی و جہالت ہے۔مراد یہ ہے کہ حق کے مقابلہ میں لاعلمی و جہالت کوئی فائدہ نہیں دیتی۔حدیث رسول حق ہے اور حق،حق کے مقابلے میں کیسے ہوگا؟ آیات متشابہات بھی ظنی الدلالۃ ہیں۔

☆.....قرآن کریم میں بعض الفاظ کے دو احتمال ہیں مگر ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی دلیل نہیں۔جیسے: ﴿لا تضار والدة بولدها﴾ (البقرة:۲۳۳) جس کے دو معنی ہیں: والدہ اپنے بچے کی وجہ سے ضرر نہ دی جائے۔یا۔وہ ضرر نہ دے۔یا لفظ ﴿قروء﴾ وغیرہ دیکھ لیجیے۔اختلاف قرائت کے قائل دونوں معنی (حیض وطہر) مراد لے سکتے ہیں مگر جو مختلف قرائتوں کے قائل نہیں وہ کیا معنی لیں گے؟ منکرین حدیث بھی اس کے ایک معنی پر متفق نہیں۔یہاں بھی قرائن کو دیکھ کر قطعیت کے ساتھ نہیں بلکہ ظن غالب کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔لہٰذا قرآن کریم دلالت کے اعتبار سے ظنی ہوا۔مگر ثبوت اور سند کے لحاظ سے قطعی ہے۔اسی طرح ان آیات میں بھی قطعی معنی لینا ممکن نہیں ہے: ﴿لا یضار کاتب ولا شہید﴾، ﴿ واللیل إذا عسعس﴾، ﴿أو یعفوا الذی بیده عقدة النکاح﴾،دونوں احتمال ہیں ایک کو ترجیح دی جائے تو وہ قطعی نہیں بلکہ ظنی ہوگا۔

☆.....یونانی فلسفہ کی اصطلاح کا وجود متقدم محدثین کے ہاں نہیں ملتا۔علوم الحدیث میں یہ محض جواب آں غزل کے طور پر جگہ پا گئی۔اگر خیر القرون کی طرح ظن و یقین کے صحیح معنی متعین ہو جائیں تو کئی غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔

یقین: اعتقاد جازم کو کہتے ہیں یعنی واقعہ کے مطابق پختہ اعتقاد یقین کہلاتا ہے۔استدلال سے اگر شک زائل ہو جائے تو یقین قرار پکڑتا ہے۔جیسے اللہ تعالی کے وجود کا یقین،عیسی بن مریم علیہما السلام اور محمد بن عبد اللہ ﷺ کے انسان و بشر ہونے کا یقین،رسول پر وحی کے نزول کا یقین،قرآن کریم کے کتاب اللہ ہونے کا یقین۔وغیرہ۔ لسان العرب میں ہے:

> اَلْیَقِیْنُ، العِلْمُ وإِزَاحَةُ الشَّكِّ وَتَحقِیقُ الأَمْرِ۔ وَالیَقِینُ ضِدُّ الشَّكِّ۔وهُو فِی الأصلِ بِمَعْنَی الِاسْتِقْرَارِ۔ یُقالُ: یَقَنَ الْماءُ فِی الْحَوضِ إِذَا اسْتَقَرَّ ودَامَ۔ یقین،علم ہے۔شک کے ازالے کا نام ہے۔معاملے کو ثابت کرنا کو کہتے ہیں۔اس کی ضد شک ہے۔یقین دراصل قرار پکڑنے کے معنی میں ہے۔جیسے کہا جاتا ہے: پانی حوض میں ٹھہر گیا جب اسے ٹھہراؤ اور جماؤ مل جائے۔

ظن کے مقابلے میں یہ لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے:﴿ما لهم به من علم إلا اتباع الظن وما قتلوه يقينا﴾ (النساء:۱۵۷) ان کے پاس عیسی علیہ السلام کے بارے میں ظن کی پیروی کے سوا کوئی علم نہیں اور یہود نے انہیں یقیناً قتل نہیں کیا ہے۔ اسی طرح:﴿إن نظن إلا ظنا وما نحن بمستيقنين﴾ (الجاثیۃ:۳۲) ہم تو اسے معمولی گمان سمجھتے ہیں ورنہ ہمیں تو اس کا یقین نہیں۔

نوٹ: کسی شے کے بارے میں یہ کہنا: یہ یقینی ہے۔ اس کے تین معنی ہو سکتے ہیں:

۱۔ اس کا ثبوت یقینی ہے کیونکہ متواتر سے ثابت ہے یا اس پر اجماع ہے یا آپ ﷺ سے خود سنی ہے۔

۲۔ اس کا مفہوم یقیناً یہی ہے کیونکہ یہی محکم ہے یا مفسر۔ نص، ظاہر، مؤول، خفی، مجمل، مشکل یا متشابہ نہیں۔

۳۔ اس کا مضمون یقینی ہے۔ کیونکہ وہ بدیہی ہے یا اس پر برہان موجود ہے۔

اس لئے یہ جملہ: **دین یقینی ہونا چاہئے ظنی نہیں**۔ سمجھنا آسان ہو گیا۔ کیونکہ اس جگہ یقینی سے مراد اگر پہلا معنی ہے تو پھر درج ذیل باتوں پر غور کرنا چاہئے:

أ۔ قرآن مجید کی تعلیم وتبلیغ کا حق ایک آدمی کو نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان کی تعداد تواتر کی حد تک ثابت ہو۔ اس لئے کہ تواتر کے بغیر جو چیز بھی ہو گی وہ محض ظنی ہو گی اور ظنی چیز دین نہیں ہو سکتی۔

ب۔ کسی رسالے، کتاب، اخبار میں یا میڈیا پر ایک شخص کے مضمون اور انٹرویو کو دین سمجھ کر شائع نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ ایک آدمی کی خبر ظنی ہوتی ہے اور ظنی چیز دین نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو جن کا جھوٹ پر جمع ہو جانا محال ہو۔

ج۔ تبلیغ وتعلیم قرآن میں ایک آدمی کا ترجمہ بھی معتبر نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ایک کی بات ظنی ہے اور ظنی امر دین نہیں ہوتا۔

د۔ لغت میں بھی ایک آدمی کی شہادت قبول نہیں ہونی چاہئے جب کہ عموماً اہل لغت ایک آدمی کی شہادت لے لیتے ہیں کیونکہ یہ چیز ظنی ہو گی اور ظنی شے دین نہیں ہوتی۔

د۔ اگر احادیث ظنی ہیں اور دین نہیں تو جو احادیث یقینی ہیں انہیں ہی مان لیا جائے۔ مثلاً:

......وہ احادیث جو لفظاً متواتر ہیں کیونکہ متواتر میں عدد معین کی شرط نہیں۔ بلکہ جس عدد سے علم حاصل ہو وہی تواتر کے لئے کافی ہے۔ اور راویوں کی عالی صفات گنتی کے قائم مقام ہو جاتی ہیں بلکہ بہت سی صفات گنتی سے بھی بڑھ جاتی ہیں۔ امام ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (۱/۲۰۳) میں لکھا ہے: نکت علوم الحدیث اور شرح نخبۃ الفکر میں، میں نے اس شخص کا رد کیا ہے جو کہتا ہے: متواتر کی مثال صرف یہ حدیث ہے: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ بلکہ میں نے بیان کیا ہے کہ متواتر کی متعدد مثالیں ہیں۔ مثلاً: مَنْ بَنَى لِلّٰهِ مَسْجِدًا۔۔ موزوں پر مسح۔۔ رفع الیدین۔۔ الشفاعۃ۔۔ الحوض۔۔ آخرت میں اللہ تعالی کے دیدار۔۔ اور اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ جیسی احادیث۔

......وہ احادیث جو معناً متواتر ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں: طہارت، نماز، زکوۃ، روزہ، حج، نکاح اور غزوات کے احکام میں بہت سی احادیث معناً متواتر ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغۃ: ۱/۱۰۴)

......وہ احادیث جن پر اجماع امت ہے بکثرت ہیں۔

......جن کی صحت پر محدثین کا اجماع ہے جیسے صحیحین کی وہ احادیث جن پر بعد کے کسی محدث نے تنقید نہیں کی۔

ان چار اقسام حدیث کو یقینی ہونے کی وجہ سے دین سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ دین کے یقینی ہونے کا یہ مطلب ہے:

......اس کا مضمون، کلمات اور ان کا معنی، یقینی ہے تو اس مسئلہ میں قرآن وحدیث دونوں برابر ہیں۔ متکلمین دونوں کو یقینی کہتے ہیں اور منطقی قرآن وحدیث میں کسی کو بھی یقینی نہیں کہتے۔ بلکہ دونوں کو مقبولات کہتے ہیں اور ان کے مقبولات ظنی ہیں۔

......اسی طرح کسی امر کا دین ہونا اس امر کے منافی نہیں کہ وہ تاریخ بھی ہو۔ اس لئے کہ قرآن مجید دین ہے مگر اس میں تاریخ بھی ہے یہی حال احادیث کا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں دین پر عمل کرنے والوں اور منکروں کا مفصل حال درج ہے اسی طرح احادیث میں بھی رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کا اور ان کے بدخواہوں کا ذکر

ہے۔ جیسے قرآن میں احکام ہیں ویسے احادیث میں بھی احکام ہیں۔ (ملخص از: دوام حدیث مصنفہ شیخ الحدیث حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ)

☆☆☆☆☆

وَإِذَا الْحَبِيْبُ أَتَى بِذَنْبٍ وَاحِدٍ   جَاءَ تْ مَحَاسِنُهُ بِأَلْفِ شَفِيْعٍ

محبوب ایک غلطی کرتا ہے اور اس کی خوبیاں ہزار سفارشی لئے چلی آتی ہیں

☆☆☆☆☆

جی ہاں یہ موضوع روایات ہیں

الدین هو العقل، ومن لا دین له لا عقل له۔ دین عقل کا نام ہے جس کا دین نہیں اس کی عقل نہیں۔

امام نسائی اسے موضوع کہتے ہیں۔

الیقین الإیمان کله۔ یقین سارے کا سارا ایمان ہے۔ علامہ صنعانی نے اسے موضوع کہا ہے۔

لو لاک لما خلقت الافلاک اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو میں کبھی بھی آسمان پیدا نہ کرتا۔ موضوعات کبیر: ص: ۶۷

کنت نبیا و آدم بین الماء والطین۔ میں تو اس وقت بھی نبی تھا جب آدم پانی اور مٹی کے مرحلے میں تھے۔ یہ من گھڑت روایت ہے ائمہ فقہ حدیث نے اسے بے بنیاد کہا ہے۔

مؤذن کے أشهد أن محمدا رسول الله کہتے وقت جو شخص کہے: اشهد أن محمدا عبده ورسوله رضیت بالله ربا وبالإسلام دینا وبمحمد علیه السلام نبیا۔ اور شہادت کی انگلیوں کو چوم کر ان کا باطنی حصہ اپنی آنکھوں پر پھیر لے تو ایسا شخص میری شفاعت کا مستحق ہوگا۔ یہ روایت موضوع ہے۔ موضوعات کبیر از ملا علی القاری ص: ۳۷۔

باب ۲

علم حدیث کا موضوع

علم حدیث کا موضوع: ابن جماعہؒ کہتے ہیں: (تدریب ۱؍۴۱)

وَمَوضُوعُهُ السَّنَدُ وَالْمَتْنُ ۔ حدیث کا موضوع سند اور متن ہے۔

سند اور اس کے معنی

لغت میں لفظ سند کے دو معنی امام ابن جماعہؒ نے بیان کئے ہیں:

لفظ ''سند'' سے مراد پہاڑ کی اونچی اور بلند و بالا جگہ ہے۔ اس لئے مُسنِد بھی سند کو اٹھا کر بلندی یعنی قائل تک لے جاتا ہے۔ یا سند سے مراد: جس پر اعتماد کیا جائے یا اس کا سہارا لیا جائے۔ جیسے عرب کہتے ہیں: فلانٌ سندٌ۔ فلاں سَند ہے۔ یعنی معتمد ہے۔

اصطلاحاً:

سِلْسِلَةُ الرُّوَاةِ الْمُوْصِلَةِ إِلٰى قَائِلِهِ۔ راویوں کا تسلسل جو متن تک جا ملے۔

رواۃ حدیث کا ایسا سلسلہ جو مؤلف کی سند سے شروع ہو اور قائل رسول اکرم ﷺ یا صحابہ و تابعین تک جا پہنچے۔

یا

الإِخْبَارُ عَنْ طَرِيْقِ الْمَتْنِ ۔ متن کے راستے کی خبر دینا۔ سند کہلاتا ہے۔

کیونکہ سند ہی ہے جو متن تک پہنچنے کا ایک ذریعہ بنتی ہے۔ یا ان راویوں کا علم ہوتا ہے جنہوں نے متن کو بیان کیا ہے خواہ وہ ضعیف ہوں یا ثقہ۔ مگر اعتماد صرف ثقہ اور بیدار مغز پر کیا جاتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہؓ کی روایت میں لفظ مُتَسَانِدِيْنَ جو سند سے ہے اسی معنی میں مستعمل ہے:

خَرَجَ ثُمَامَةُ بْنُ أُثَالٍ وَفُلَانٌ مُتَسَانِدِيْنَ۔ ثمامہ اور فلاں دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے نکلے۔ (تدریب ۱؍۴۱)

لفظ إسناد: ۔ سند کے لئے یہ لفظ بھی محدثین استعمال کرتے ہیں۔ **لغت** میں: إِضَافَةُ الشَّيْءِ إِلَى الشَّيْءِ ایک

شے کی دوسری شے کی طرف نسبت۔ کو کہتے ہیں۔ جب کہ **اصطلاح** میں: اس لفظ کے دو معنی ہیں:

ا۔ یہ بمعنی سند ہے۔ ابن جماعہؒ کہتے ہیں:

اَلْمُحَدِّثُونَ یَسْتَعْمِلُونَ السَّنَدَ وَالإِسْنَادَ لِشَيءٍ وَاحِدٍ۔ محدثین کرام لفظ سند اور اسناد کو ایک ہی شئے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

مراد یہی ہے کہ وہ طریقہ جو متن تک پہنچا دے۔ اس معنی میں یہ تثنیہ میں آتا ہے اور جمع میں بھی۔ جیسے کہتے ہیں: هٰذَانِ إِسْنَادَانِ: یہ دو سندیں ہیں۔ یا هٰذِهِ أَسَانِيْدُ۔ یہ سندیں ہیں۔ اس لئے اسناد بمعنی رجال بھی ہے۔ وہ راوی کو متن تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ کیونکہ محدثین صحت حدیث یا ضعف حدیث میں انہی پر اعتماد کرتے ہیں۔

۲۔ اسناد: هُوَ رَفْعُ الْحَدِيثِ إِلَى قَائِلِهِ. دراصل حدیث کو اس کے قائل تک اٹھالے جانا ہے۔ جیسے: حَدَّثَنَا ابْنُ الْمُسَيَّبِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ۔ یہاں اسناد بمعنی مصدر ہے جس کی تثنیہ وجمع نہیں ہوتی۔

ملاحظہ: ایک اعتبار سے اس پر محدث اعتبار کرتا ہے۔ (لفظ رفع کا مرادف لفظ عزو ہے اور نسبۃ بھی)۔ یعنی منسوب کرنا۔

مُسْنَد: امام سیوطی نے مقدمہ تدریب (۴۲/۱) میں لکھا ہے: مسند (نون کی فتح سے) کے تین معنی ہیں:

ا۔ **مُسْنَد** : مصدر میمی ہے بمعنی اِسناد۔ یعنی اولاً ایسی احادیث جمع کی جائیں جو بغیر اسانید کے تھیں پھر ان کتب میں ان احادیث کا ذکر بمع اسانید کر دیا جائے۔ اس لئے ان کتب کا نام مسنَد رکھا گیا۔ اس موضوع پر امام قضاعی رحمہ اللہ کی مسند شہاب اور دیلمی کی مسند الفردوس ہے۔

۲۔ **مُسْنَد** : وہ حدیث جس کی سند شروع تا آخر بظاہر متصل ہو۔ جیسے محدثین کا یہ کہنا: جَاءَ الْحَدِيْثُ مُسْنَداً۔ یہ حدیث مسند آئی ہے۔ اسی معنی میں حضرات شیخین نے اپنی کتب صحیح کے نام **الجَامِعُ الْمُسْنَدُ** بھی رکھا ہے۔ ان دونوں کی احادیث مسندہ ہیں بعض محدثین کرام اس میں مرفوع، موقوف اور مقطوع بھی شامل کرتے ہیں۔ خطیبؒ بغدادی لکھتے ہیں:

هُوَ عِنْدَ أَهلِ الحَدِيثِ مَا اتَّصَلَ سَنَدُهُ إِلَى مُنْتَهَاهُ، وَأَكْثَرُ مَا يُسْتَعْمَلُ فِيمَا جَاءَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ دُونَ غَيرِهِ۔ محدثین کے ہاں وہ ایسی حدیث ہے جس کی سند آخر تک متصل ہو۔ زیادہ تر یہ لفظ اس حدیث کے لئے استعمال ہوتا ہے جو صرف آپ ﷺ کے بارے میں ہی ہو۔ نہ کہ کسی اور کے بارے میں۔

ابن عبدالبر فرماتے ہیں: مسند: اسے کہتے ہیں جس کی سند خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کی طرف اٹھائی گئی ہو۔ یہ متصل بھی ہوتی ہے اور کبھی منقطع بھی۔ (مقدمہ ابن الصلاح:۱۱۹)

مگر امام الحاکم فرماتے ہیں: مسند: وہی حدیث ہی ہوتی ہے جو متصل ہو اور رسول اللہ ﷺ تک مرفوع ہو۔ ان سب باتوں کو امام سیوطی نے اس شعر میں جمع کر دیا ہے:

الْمُسْنَدُ الْمَرْفُوعُ ذَا اتِّصَالِ وَقِيلَ أَوَّلٌ وَقِيلَ التَّالِيْ

مسند، مرفوع اور متصل کو کہتے ہیں۔ مگر کوئی کہتا ہے کہ: مرفوع، مسند ہوتی ہے اور کوئی متصل کو مسند کہتا ہے

امام ابن حجر عسقلانی (النکت: ۱/۵۰۶) میں فرماتے ہیں: امام حاکمؒ اور دوسرے محدثین نے مسند، متصل اور مرفوع میں فرق کیا ہے۔ اور ان میں ترادف واشتراک کے قائل نہیں۔ مگر حافظ ابن حجرؒ نے النخبة ص ۱۵۴ میں مسند کی تعریف یہ کی ہے:

مسند: مَرْفُوعُ صَحابِيٍ بسندٍ ظاهرِ الاتصالِ: بظاہر متصل سند کے ساتھ صحابی کا مرفوع کرنا۔ مثلاً:

قَالَ البُخَارِيُّ: حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى قَالَ حَدَّثَنِيْ أَبُو سَلَمَةَ، قَالَ حَدَّثَنِيْ بُسْرُ بْنُ سَعِيْدٍ قَالَ حَدَّثَنِيْ زَيْدُ بْنُ خَالِدٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَدْ غَزَا، وَمَنْ خَلَّفَ غَازِيًا فِيْ سبيل الله فقد غزا۔

یہی مسند، مرفوع اور متصل ہے جس کے تعلق کو یوں بیان کیا گیا ہے۔ البیقونی شعر نمبر ۸ میں لکھتے ہیں:

وَالْمُسْنَدُ الْمُتَّصِلُ الإِسْنَادُ مِنْ رَاوِيْهِ حَتَّى الْمُصْطَفَى وَلَمْ يَبِنْ

وہ حدیث جس کے راوی جناب مصطفیٰ ﷺ تک متصل الاسناد ہوں بغیر کسی اختلاف کے وہ مسند ہوتی ہے۔

۳. **مُسْنَد**: اسی طرح مسند اس کتاب کو بھی کہتے ہیں جس میں ہر صحابی کی مرویات (احادیث یا اقوال) علیحدہ

علیحدہ لکھی ہوں۔ یہ احادیث، اسماء صحابہ کی الفبائی ترتیب سے یا صحابہ کے حسب ونسب اور مقام ومرتبے کو ملحوظ رکھ کر جمع کی جاتی ہیں۔ جیسے: مسند حمیدی، مسند طیالسی، مسند احمد وغیرہ۔ امام ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: حمد بن احمد صیرفی نے مسند ابوداود کو محمد بن حسن النیلی سے سنا۔ چنانچہ مسند کا لفظ محدثین السنن پر بھی بولتے ہیں۔

مسنِد: یہ اِسناد سے اسم فاعل ہے۔ جس کا لغوی معنی گذر چکا ہے۔

اصطلاحاً: اس راوی کا لقب ہے جو حدیث کو بروایت بیان کردے۔ خواہ اس کے بارے میں اسے علم ہو یا ہو تو سوائے روایت کے اور کچھ نہ جانتا ہو۔ محدثین کے القاب میں یہ کم ترین درجہ ہے۔

سند کی ضرورت اور ابتداء: امام محمد بن سیرین (م ۱۱۰ھ) اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں:

لَمْ يَكُونُوا يَسْأَلُونَ عَنِ الإسْنادِ فَلَمَّا حَدَثَتِ الْفِتْنَةُ قَالُوا: سَمُّوا لَنَا رِجَالَكُمْ، فَيُنْظَرُ إِلَى أَهْلِ السُّنَّةِ فَيُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ ، وَيُنْظَرُ إِلَى أَهْلِ الْبِدْعَةِ فَلاَ يُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ۔ سند کے بارے میں علماء نہیں پوچھا کرتے تھے مگر جب شہادت ذوالنورین کا فتنہ رونما ہوا تو علماء نے ہر راوی سے یہ کہنا شروع کیا: ہمیں اپنے روایات کا مصدر بتاؤ۔ پھر یہ دیکھا جاتا کہ اگر وہ مصدر اہل سنت میں سے ہے تو اس کی حدیث لے لی جاتی اور اگر وہ اہل بدعت میں سے ہوتا تو اس کی حدیث بالکل نہ لی جاتی۔

اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مختار ثقفی کذاب کے زمانہ عروج میں بھی اسناد کے بارے میں سوالات اٹھے کیونکہ اس دور میں بکثرت ایسی روایات ظاہر ہوئیں جن میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں خوب جھوٹ پھیلایا گیا۔ (شرح علل الترمذی ۳۶)

نیز صوفیاء کا دعوی کہ ان کا شجرہ طریقت۔۔ سیدنا ابوبکر وعلی رضی اللہ عنہما کے واسطے سے آپ ﷺ تک پہنچتا ہے مگر یہ شجرہ بلاسند ہے۔ ملا علی القاریؒ (موضوعات) میں واضح کرتے ہیں کہ صوفیاء جو اپنی نسبت حسنؒ بصری عن علیؓ سے ملاتے ہیں۔ ائمہ حدیث کے نزدیک ان کی ملاقات ہی ثابت نہیں۔ تحصیل علم تو بڑی بات ہے۔ ہاں جو ظاہری صحبت کے محتاج نہ ہوں وہ پھر نسخہ اویسیہ جیسا کارگر نسخہ استعمال کرتے ہیں جو شریعت کے ساتھ سوائے مذاق کے اور کچھ نہیں۔ (شریعت وطریقت: ۱۸۳ از کیلانی)

سند کی اہمیت:۔ ہم نے ابھی لغوی اعتبار سے لفظ سند کے کچھ فائدے لکھے ہیں جو سلف صالحین سے مستفاد

ہیں۔امام مسلمؒ نے صحیح کے مقدمہ میں لکھا ہے: باب الإِسْنادِمِنَ الدِّيْنِ۔اورفرماتے ہیں:

حَدَّثَنِيْ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰه بْنِ قُهْزَادَ مِنْ اَهْلِ مَرْدٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ انَ بْنَ عُثْمَانَ يَقُولُ: سَمِعْتُ عبدَاللّٰهِ بْنَ الْمُبَارَكِ يَقُولُ: اَلإِسْنَادُ مِنَ الدِّيْنِ وَلَوْ لَا الإِ سْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَاشَاءَ۔

امام عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں: اسناد، دین میں سے ہے۔اگر اسناد نہ ہوتی تو کوئی بھی جو چاہتا وہی کچھ کہہ دیتا۔

اسی طرح ان کا یہ قول بھی :

وقَالَ مُحمدُ بْنُ عَبدِاللّٰهِ:حَدَّثَنِي الْعَبَّاسُ بْنُ اَبِي رَزْمَةَ قَالَ:سَمِعْتُ عَبْدَاللّٰهِ:يَقُولُ:بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْقَوَائِمِ، يَعْنِي: الإِسْنَادَ۔ عباس بن ابی رزمہ کہتے ہیں میں نے عبداللہ بن المبارک سے یہ کہتے ہوئے سنا: ہمارے اورلوگوں کے درمیان فارق پائے (ستون) ہیں۔مراد سندیں ہیں۔

امام نوویؒ اس قول کی وضاحت میں فرماتے ہیں:۔

اس قول کا مطلب یہ ہے اگر حدیث صحیح اسناد کے ساتھ کرنا ضروری ہے ہم اسے ہی قبول کریں گے ورنہ چھوڑ دیں گے۔یعنی حدیث بھی بغیر سند کے کھڑی نہیں ہوسکتی جیسے ایک حیوان بغیر اپنے پاؤں یا پایا ٹانگوں کے کھڑا نہیں ہوسکتا۔امام اوزاعیؒ فرمایا کرتے: اسناد کے نہ ہونے سے ہی علم ختم ہوتا ہے اور اسے گھن لگتا ہے۔ امام سفیانؒ بن عیینہ فرماتے ہیں:

امام زہریؒ نے ایک بار حدیث پیش کرنا چاہی تو میں نے انہیں کہا: هَاتِهِ بِلا إسنادٍ۔بغیر سند کے اسے بیان کیجئے۔قال: أترْقَى السَّطحَ بِلَا سُلَّمٍ۔تو وہ کہنے لگے: کیا آپ چھت پر بغیر سیڑھیوں کے چڑھنا چاہتے ہیں۔

بہرحال سند، کسی بھی متن کو قبول کرنے کے لئے فیصلہ کن ہوتی ہے۔کہ کیا یہ حدیث قبول کی جائے یا رد کردی جائے۔

نوٹ: محدثین جب کہتے ہیں: فلاں نے تین سو یا پانچ لاکھ احادیث لکھی ہیں تو اس سے ان کی مراد اس حدیث یا آثار وفتاوی تابعین کی متعدد ومکرر اسانید ہیں۔امام یحییٰؒ بن معین کہا کرتے: لَو لَمْ نَكْتُبِ الْحَدِيْثَ خَمْسِيْنَ مَرَّةً مَا عَرَفْنَاهُ۔اگر ہم حدیث کو پچاس مرتبہ نہ لکھیں ہم اسے سمجھ ہی نہ پائیں۔ان کی مراد اسانید وآثار وفتاوی ہیں۔(سیر اعلام النبلاء ۸۴/۱۱) عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں: میں نے ابراہیم بن سعید الجوہری سے سیدنا ابوبکرؓ کی احادیث کے

بارے میں پوچھا تو یحیی سے انہوں نے کہا: مجھے مسند ابوبکر کا تیئیسواں جزء لادو۔ میں نے عرض کی: سیدنا ابوبکرؓ سے تو صرف پچاس احادیث ہی ثابت ہیں۔ تیئیس جزء کہاں سے آ گئے؟ کہنے لگے: جس حدیث کی میرے پاس سو اسانید نہ ہوں تو میں پھر اس میں یتیم ہوں۔

احمد بن سلمہ کہتے ہیں امام مسلم رحمہ اللہ کی تالیف صحیح میں پندرہ سال میں ان کے ساتھ رہا مگر کتاب میں صرف بارہ ہزار احادیث تھیں۔ جس سے ان کی مراد مکررات تھیں۔ یعنی اگر انہوں نے حدیث یوں بیان کی: حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ، وَأَخْبَرَنَا ابْنُ رُمْحٍ۔ تو یہ دو احادیث شمار کیں۔ جن کے تمام الفاظ میں اتفاق مگر ایک کلمہ میں اختلاف تھا۔ اس لئے ذخائر حدیث دیکھیں تو اسانید زیادہ ہیں مگر متون بہت کم۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

أُصولُ الأَحْكامِ نَيِّفٌ وَّخمسُ مِائَةِ حَدِيثٍ، كُلُّهَا عِنْدَ مَالِكٍ إِلَّا ثَلاثِيْنَ حَدِيثًا، وَكُلُّهَا عِنْدَ ابْنِ عُيَيْنَةَ إِلَّا سِتَّةُ أَحادِيْثَ۔ اصول احکام کی پانچ سو سے کچھ زائد احادیث ہیں۔ جو سوائے تیس کے سبھی امام مالکؒ کے پاس تھیں اور سوائے چھ کے باقی امام ابنؒ عیینہ کے پاس۔

اسناد عالی واسناد نازل: اسناد کی یہ دو قسمیں ہیں۔

إسناد عالی: مصدر عُلُوّ سے یہ اسم فاعل ہے۔ اور سِفْلٌ کی ضد ہے۔

اصطلاحاً: اسے کہتے ہیں جس کی سند کے راوی دوسری حدیث کی سند کے مقابلے میں کم ہوں۔ اس کو پہچاننے کا ایک طریقہ راوی اور شیخ کے مابین کا زمانہ ہے جو شیخ کی وفات کے بعد علو سند کی پہچان کراتا ہے۔

طلب علو سند کی دلیل: سیدنا موسی علیہ السلام کا سفر مجمع البحرین ہے۔ اسی طرح موسی علیہ السلام کا بنو اسرائیل سے یہ فرمانا: ﴿قال إنه يقول﴾، ہدہد کا سلیمان علیہ السلام کو ملکہ سبا کی خبر دینا اور یہ کہنا: ﴿أحطت بمالم تحط به﴾۔ اور اس پر سلیمان علیہ السلام کا یہ فرمانا: ﴿سننظر..﴾ تحقیق خبر کے بعد یہ فیصلہ کرنا بھی ہے کہ راوی سچا ہے یا جھوٹا۔ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں ضمام بن ثعلبہ کی آمد بھی طلب علو سند کی دلیل ہے تاکہ آپ ﷺ کے قاصد کی دی ہوئی خبر کی خود بلاواسطہ سماع کے ساتھ تصدیق کر لے۔ صحابہ وتابعین، نقاد ائمہ اور کبار محدثین نے اسناد عالی کے لئے دور دراز کے علاقوں کی رحلہ کی۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں: طَلَبُ الإِسْنَادِ الْعُلُوِّ مِنَ السُّنَّةِ۔ اسناد عالی کی طلب سنت رسول ہے۔ بقول ابن

جو صاء:

إسنادُ خَمسينَ سَنَةٍ مِنْ مَوتِ الشَّيخِ، إِسْنادُ عُلُوٍّ۔ شیخ کی موت کے پچاس سال کے بعد تک طالب علم اگر ہوش وحواس کے ساتھ زندہ رہے تو یہ اسناد عالی ہے۔

اسناد عالی میں صحیح بخاری کی بائیس ثلاثیات بھی ہیں۔ جن میں امام بخاریؒ اور رسول اکرم ﷺ کے مابین صرف تین اشخاص ہیں۔ ابو طاہر السلفیؒ نے گیارہ سال کی عمر میں شیخ ابن البطر سے احادیث سنیں جب کہ ان کی عمر ایک سو سے متجاوز تھی۔ ان کی وفات کے بعد السلفی خود سو سال سے زائد عرصہ حیات رہے اور یوں ان کی اسناد اپنے دور کی عالی سند تھی۔ امام ذہبیؒ بھی اپنی ایک اسناد عالی پر فخر یہ لکھتے ہیں: مجھے امام اللیثؒ بن سعد کی ایسی سند عالی کا شرف حاصل ہے کہ آج ۷۲۶ھ کو آسمان کے نیچے کوئی ایسا نہیں کہ اس کے اور اللیث کے درمیان چھ راوی ہوں۔ یہ عالی سند پانچ طرح کی ہے۔ پہلی علو مطلق میں اور باقی چار علو نسبی میں پائی جاتی ہیں:

علو مطلق: ایسی سند جو ہر طرح سے صحیح ہو اور جس سے رسول اللہ ﷺ کا قرب حاصل ہو۔ جیسے صحیح بخاری میں وارد ۲۲ ثلاثیات ہیں کہ امام بخاریؒ جو ۲۵۶ھ میں فوت ہوئے اور آپ ﷺ ۱۱ھ میں۔ دونوں کے درمیان ۲۴۵ سال کا عرصہ ہے مگر صرف امام بخاریؒ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تین نسلیں ہیں۔ یہ بہت ہی عالی شان قرب ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ کو حاصل ہے۔ ایسی سند اسانید عالیہ میں زیادہ اہم ہے۔

علو نسبی: اس سے مراد چار قسم کے قرب ہیں۔

۱۔ ائمہ حدیث امام اعمش، امام مالک وغیرہ میں سے کسی امام حدیث کا قرب جس سند میں حاصل ہو جائے۔ مثلاً:

قَالَ الْبُخَارِيُّ ثَنَا إِسْمَاعِيلُ ، ثَنِيْ مَالِكٌ، عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ مَرْفُوعاً: مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ۔ اس صحیح اور ستھری سند میں ایک ایک راوی اپنے وقت کا بہت بڑا امام ومحدث اور فقیہ ہے۔ اور ہر ایک کا قرب بہت قلیل واسطوں سے امام بخاری رحمہ اللہ کو حاصل ہے۔

۲۔ ایسا علو سند جو کسی معتمد کتاب حدیث کی روایت کے قریب کر دے۔ جیسے صحیحین کا قرب۔ یہ متأخر

علماء حدیث کا مہتم بالشان مسئلہ ہے جسے انہوں نے ہی باقی رکھا ہے۔۔ یہ چار انواع کا ہے۔

أ۔موافقت: کسی مصنف کی سند کے بغیر اس کے شیخ تک کم تر واسطوں سے پہنچنا اور پھر مصنف کی روایت میں مل جانا۔مثلاً: امام بخاری قتیبہ عن مالک سے ایک حدیث روایت کریں۔ بعدازاں کسی راوی کو ایک ایسی سند ملی جو قتیبہ عن مالک والی تھی۔یوں امام بخاری رحمہ اللہ کے شیخ تک بغیر امام بخاریؒ کے واسطہ کے جو سند اسے ملی اس سے علو سند کے علاوہ موافقت بخاریؒ بھی اسے نصیب ہوگئی۔

ب۔بدل: مثلاً یہی حدیث امام بخاری عن قتیبۃ عن مالک کی بجائے کسی اور شیخ سے ملی جو امام مالک کے شاگرد تھے یعنی قعنبی عن مالک۔تو قعنبی، قتیبہ کے بدل ہو گئے۔

ج۔مساواۃ: کسی راوی کی سند حدیث ابتداء سے آخر تک مصنف کی اسی سند حدیث کے راویوں کی تعداد کے برابر ہو۔مساواۃ کہلاتا ہے۔مثلاً: امام نسائی ایک روایت یہ سند بیان کرتے ہیں جس میں ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان گیارہ راوی ہیں۔کسی اور راوی کو بعینہ یہی حدیث ایک دوسری سند سے رسول اللہ ﷺ تک ملی جس میں گیارہ راوی ہیں۔تو یہ روایت امام نسائی کی روایت میں تعداد رواۃ کے برابر ہوگئی۔

د۔مصافحہ: کسی راوی کی سند رسول اللہ ﷺ تک ہو اور اس کے مصنف شاگرد کی سند بھی آپ ﷺ تک ہو۔اور دونوں کے راویوں کی تعداد برابر ہو اسے مصافحہ کہتے ہیں۔امام ابن حجر فرماتے ہیں تو ایسی صورت میں ہم امام نسائی رحمہ اللہ کے برابر ہیں تو گویا ہم نے ان سے مصافحہ کر لیا۔

۳۔راوی کی وفات پہلے ہونے سے علو: مثلاً: ابن الصلاح کہتے ہیں: ایک شیخ سے میں روایت کرتا ہوں جو مجھے بیہقی سے اور وہ الحاکم سے روایت کرواتے ہیں۔دوسری روایت وہی شیخ مجھے ابوبکر عبداللہ بن خلف سے اور وہ حاکم سے روایت کرواتے ہیں گو دونوں سندیں عدد میں برابر ہیں۔امام بیہقی کی وفات سن ۴۵۸ھ پہلے ہوئی اور خلف کی سن ۴۸۷ھ میں۔یہاں علو کا سبب امام بیہقی کی پہلے وفات ہے کیونکہ رواۃ میں اس کا وجود نادر ہے بہ نسبت متأخر کے جسے بہت سے ساتھی آخر حیات تک ملے ہوں گے۔

۴۔ **سماع مقدم کی وجہ سے علو:** جیسے دو شخص ایک شیخ سے حدیث سنیں۔ ایک نے ساٹھ سال پہلے سنا اور دوسرے نے چالیس سال پہلے۔ سند میں عدد میں دونوں مساوی ہیں مگر پہلے کی سند اس لئے اعلیٰ ہوگی کہ اس کا سماع مقدم ہے۔

خلاصہ: ان اسانید عالیہ کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ وہ سند جو صاف ستھری، ضعف سے پاک اور خود صحیح ہو۔ یہ علو اسناد کی ایک اعلیٰ ترین قسم ہے۔

۲۔ وہ سند جو کسی امام حدیث کے قریب ترین ہو اور صحیح ہو۔

۳۔ وہ سند جو کسی مشہور کتاب تک ہو۔ جیسے صحیح بخاری تک کی عالی سند۔

۴۔ وہ سند جس میں شیخ کی وفات دوسرے شیخ کی نسبت پہلے ہوئی۔

۵۔ وہ سند جس میں ایک شیخ کا سماع دوسرے سے پہلے نصیب ہوا۔ وغیرہ۔

اِسنادِ نازل: اسے اسناد سافل بھی کہتے ہیں۔ جو سفل سے ہے اور علو کی ضد ہے۔

اصطلاحاً: وہ سند جس میں راویوں کی تعداد دوسری حدیث کی سند کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوں۔ یعنی جو عالی کے برعکس ہو۔ جیسے ابن ابی الدنیا بہت لوگوں سے روایت کرتے ہیں جو سب غیر معروف ہیں۔ وجہ یہ بھی تھی وہ رحلہ کم کرتے۔ پھر ادھر ادھر سے انہیں روایت ملتی اور اسے نازل سند کے ساتھ لکھ لیتے خواہ وہ کیسی ہی بنتی ہو۔ امام ابن حجرؒ اس کی وجہ یہ فرماتے ہیں:

محدثین میں علو سند ایک پسندیدہ شے تھی وجہ یہ تھی کہ وہ صحت اور قلت خطا کے قریب ترین تھی۔ کیونکہ سند کے ہر راوی سے خطاً ہو سکتی ہے اس لئے جتنے بھی درمیان میں رواۃ زیادہ ہوں اتنی ہی لمبی سند ہوگی جس میں خطا کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور جتنے بھی کم ہوں۔۔۔۔ (شرح النخبۃ: ۳۱)۔

اقسام: اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ نازل مطلق اور نازل نسبی۔ جو علو کے برعکس ہیں۔

طبقات سند: لغت میں وہ لوگ جن کی ایک صفت میں اشتراک ہو۔ کو طبقہ کہتے ہیں۔ اس کی جمع طبقات ہے۔

اصطلاحاً: وہ معاصر لوگ جو کسی صفت میں ایک دوسرے کے قریب ہوں جیسے: غزوہ بدر میں مشترک ہونا۔ یا فتح مکہ سے قبل اسلام لانا یا صحبت، شہر، عمر یا شیخ میں مشترک ہونا۔ یا وہ لوگ جو عمر یا استاد میں قریب ہوں۔ یا صرف

اسناد میں قریب ہوں۔یعنی ایک کے شیوخ دوسرے کے بھی ہوں یا راوی ایک ایسے طبقہ سے ہو جن سے وہ ایک آدھ صورت میں ملتا جلتا ہو۔ایسے افراد کا علم ہو جائے تو اشتباہ سے بچا جا سکتا ہے۔محدثین نے چار اہم طبقوں پر سند کی بنیاد رکھی ہے۔وہ طبقات سند یہ ہیں:

۱۔**طبقہ صحابہ:** یہ سند کا بالکل ابتدائی طبقہ ہے جو رسول اکرم ﷺ سے روایت کرتا ہے۔چونکہ سند مرفوع میں صحابی رسول کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ ان کی روایت نا قابل تردید اور عدالت سے پر ہوتی ہے: اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُم عَدُولٌ ۔تمام صحابہ عادل ہیں۔ورنہ صحابی کے بغیر روایت شدہ حدیث مرسل کہلاتی ہے جو صحیح نہیں ہوتی۔

۲۔**طبقہ تابعین:** وہ شخص جو صحابی رسول کو حالت ایمان میں ملا ہو خواہ عرفی صحبت نہ ہی ہو اور اسی حالت میں ہی وہ فوت ہوا ہو۔ائمہ حدیث نے آیت میں لفظ اتَّبَعُوهُمْ کا مصداق اسی نسل کے مسلمانوں کو سمجھا ہے۔ان میں مخضرم تابعین بھی شامل ہیں جو زمانہ رسالت میں پیدا ہوئے مسلمان بھی تھے مگر رسول اکرم ﷺ کی زیارت نہ کر سکے۔سبط ابن العجمی نے ایسے چالیس مخضرم تابعین کے نام گنوائے ہیں مگر سات فقہاء مدینہ سب پر ترجیح پا گئے۔سند حدیث میں اس طبقہ کے ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ تابعی حدیث کو بذریعہ صحابی روایت کریں۔بصورت دیگر وہ حدیث منقطع ہوگی نہ کہ متصل۔

۳۔**طبقہ اتباع التابعین:** تبع تابعی، تابعی کے بعد کی نسل کو کہتے ہیں۔اس کے لئے بھی وہی شرط ہے کہ بحیثیت مومن تابعی سے اس کی ملاقات ہوئی ہو اور ایمان پر ہی اس کا خاتمہ ہوا ہو۔روایت حدیث کے لئے تبع تابعی کا ثقہ وضابط ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اس کی روایت قبول کی جائے۔جیسے امام مالک رحمہ اللہ ہیں۔تبع تابعی کی معرفت کا ایک یہ فائدہ ہے کہ مرسل اور منقطع کے درمیان تمیز کر لی جاتی ہے۔

۴۔وہ **طبقہ علماء** جنہوں نے تبع تابعین سے براہ راست علم حدیث حاصل کر کے اسے روایت کیا ہو۔یا اپنی کتب میں اس روایت کو انہوں نے لکھا ہو۔

اصول وقواعد:

☆......طبقہ کو بعض محدثین قرن بھی کہہ دیتے ہیں۔مثلاً الحسن بن عرفہ فرماتے ہیں: كَتَبَ عَنِّي خَمْسَةُ قُرُونٍ۔ مجھ سے پانچ قرون یعنی طبقات نے لکھا۔ پہلا طبقہ: ابن ابی حاتم کا۔ دوسرا طبقہ: ابن ابی الدنیا کا۔ تیسرا طبقہ: ابن خزیمہ کا۔ چوتھا طبقہ: محاملی کا اور پانچواں طبقہ الصفار کا ہے۔

☆...... ہر دو طبقات کی مجاذبت بھی ہونی چاہئے۔یعنی دونوں ایک دوسرے کے شاگرد واستاذ ہوں ورنہ مبالغہ آرائی میں طبقات کی تقسیم ہوگی تو غلط ہوگی جو بالآخر ہر طبقہ میں تین یا اس سے زائد طبقات جنم دیں گے۔راوی کے حال، مقام ومرتبہ کے تعین کے بعد اس کا شمار مخصوص طبقہ میں ہوگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ تابعی کو طبقہ صحابہ میں یا صحابی کو طبقہ تابعین میں رکھا جائے۔

☆......جب شیوخ مختلف ہوں تو طبقات طلبہ بھی مختلف ہوجاتے ہیں۔اور سند بھی عالی یا نازل بن جاتی ہے۔

☆......طبقات ابن سعد پہلی موضوعی کتاب ہے جس کے مؤلف محمد بن سعد ہیں جو کاتب واقدی بھی کہلاتے ہیں۔ یہ کتاب دس جلدوں سے زائد ہے۔ پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑے صاحب علم انسان تھے۔علماء کہتے ہیں کہ ابن سعد نے اپنی طبقات میں واقدی سے بہت کم لکھا ہے کیونکہ وہ ضعیف تھے اور ابن سعد ان کی روایات کا انتخاب کر کے لکھا کرتے۔

الأنساب:

درجہ بالا سند میں آپ نے راوی کی نسبت پر بھی غور کیا ہوگا جو شہر، یا قبیلہ کے طرف عموماً ہوتی ہے۔علماء حدیث نے رواۃ کے حالات زندگی کو نسب نامے سمیت لکھ دیا ہے۔ روایت حدیث میں یہ بڑی وقیع معلومات ہیں۔قبائل وشعوب اور خاندان کی فروع تک کی تقسیم ان انساب میں موجود ہیں کیونکہ مستقبل کی طرف جتنا ہمارا رخ ہوگا اتنا ہی ماضی پارینہ ہوجاتا ہے۔اور ماضی حافظے سے محو ہوسکتا ہے۔اس لئے جد امجد کے ساتھ مختلف خاندانوں اور قبائل کا بالترتیب اصطلاحات سمیت ذکر کرنا علماء انساب کا ایک اہم کام ہے۔ جیسے: فصیلہ، فخذ بطن، عمارۃ، قبیلہ اور شعب۔اس لئے قرشی، قیسی، اور ہمدانی تو کوئی بھی ہوسکتا ہے مگر بالعکس نہیں۔مثلاً آپ ﷺ بنو مطلب سے تھے۔ یہ آپ کا **فَصِيلَة** ہوا۔جس میں آپ ﷺ کے چچا اور چچازاد شامل ہیں۔پھر آپ کا **فَخِذ** بنو ہاشم ہیں

اور **بَطْن** بنو عبد مناف۔ قریش آپ کی **عِمَارة** ہیں اور بنو کنانہ آپ کا **قَبِیْلَه**، اور مضر آپ کی **شَعْب** یعنی قوم ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

اللہ تعالیٰ نے بنو کنانہ کا انتخاب اولاد اسماعیل سے کیا اور قریش کا کنانہ سے، اور ہاشم کا قریش سے، اور مجھے بنو ہاشم سے منتخب کیا۔ (مسلم)

آپ ﷺ کی والدہ محترمہ آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب ہیں۔ کلاب تک کی نسبت میں ان کے خاوند عبداللہ بھی آملتے ہیں۔

راوی حدیث کا تعارف اور مختلف علوم

اوپر ہم نے طبقات اور انساب کے بارے میں مختصر معلومات دی ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ راویان حدیث کا تعارف نیز رواۃ کے علوم کیسے ہمہ جہتی ہیں جو دوسرے علوم میں شاید نہیں بلکہ علم حدیث میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ذیلی مختصر مصطلاحات اور ان پر لکھی گئی کتب سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ علماء حدیث نے راوی حدیث کا ہر پہلو سے جائزہ لیا اور کوئی گوشہ شاید ہی ایسا ہو جسے انہوں نے بعد والوں کے لئے بطور سوال چھوڑا ہو۔

۱۔ **معرفة الصحابة**۔ بے شمار کتب ہیں جن میں صحابہ کرام کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کے طبقات و مراتب پر یا ان کی عدالت پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

۲۔ **معرفة التابعين**: تابعین کرام کا تعارف۔ اس موضوع پر بھی بہت سی تصنیفات ہیں۔ طبقات و مراتب کے تعین اور کبار و متوسط صغار تابعین کی بحث بالخصوص فقہاء سبعہ کا علمی اور روایت حدیث میں ان کا مقام اس علم کے خاصے ہیں۔

۳۔ **معرفة المبهمات**: ایسے لوگ جن کا ذکر حدیث میں یا روایت میں مبہم آیا مثلاً: رجل یا امرأة کے الفاظ۔ ایسے افراد کا تعین اور ان کے ناموں کا سراغ ان کا متن یا روایت میں مقام متعین کیا گیا۔ اس موضوع پر بھی بے شمار مطبوع کتب ہیں۔

۴۔ **معرفة الوحدان**: ایسی روایت جس میں منفرد راوی ہوں اور کوئی دوسرا اس روایت میں شریک نہ ہو۔ ان کی ثقاہت وضعف کا تعین۔ نیز خبر واحد میں اس حدیث کا درجہ کیا ہے؟ اس پر بھی علماء کی کتب موجود ہیں۔

۵۔ معرفة من ذكر بأسماء أو صفات مختلفة۔ وہ راوی جسے مختلف ناموں اور صفات سے بیان کیا گیا۔

۶۔ معرفة المفردات من الأسماء والكنى والألقاب۔ ایسے راوی جو اپنی نام، کنیت یا لقب میں منفرد ہیں۔

۷۔ معرفة المشهورين بكناهم: ایسے راوی جو اپنی کنیت میں زیادہ مشہور ہوئے۔

۸۔ معرفة الألقاب۔ راوی جن کے مخصوص لقب تھے۔ ان کا تعارف۔

۹۔ معرفة المنسوبين إلى غير آبائهم۔ وہ راوی جو اپنے والد کی بجائے کسی اور کی طرف منسوب تھے۔

۱۰۔ معرفة النسب التي على غير ظاهرها۔ غیر حقیقی نسبتوں والے راویوں کا تعارف۔

۱۱۔ معرفة تواريخ الرواة۔ راویوں کی تاریخی معلومات

۱۲۔ معرفة من خلط من المحدثين۔ محدثین میں جو اختلاط کا شکار ہوئے ان کی معلومات

۱۳۔ معرفة طبقات العلماء والرواة۔ علماء اور راویوں کے طبقات کا تعارف۔

۱۴۔ معرفة الموالي من الرواة والعلماء۔ موالی راویوں اور علماء کا تعارف۔

۱۵۔ معرفة الثقات والضعفاء من الرواة۔ ثقہ اور ضعیف راویوں کا تعارف

۱۶۔ معرفة أوطان الرواة وبلدانهم۔ راویوں کے شہروں اور وطن کا تعارف۔

۱۷۔ معرفة المخضرمين۔ مخضرم راویوں کا تعارف

۱۸۔ معرفة الثقات الذين ضعفوا۔ ان ثقہ راویوں کا تعارف جو ضعیف قرار دیے گئے۔

۱۹۔ معرفة أسماء رجال الكتب الستة۔ صحاح ستہ کے راویوں کا تعارف

۲۰۔ معرفة رجال الصحيحين۔ صحیحین کے راویوں کا تعارف

متن اور اس کے معنی

لغت میں: لسان العرب میں (۳۹۸/۱۳) ہے:

اَلْمَتْنُ: مَا ارْتَفَعَ مِنَ الْأَرْضِ وَ اسْتَوَی۔ وَقِيْلَ: مَا ارْتَفَعَ وَ صَلُبَ۔ جو چیز زمین سے اٹھی ہوئی اور برابر ہو اسے متن کہا جاتا ہے۔ یا جو اٹھی ہوئی اور سخت زمین ہو وہ متن کہلاتی ہے۔ **متن:** کمر کو بھی کہتے ہیں جو جسم کا مضبوط ترین حصہ ہوتا ہے۔ متن غایت کو بھی کہتے ہیں عرب کہا کرتے ہیں: مَتَنْتُ الْكَبْشَ: میں نے مینڈھے کو اس کی کھال سے

علیحدہ کیا۔ گویا کہ مسند متن کو اس کی سند سے باہر نکال لاتا ہے۔ یا تَمْتِیْنُ الْقَوْسِ سے ہے۔ جس کی رسی کو انتہائی مضبوطی کے ساتھ کمان سے باندھا جاتا ہے اسی طرح مسند بھی متن کو سند کے ساتھ مضبوطی سے باندھتا ہے۔

اصطلاح میں: متن کی تعریف ابن جماعہؒ یہ کرتے ہیں:

اَلْمَتْنُ :هُوَ مَا انْتَهَى إِلَيْهِ غَايَةُ السَّنَدِ مِنَ الْكَلَامِ ۔ وہ کلام جہاں سند آ کر ختم ہو جائے اسے متن کہتے ہیں۔

چونکہ مُسْنِد، حدیث کو بذریعہ سند مضبوط وسخت یا ظاہر کر دیتا ہے اور اسے سند کے ذریعے ہی قائل تک اٹھا لے جاتا ہے۔ اس لئے نص حدیث یا الفاظ حدیث کو متن کہتے ہیں جس سے بے شمار معانی ظاہر ہوتے ہیں۔

سند و متن کی مثال: صحیح بخاری کی کتاب العلم کی حدیث نمبر ۱۰۹ میں ہے:

حَدَّثَنا مَكِّيُّ بْنُ إبراهيمَ قال:حدثنا يزيدُ بنُ أبي عُبَيدٍ عَن سَلِمَةَ قَالَ:سَمِعتُ النبيَّ ﷺ يقولُ: مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ جو مجھ پر وہ بات گھڑ دیتا ہے جو میں نے نہیں کہی۔ تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ بنالے۔ (باب إثم من كذب على النبي ﷺ)

امام بخاریؒ کا یہ قول:

حَدَّثَنا مَكِّيُّ بْنُ إبراهيمَ قال:حدثنا يزيدُ بنُ أبي عُبَيدٍ عَن سَلِمَةَ قَال:سَمِعتُ النبيَّ ﷺ يقولُ:

اسی کو الإخبارُ عَنْ طَرِيقِ الْمَتْنِ۔ یعنی متن کے راستے کی خبر دینا۔ کہتے ہیں۔

متن کی تعریف ہم نے یہ پڑھی تھی کہ مَا انْتَهَى إِلَيْهِ السَّنَدُ مِنَ الْكَلَامِ ۔ وہ کلام جس کا آغاز سند کے اختتام پر ہو۔ چنانچہ اس روایت میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد متن کہلاتا ہے:

مَنْ يَقُلْ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ

نوٹ: مذکورہ حدیث میں آپ نے بغور دیکھا کہ امام بخاریؒ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان صرف تین راوی ہیں۔ امام بخاریؒ کی ایسی احادیث کو **ثلاثیات بخاری** کہا جاتا ہے۔ صحیح بخاری میں عام ترتیب کے اعتبار سے یہ حدیث نمبر ۱۰۹ ہے۔ مگر ثلاثیات بخاری کے اعتبار سے یہ حدیث سب سے پہلی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فتح الباری (۱/۲۴۳) میں لکھتے ہیں:

وَهٰذَا الْحَدِيثُ أَوَّلُ ثُلَاثِيٍّ وَقَعَ فِي الْبُخَارِيِّ ـ وَلَيْسَ فِيهِ أَعْلٰى مِنَ الثُّلَاثِيَّاتِ، وَ قَدْ أَفْرَدْتُ فَبَلَغَتْ أَكْثَرُ مِنْ عِشْرِينَ حَدِيثاً۔ صحیح بخاری میں یہ پہلی ثلاثی روایت ہے۔ ثلاثیات میں اس سے بہتر اور اعلی کوئی روایت نہیں۔ میں نے ایسی احادیث کو ڈھونڈا ہے جن کی تعداد بیس سے زائد ہے۔

☆......اس عربی عبارت میں۔۔ أعْلٰی سے مراد۔ یہ بھی ہے کہ سند میں ثقہ راوی خواہ کم ہوں وہ اس سند سے کہیں اعلی ہوگی جس کے رجال سند میں زیادہ اور عادل ہوں بلکہ وہ نازل ہوگی۔ امام بیقونیؒ فرماتے ہیں۔

وَ كُلُّ ما قَلَّتْ رِجالُهُ علاَ   وضِدُّهُ ذَاكَ الَّذِىْ قَدْ نَزَلَا

ہر وہ حدیث جس کے راوی کم سے کم ہوں وہ سند عالی ہوگی ورنہ سند نازل۔

ملاحظہ: امام ابن حجرؒ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ طالب علم کو سند سے متعلق تمام معلومات ہونی چاہئیں۔ بالخصوص سند عالی اور سند نازل کی۔ لَيْسَ فِيهِ أَعْلٰى مِنَ الثُّلَاثِيَّاتِ کا مفہوم بھی یہ ہے۔

اس سند کے طبقات:

پہلے طبقہ میں۔ سلمۃ بن عمرو بن الأکوع (م:۷۴ھ) صحابی رسول ہیں۔ **دوسرے میں** یزید بن ابی عبیدہ ابو خالد اسلمی، (م:۱۴۶ھ) تابعی ہیں سلمہ بن الأکوع سے روایت کرتے ہیں اور ان کے مولیٰ (آزاد کردہ غلام) ہیں۔

تیسرے طبقہ میں: مکی بن ابراھیم ابو السکن بلخی (م:۲۱۴ھ) ہیں جو اتباع تابعین میں سے ہیں۔ اور یزید بن ابی عبیدہ سے روایت کرتے ہیں۔ ابو الحجاج المزی (تهذيب الكمال ۲۸/۴۸۰) میں لکھتے ہیں۔ انہوں نے سترہ تابعین سے حدیث سنی جن میں یزید بن ابی عبیدہ بھی ہیں جن کا ذکر اس روایت میں آیا ہے۔ مکی، امام بخاری کے بڑے شیوخ میں سے ہیں۔ مکی نام ہے نہ کہ نسبت۔ **چوتھے طبقے میں** خود امام بخاریؒ ہیں جنہوں نے تبع تابعین سے حدیث سنی۔ اور اسے اپنی کتاب میں روایت کیا۔

اصول وقواعد:

☆......حدیث کے دونوں حصے کسی بھی حدیث کو جانچنے کے لئے ضروری ہیں صرف سندی اعتبار سے تجزیہ درست نہیں ہوگا جب تک متن کو نہ کھنگال لیا جائے اور نہ ہی اس کے برعکس۔

☆...... یہ ضروری نہیں کہ سند اگر صحیح ہو تو متن بھی صحیح ہوگا۔ کیونکہ کبھی متن میں شذوذ اور نکارت ظاہر ہو جاتی ہے یا اصول صحیحہ کی مخالفت بھی۔ اسی طرح اس کے برعکس۔ دونوں کو اصول کے مطابق پرکھنا ہوگا۔

☆...... تمام تر صحیح اسانید کا انحصار و دارومدار ان چھ علماء پر ہے: اہل مدینہ کی اسانید امام محمد بن شہاب الزہری رحمہ اللہ پر۔ اہل مکہ کی عمرو بن دینار پر، اہل بصرہ کی قتادۃ اور یحییٰ بن کثیر پر، اہل کوفہ کی ابواسحٰق اور اعمش پر، پھر ان چھ علماء کا علم ان مصنفین میں جمع ہو گیا جو علوم حدیث کے ماہر اور مصنف تھے۔ مدینہ میں امام مالک اور ابن اسحاق کے پاس، مکہ میں ابن جریج اور ابن عیینہ کے پاس، بصرہ میں ابن ابی عروبہ، حماد بن سلمہ، شعبہ، ابوعوانۃ اور معمر کے پاس، معمر نے ان سابق چھ علماء سے سماع بھی کیا، اور کوفہ میں سفیان ثوری کے پاس اور شام میں اوزاعی کے پاس اور واسط میں ہشیم کے پاس۔ حماد بن زید اور اللیث کو بھی ان میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ پھر ان سب کا علم یحییٰ بن سعید القطان، یحییٰ بن ابی زائدۃ، عبدالرحمٰن بن مہدی، یحییٰ بن آدم، ابن المبارک، وکیع اور ابن وہب جیسے علماء میں جمع ہو گیا۔ (تذکرۃ الحفاظ: ۱/۳۶۰، سیر اعلام النبلاء ۹/۵۲۶)

☆☆☆☆☆

فتنہ جوئی اور غیبی مدد

شیطان اور اس کے چیلوں نے خیانت سے بھری یہ مذموم حرکت ضرور کی ہے کہ تفکر و تدبر کا غچہ دے کر قرآن کریم کے معانی اور مفہوم میں ہیر پھیر کر دے اور تاویل و تحریف کے انبار لگا دے۔ اور جب حدیث اس کی فکر و تدبر پر ہاتھ ڈالے تو وہ اس پر بھی اپنی مکارانہ صفت سے قلم کاری و گلوکاری کرے۔ جس میں انکار، تاویل بازی، اصول کے سہارے اور درایت جیسی ملغوبات کی فتنہ پسندی ہو۔

رب کریم نے علماء حق کو توفیق بخشی کہ وہ استدلال کی قدرت رکھتے ہوئے یہ کبھی جائز نہ سمجھیں کہ حدیث رسول، نام نہاد تدبر پر ترک کی جا سکتی ہے اور اپنے کسی استاذ یا شیخ و امام کا قول اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اقوال شیوخ و ائمہ تو رد کئے جا سکتے ہیں مگر قول رسول ﷺ نہیں۔ یہی وہ دینی نعمت تھی جو اللہ تعالیٰ نے علماء حق پر نچھاور کی جس سے ہر قدیم و جدید یا ظاہر و مخفی غلطی اور خطا کی اصلاح ہو گئی۔ اور تخفیف حدیث کی ساری مذموم حرکتیں اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

مصطلحات حدیثیہ

ان اصطلاحات کو متعارف کرانے کا مقصد یہ ہے تاکہ علوم شریعہ میں ان کی کیا اہمیت ہے؟ یہ اصطلاحات درج ذیل ہیں:

خبر حدیث سنت اثر

۱۔ **خبر:** لغت میں خبر بمعنی نبأ کے ہے، جس کی جمع اخبار ہے۔

اصطلاح میں حافظ ابن حجرؒ نے **شرح النخبہ** ص(۷) میں علمائے حدیث کی تین آراء کو لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ الْخَبَرُ عِنْدَ عُلَمَاءِ هَذَا الْفَنِّ مُرَادِفٌ لِلْحَدِيثِ: اس فن کے علماء یعنی محدثین خبر کو حدیث کا مرادف (synonym) سمجھتے ہیں۔

یعنی حدیث وخبر کی تعریف ایک ہی ہے۔ جیسے بشر وانسان۔ امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ دونوں اصطلاحات مرفوع، موقوف اور مقطوع کے لئے بھی استعمال ہوسکتی ہیں۔ کچھ علماء کہتے ہیں: مرفوع کے علاوہ پر یہ اصطلاح پھر مقید ہوگی۔ مثلاً: هَذَا حَدِيْثٌ مَوْقُوفٌ عَلَى أَبِيْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ۔

۲۔ یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ وہ اس طرح کہ:

الْحَدِيثُ مَا جَاءَ عَنِ النبيِّ ﷺ وَالْخَبَرُ مَا جَاءَ عَنْ غَيْرِهِ۔ جو خبر ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آئے اسے حدیث، اور جو غیر نبی کی طرف سے یعنی صحابہ یا تابعین وتبع تابعین وغیرہ کی طرف سے آئے وہ خبر ہوگی۔

اسی سبب سے علم تاریخ سے شغف رکھنے والے کو اخباری کہہ دیتے ہیں جیسے: عسل بن ذکوان الاخباری، ابوعیینہ بن محمد بن ابی عیینہ الاخباری اور محمد بن عبد اللہ ابوعبد اللہ الاخباری بغدادی۔ وغیرہ۔ اور جو حدیث وعلم حدیث میں شغف رکھتا ہو اسے محدث کہہ دیتے ہیں۔ مگر علماء خراسان کا نظریہ یہ ہے کہ خبر اسے کہیں گے جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہو اور اثر وہ ہوگی جو غیر نبی سے مروی ہو۔

۳۔ ان دونوں کے مابین عام وخاص کی نسبت ہے۔ یعنی حدیث صرف رسول محترم ﷺ سے آئے گی اور خبر آپ ﷺ سے یا کسی اور سے۔ مراد یہ کہ ہر حدیث، خبر ہے مگر ہر خبر، حدیث نہیں۔ بالعکس نہیں ہوگی۔ اس نسبت

کو عموم وخصوص مطلق کہتے ہیں۔

مثلاً: حدیث میں ہے: لَا صَلاۃَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰی تَغْرُبَ الشَّمْسُ۔ اس میں لَا صَلاۃَ: عام ہے ہر قسم کی نماز کو شامل ہے۔ بَعْدَ الْعَصْرِ: وقت کے لحاظ سے خاص ہے۔ اسی طرح: إِذَا دَخَلَ أَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ فَلَا یَجْلِسْ حَتّٰی یُصَلِّیَ رَکْعَتَیْنِ۔ میں إِذَا دَخَلَ أَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ: وقت میں عام ہے اور فَلَا یَجْلِسْ حَتّٰی یُصَلِّیَ رَکْعَتَیْنِ نماز میں خاص ہے۔ ان دونوں کے درمیان عام وخاص کی نسبت ہے۔

☆......اہل بلاغت ہر اس قول کو خبر کہتے ہیں جس میں سچ اور جھوٹ کا احتمال ہو۔ اس سے قطع نظر کہ اس کا قائل کون ہے۔ یا ہر قول کو سچ یا جھوٹ قرار دینا درست ہو اسے بھی خبر کہتے ہیں خواہ اس کا قائل کوئی بھی ہو۔ اس لئے احادیث رسول یا سنت نبویہ جن میں صیغہ امر ونہی آئے ہیں سبھی بذریعہ خبر ہی آئے ہیں جن میں صدق وکذب کا احتمال بھی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا جو حدیث کو بیان کرے گا ممکن ہے اسے سامع کہے: صدقتَ یا کذبتَ۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی طرف جو بات منسوب ہو وہ آپ ﷺ نے نہ کہی ہو۔

حافظ ابن حجرؒ نے ان تینوں اقوال میں سے آخری قول کو ترجیح دیتے ہوئے کہا ہے: وَعَبَّرْتُ هُنَا بِالْخَبَرِ لِیَکُونَ أَشْمَلَ۔ میں نے اس کتاب میں (نخبۃ الفکر) حدیث سے مراد خبر ہی لی ہے تاکہ بات زیادہ جامع اور واضح ہوجائے۔

۲۔ حدیث: لغت میں قدیم کی مقابل ہے۔ اس سے مراد نئی چیز یا بات۔ قصہ، کہانی۔ قرآن کریم کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

اصطلاحاً: جو قول وعمل یا تقریر یا صفت خَلقی وخُلقی خواہ بعثت سے پہلے کے ہوں یا بعد کے۔ اور وہ نبی ﷺ کی طرف منسوب ہوں اسے حدیث کہتے ہیں۔ غیر نبی کے اعمال واقوال یا صفات سے ممتاز کرنے کے لئے اہل علم نے یہ اصطلاح صرف رسول اکرم ﷺ کے لئے مخصوص کرلی اور آپ ﷺ نے بھی فرمائی۔ امام ابن حجرؒ صحیح بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں:

> الْمُرَادُ بِالْحَدِیثِ فِي عُرْفِ الشَّرْعِ مَا یُضَافُ إِلَی النَّبِيِّ ﷺ۔ شریعت میں حدیث سے مراد وہ چیز جو آپ کی طرف منسوب ہو۔

فائدہ: امام سیوطیؒ فرماتے ہیں: وَکَأَنَّهُ أُرِیدَ بِهِ مُقَابَلَةُ الْقُرْآنِ لِأَنَّهُ قَدِیمٌ۔ لفظ حدیث اصل میں قرآن کے

قدیم ماننے کا اعلان ہے کیونکہ اس کے مقابلے میں حدیث جدید ہے۔اس اصطلاحی معنی سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ حدیث: آپ ﷺ کی طرف منسوب کسی قول یا فعل یا تقریر یا صفت کا نام ہے۔اس لئے حدیث وسنت کے شائق کو اثری یا محدث کہتے ہیں۔

۳۔سنت:

لغت میں فُعْلَة کے وزن پر ہے بمعنی مفعولة۔ سَنَنْتُ الإِبِلَ سے ہے جب ان کا بخوبی خیال رکھا جائے۔لغت میں اس کے متعدد معانی ہیں: منہج، راستہ یا سیرت کو بھی سنت کہتے ہیں۔خواہ وہ اچھی ہو یا بری۔اسی معنی میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

(مَنْ سَنَّ فِي الإِسلامِ سُنَّةً حَسَنَةً ۔۔۔مَنْ سَنَّ فِي الإِسلامِ سُنَّةً سَيِّئَةً۔۔) جس نے اسلام میں کسی اچھے طریقے کو رواج دیا۔۔جس نے اسلام میں کسی برے طریقے کو رواج دیا۔(متفق علیہ)

لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ شِبْراً بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ، حَتّٰى لَوْ دَخَلُوا جُحْرَ ضَبٍّ لَاتَّبَعْتُمُوهُمْ۔ قُلْنَا: يَارَسُولَ اللّٰهِ! اَلْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ: فَمَنْ؟ تم ضرور اپنے سے پہلوں کی پیروی کرو گے دست بدست اور بازو بہ بازو۔حتی کہ اگر وہ کسی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوئے ہوں گے تو تم بھی ضرور ان کی اتباع کرو گے۔ہم نے عرض کی: کیا یہود ونصاری کی پیروی ہوگی؟ آپ نے فرمایا: تو اور کس کی؟ (متفق علیہ)

ان احادیث میں لفظ سنت معاصی اور شریعت کی مخالفت نیز ان کی اقتداء و عمل کے لئے بھی بولا گیا ہے۔

اصطلاحاً: محدثین سنت کو حدیث کا مرادف کہتے ہیں:

مَا أُضِيفَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ مِنْ قَوْلٍ ، وَفِعْلٍ، وَتَقْرِيْرٍ وَهِيَ مُرَادِفَةٌ لِلْحَدِيْثِ۔ جو قول وفعل اور تقریر رسول اکرم ﷺ کی طرف منسوب ہو۔

نوٹ: ایسی صورت میں سنت، صرف حدیث مرفوع کو شامل ہوگی۔اس لئے رسول اکرم ﷺ کی ہر چیز سنت ہوگی جس کی خبر اللہ تعالی نے ہمیں دی کہ یہ آپ ﷺ کا اسوہ حسنہ ہے یا قدوہ و رول ماڈل ہے۔پھر اس کی تابعداری مسلمان پر فرض ہے۔اس سنت میں عقائد واحکام وسیرت، اخلاق، شمائل، اخبار، اقوال وافعال سبھی

شامل ہیں۔ یہ سنت، تشریعی بھی ہے اور عرفی بھی۔ ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سنت لامتناہی مفاہیم واسالیب کا بھی نام ہے۔ جیسے: کائنات، فطرت، سوسائٹی، اقتصاد، مختلف علوم اور دیگر معاملات کی عام معلومات اگر رسول محترم سے ملتی ہیں تو وہ بھی سنت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحاح اور سنن کی کتب میں ایمانیات و احکام کے ساتھ اخلاق پر مشتمل احادیث بھی ہیں۔ اسلاف بدعت کے مقابلے میں لفظ سنت استعمال کرتے۔ جو سنت نبویہ، سنت صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد کے سلف صالحین کے طریقے پر چلتا اسے اہل السنۃ کا خطاب دیتے۔ اور جو اسلاف کے طریقے کو چھوڑ کر مخصوص سوچ یا افراد کے پیچھے لگتا اسے اہل الرائے کہتے۔ اور جو اپنے نئے طریقے بطور ثواب کے گھڑتا اسے اہل البدعۃ کہتے۔

۴۔ **اثر**: **لغت** میں أثر شے کے باقی ماندہ نشان کو کہتے ہیں۔ یا ریتلی زمین پر آدمی کے چلنے کے نشانات کو کہتے ہیں۔ مشہور جاہلی شاعر کہتا ہے:

وَالْمَرْءُ مَا عَاشَ مَمْدُوْدٌ لَهُ أَثَرٌ۔ آدمی جب تک زندہ رہے اس قدر اس کے نشانات پھیلے چلے جاتے ہیں۔
قرآن مجید میں ہے: ﴿أو أثارة من علم..﴾ میں أثَارَةٍ سے مراد وہ علم ہے جس کے آثار تا حال روایت یا تحریر کی وجہ سے باقی ہوں۔ کہا جاتا ہے: أَثَرْتُ الْعِلْمَ رَوَيْتُهُ۔ یعنی میں نے علم کو روایت کیا۔ أثر کے اصل معنی روایت یا علم کو تلاش کرنا، کے ہوتے ہیں۔ (المفردات (ص:۹)۔

اصطلاحاً: اس کے تین معانی ہیں:

۱۔ **اثر**، حدیث کے مقابلے میں عام ہے اور حدیث خاص۔ یعنی اثر اسے کہتے ہیں جو رسول اکرم ﷺ سے یا کسی اور سے مروی ہو۔ اس لئے مرفوع، موقوف اور مقطوع کو بھی اثر کہا جاتا ہے۔ جس کی شہادت امام ابوجعفر الطحاویؒ کی کتاب **شرح معانی الآثار** ہے۔ جس میں مرفوع، موقوف اور مقطوع ومراسیل روایات ہیں۔ لغوی اعتبار سے یہ معنی ہی صحیح ہے۔ کیونکہ لفظ أثَر، أَثَرْتُ الْحَدِيْثَ سے مأخوذ ہے جس کا مطلب ہے: رَوَيْتُهُ۔ میں نے اسے روایت کیا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: اثر کے بارے محدثین کرام کا نکتہ نظر ہی زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور سلف وخلف نے اسی معنی میں ہی اسے استعمال کیا ہے کہ اثر صرف مروی پر بولا جائے خواہ وہ رسول اللہ ﷺ سے ہو یا کسی صحابی سے۔

۲۔ اثر، حدیث سے مختلف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اقوال کے علاوہ صحابہ وتابعین کرام کے اقوال، افعال اور تقریرات وغیرہ کو بھی کہتے ہیں۔ علماء خراسان نے اثر کی تعریف یہی کی ہے:

مَا يُرْوٰى عَنْ غَيْرِ الرَّسُوْلِ ﷺ فَيُطْلَقُ عَلَى غَيْرِ الْمَرْفُوْعِ۔ جو رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور سے مروی ہو اور مرفوع کے علاوہ کسی اور پر یہ چسپاں ہو۔

ابوالقاسم فورانی کہتے ہیں کہ ہمارے فقہاء کا کہنا ہے: خبر وہ ہے جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہو اور اثر وہ جو صحابہ کرام سے۔ اس طرح اثر کی اصطلاح موقوف ومقطوع دونوں پر منطبق ہوگی نہ کہ مرفوع پر۔ حافظ سخاوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: امام بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب مَعْرِفَةُ السُّنَنِ وَالآثَارِ کا نام بظاہر اسی چیز کو اجاگر کرتا ہے کہ اثر مرفوع کو نہیں بلکہ غیر مرفوع کو کہتے ہیں۔ اسلاف اس تفریق میں اس کے امام تھے۔ اور بیہقی رحمہ اللہ نے یہ تفریق وامتیاز ان خراسانی علماء کی تحریر میں بکثرت پایا اور جسے متأخرین نے سراہا بھی۔ اس لئے وہ موقوف کو اثر کہتے ہیں اور مرفوع کو خبر۔

۳۔ اثر، محدثین کرام اسے صرف حدیث کا معنی ہی دیتے ہیں۔ اس کی جمع آثار ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنن آپ ﷺ کے آثار ہیں۔ حدیث مأثور بھی اسے کہتے ہیں جو لوگ ایک دوسرے کی خبر دیتے آئیں۔ یعنی جسے اخلاف اپنے اسلاف سے نقل کریں۔ **اثری:** یہ اثر کی طرف نسبت ہے وہ شخص جو جماعت وآثار کی اتباع کرتا ہے نہ کہ معین شخص کی۔

لفظ اثر کی شرعی دلیل شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

جو شخص اگر کسی چیز کو دین بنانا چاہتا ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا اس سے یہ مطالبہ ہے: ﴿ائتونی بکتاب من قبل هذا أو أثارة من علم.﴾ الأحقاف: ۴)۔ یعنی اس قرآن سے پہلے تمہارے پاس اپنے عقائد ونظریات کی کوئی کتاب ہے یا کوئی علمی نشانات ہیں تو لے آؤ۔ اس آیت میں کتاب سے مراد تو کتاب ہی ہے اور أثارة سے مراد جیسا کہ سلف میں سے کسی نے کہا ہے: روایت واسناد ہے۔ کچھ نے خط بھی مراد لیا ہے کیونکہ روایت ہو یا اسناد، وہ خط سے ہی لکھی جائے گی اس لئے کہ أثارة، اثر سے ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ اجو مطاع ہے وہ اپنے علم کو سند کے ذریعے مؤثر ومقبول بنائے گا۔ یا اسے خط سے مقید کرے گا اس طرح یہ اس کے آثار بن جاتے ہیں۔

امام حاکم رحمہ اللہ نے المَدْخَلُ إِلٰی کِتَابِ الإِکْلِیْلِ میں مطر الوراق کا ایک قول ذکر کیا ہے ﴿أو أثارة من علم..﴾ سے مراد اسناد حدیث ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا درجہ بالا قول اس کی مکمل تائید ہے۔ اس ساری گفتگو سے ہم یہی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اثر کے بارے میں علماء کے دو اقوال ہیں:

۱۔ محدثین کی اصطلاح میں اثر اور حدیث ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

۲۔ دونوں میں فرق ہے اثر اسے کہتے ہیں جس کی نسبت صحابہ کرام کے اقوال وافعال کی طرف ہو اور حدیث وہ جو آپ ﷺ کی طرف منسوب ہو۔

ان اقوال کی دلیل مقدمہ صحیح مسلم بابُ وُجُوبِ الرِّوایةِ عَنِ الثِّقَاتِ وَتَرْکِ الْکَذَّابِیْنَ ۱/۵۹ میں یہ ہے: سنت ہی منکر اخبار کی روایت سے اس طرح روکتی ہے جیسے قرآن مجید فاسق کی خبر سے منع فرماتا ہے۔ آپ ﷺ ہی کا یہ مشہور اثر ہے:

مَنْ حَدَّثَ عَنِّی بِحَدِیثٍ یُرٰی أَنَّهُ کَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الکَاذِبِینِ۔ جو مجھ سے حدیث بیان کرے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک جھوٹ ہے تو وہ دو جھوٹوں میں کا ایک ہے۔

اثر بمعنی حدیث تب ہوگا جب وہ لفظ رسول کے ساتھ مقید ہو۔ جیسے امام مسلم اسی روایت میں فرماتے ہیں: وَهُوَ الأَثَرُ الْمَشهُورُ عَنْ رسولِ اللّٰهِ ﷺ۔ ورنہ وہ بمعنی حدیث نہیں ہوگا۔

اقسام حدیث: آپ ﷺ کا قول، فعل، تقریر اور آداب وشمائل چونکہ سب وحی خفی ہیں۔ اس اعتبار سے علماء حدیث نے حدیث کی متعدد اقسام بتائی ہیں۔ چند مشہور درج ذیل ہیں:

حدیث قولی: یہ آپ ﷺ کے ارشادات ہیں جو آپ ﷺ ہی کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ جیسے:

إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلامِ النُّبُوَّةِ الأُوْلَى: إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ۔ (صحیح بخاری: کتاب الأنبیاء: ۵۴)

حدیث وحی خفی ہے اس کا نزول ہوا اور جس کے ابلاغ کا فرض آپ ﷺ کو سونپا گیا ہے:

﴿یا أیها الرسول بلغ ما أنزل الیک من ربک وإن لم تفعل فما بلغت رسالته﴾.

(المائدہ ۶۷) اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر اتارا گیا ہے اسے پہنچا دیجئے۔ اگر آپ ایسا نہیں

کریں گے تو آپ نے اس کے پیغام پہنچانے کا حق ادا نہیں کیا۔

حدیث فعلی: آپ ﷺ کی روزمرہ زندگی کی وہ اعمال ہیں جو آپ ﷺ نزول وحی الٰہی کے عین مطابق بجا لاتے تھے۔ جیسے صحیح بخاری میں ح:۵۸۰۳، صحیح مسلم میں ح ۲۶۸ میں ام المؤمنین فرماتی ہیں:

كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ مَا اسْتَطَاعَ، فِي طُهُورِهِ، وَ تَنَعُّلِهِ، وَ تَرَجُّلِهِ، وَ فِي شَأْنِهِ كُلِّهِ۔

حدیث تقریری: یہ کسی صحابی یا صحابیہ کا کوئی عمل، قول یا فعل ہے جسے یا تو آپ ﷺ نے سننے کے بعد برقرار رکھا یا سکوت اختیار فرمایا یا آپ نے ناپسند نہیں فرمایا یا موافقت فرمائی یا اسے مستحسن سمجھا۔ جیسے: آپ ﷺ نے مدنی لوگوں کا طریقہ مضاربت برقرار رکھا جو ان کے ہاں معروف تھا۔ اسی طرح عید کے موقع پر بچیوں کا غناء، حبشیوں کا مسجد میں گتکہ بازی کا مظاہرہ، یا گوہ کا آپ کے دسترخوان پر آپ ﷺ کے سامنے کھایا جانا۔

یہی اقسام حدیث ہیں جن سے محدثین استدلال لیتے ہیں تا کہ آپ ﷺ کے ارشاد، عمل یا تقریر سے فائدہ اٹھایا جائے۔

نوٹ: احادیث میں قبل از نبوت کی کچھ سیرت واخبار بھی ہیں۔ جیسے آپ ﷺ کا امی ہونا، صادق وامین معروف ہونا، غار حراء میں آپ ﷺ کا تحنث، سیدہ خدیجہؓ کا آپ ﷺ کے قبل از نبوت کے اخلاق ومحاسن کا ذکر۔ یہ تمام حالات آپ ﷺ کی نبوت وصداقت کی دلیل ہیں۔ بعد از نبوت کے حالات کتب حدیث میں درج ہیں تا کہ وہ شریعت کا مصدر قرار پائیں۔ نیز کتب سیرت میں نسب نامہ کے علاوہ آپ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں کا ذکر بھی ہوتا ہے وہ بھی حدیث کہلاتے ہیں۔ باقی کتب تفسیر، سیرت ومغازی میں قبل از نبوت کے واقعات اس لئے بیان نہیں ہوتے کہ انہیں کوئی شرعی مصدر نہ بنا لے۔

☆☆☆☆☆

فقہاء کرام اور نقاد محدثین کے ہاں اپنے اپنے اصول درایت ہیں۔ حدیث رسول کی صحت وضعف کے لئے صحیح حدیث کی جو شرائط ہیں وہ درایت وعقل اور روایت سمیت ایسی ہیں جو بعض فقہاء کے ہاں نہیں۔ انہوں نے حدیث کی صحت کے لئے جہاں عقل اور معنی کو ترجیح دی ہے وہاں اس تحقیق کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں؟

باب ۳

تعداد اسانید کے اعتبار سے خبر کی اقسام

جب ہمیں خبر یا حدیث پہنچتی ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں: اس کے راویوں کی تعداد معین ہوگی یا غیر معین۔ جمہور محدثین نے خبر کی نسبت آپ ﷺ اور صحابہ وتابعین کی طرف کی ہے اور حدیث کی صرف آپ ﷺ کی طرف۔ اس طرح:

قسم اول: متواتر　　　　　قسم ثانی: آحاد یا خبر واحد

۱. خبر متواتر:

لغت میں لفظ تواتر: پے در پے کے معنی میں ہے۔ کہا جاتا ہے: تَوَاتَرَ الْمَطَرُ: پے در پے بارش ہوتی رہی۔ ایک کے بعد دوسرا قطرہ۔ اسی سے اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ثم أرسلنا رسلنا تترا﴾ پھر ہم پے در پے اپنے رسولوں کو بھیجتے رہے۔ دو رسولوں کے درمیان وقفہ ہوتا تھا۔ اگر وقفہ کے بغیر ہو تو اسے مواصلۃ کہتے ہیں۔ وَتِیْرَہ: عربی زبان میں طریقہ کو بھی کہتے ہیں۔ جیسے: مَازَالَ عَلَى وَتِيرَةٍ وَاحِدَةٍ: وہ ابھی تک ایک ہی عادت پر قائم ہے۔ متواتر اسم فاعل ہے۔ جس کا مطلب ہے ایک شے کے بعد دوسری شے کا آنا۔

اصطلاح محدثین میں: علماء حدیث نے متواتر کی تعریف یہ کی ہے۔

مَا رَوَاهُ جَمَاعَةٌ، يَسْتَحِيلُ فِي الْعَادَةِ أَنْ يَتَوَاطَؤُا عَلَى الْكِذْبِ عَنْ مِثْلِهِمْ مِنْ أَوَّلِ السَّنَدِ إِلَى مُنْتَهَاهُ وَأَسْنَدُوهُ إِلَى شَيْءٍ مَحْسُوسٍ وَأَفَادَ خَبَرُهُمُ الْعِلْمَ لِسَامِعِهِ۔ ایسی حدیث جسے اول سند سے تا انتہاء ایسی جماعت روایت کرے کہ جس کا جھوٹ پر اتفاق عادۃً محال ہو۔ نیز وہ کسی محسوس شے کی طرف منسوب ہو۔ نیز ان کی خبر اپنے سامع کو علم کا فائدہ بھی دے۔

مثال: امام بخاری رحمہ اللہ جزء القراءۃ کے ص ۴ پر لکھتے ہیں:

وَتَوَاتَرَ الْخَبَرُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: لَا صَلَاةَ إِلَّا بِأُمِّ الْقُرْآنِ۔ آپ ﷺ سے تواتر کے ساتھ یہ حدیث مروی ہے کہ: ام القرآن یعنی سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

چار شرائط:

اولاً: تواتر کے لئے معین تعداد کی ضرورت نہیں۔قول مختار یہ ہے کہ راویوں کی تعداد کم از کم چار ہو جو حفظ حدیث، دین اور ثقاہت میں قابل اعتبار ہوں۔

ثانیاً: یہ کثرت سند کے تمام طبقات میں پائی جائے۔کہیں کم نہ ہو پائے۔جہاں کی ہوئی وہ متواتر نہیں ہوگی۔

ثالثاً: عقل باور کرے کہ ان کا کسی جھوٹ پر عادۃً بھی متفق ہونا ناممکنات میں سے ہے۔

رابعاً: وہ مروی خبر بھی حسی ہو۔اعتقادی نہ ہو یعنی ہر طبقے کے تمام راوی سَمِعْنَا یا رَأَيْنَا جیسے الفاظ کہیں تا کہ سامع کو یقین ہو۔

ایسی روایت مفید علم ہوگی۔

متواتر کی انواع: اس خبر کی دو قسمیں ہیں:

۱۔متواتر لفظی ۲۔ متواتر معنوی

متواتر لفظی: وہ خبر جس کے لفظ یا عمل متواتر ہوں نہ کہ معنی۔مثلاً:

آپ ﷺ کی یہ قولی حدیث جو سیدنا ابو ہریرہؓ کے علاوہ دیگر صحابہ سے بھی انہی الفاظ کے ساتھ مروی ہے:

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ جس نے مجھ پر عمداً جھوٹ بولا وہ اپنا مقام دوزخ بنالے۔(متفق علیہ)

اسباب تواتر: محدث بزارؒ (م:۲۹۲ھ) نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو چالیس صحابہ نے انہی الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ابو بکر الصیرفیؒ، امام شافعیؒ کے الرسالہ کی شرح میں لکھتے ہیں: یہ حدیث ساٹھ سے زائد صحابہ سے مرفوعاً مروی ہے۔ابن مندہؒ نے ستاسی صحابہ گنوائے ہیں۔امام نوویؒ نے بعض محدثین سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کو باسٹھ صحابہ کرام نے روایت کیا جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔اس حدیث کو بقول امام سیوطی (ازھار المتناثرہ ح:۱) ستر سے زائد صحابہ نے روایت کیا ہے اور ہر صحابی کی سند روایت کو لکھا بھی ہے آخیر میں کہا ہے: فَهٰؤُلاءِ اثْنَانِ وَسَبْعُونَ صَحَابِيًّا۔تو یہ ہے بہتر صحابہ کی روایت۔

متواتر معنوی:

مَا تَوَاتَرَ مَعْنَاهُ دُونَ لَفْظِهِ۔ وہ خبر جس کا معنی تواتر سے مروی ہو نہ کہ اس کے لفظ۔

جیسے: شفاعت کی احادیث، گو ان میں مختلف حالات کا تذکرہ ہے مگر سبھی شفاعت رسول پر متفق ہیں۔ دعا کے لئے دونوں ہاتھ اٹھانے کی متعدد احادیث ہیں مگر معنی پر سبھی متفق ہیں گو دعاؤں کے الفاظ اور حالات مختلف ہیں۔ اسی طرح دیگر احادیث مثلاً: حوض کوثر، دجال کی آمد، نزول سیدنا عیسی علیہ السلام، اور قبر کو سجدہ گاہ نہ بنانے کی احادیث۔

متواتر معنوی کی تقریبی مثال:

جیسے کوئی حاتم کے بارے میں کہے کہ اس نے ایک اونٹ دیا اور دوسرا کہے: اس نے گھوڑا دیا۔ کوئی کہے: اس نے دینار دیا۔ اس تمام گفتگو میں ایک قدر مشترک تواتر کے ساتھ مل رہی ہے: اور وہ ہے: دینا۔ کیونکہ ہر حال میں وہ موجود ہے۔

تصنیفات متواتر احادیث: متأخر علماء نے کوشش کی ہے کہ متواتر احادیث کو جمع کیا جائے۔ ان میں:

محمد بن طولون دمشقی (م: ۹۵۳ھ) کی کتاب: اللَّآلِي الْمُتَنَاثِرَةُ فِي الأَحَادِيثِ الْمُتَوَاتِرَة۔

امام سیوطی (م: ۹۱۱ھ) کی دو تصانیف: **الأَزْهَارُ الْمَتَنَاثِرَةُ فِي الأَخبارِ الْمُتواتِرةِ** اور **قَطْفُ الأَزْهارِ** ہیں۔

اور محمد بن جعفر الکتانی کی کتاب: نَظْمُ الْمُتَنَاثِرِ مِنَ الحديثِ الْمُتَوَاتِرِ ہے۔ اس میں تین سو دس احادیث ہیں۔

نوٹ: جب کسی حدیث کے لئے صرف متواتر کا لفظ ہو تو وہ محدثین کے ہاں متواتر لفظی مراد ہوا کرتا ہے۔

اس کا وجود:

بہت سے علماء کا نکتہ نظر یہ بھی ہے کہ متواتر احادیث شاذ ہی ملتی ہیں۔ بلکہ وہ لفظ متواتر کو علم حدیث میں دخیل سمجھتے ہیں۔ امام ابن الصلاحؒ نے بصراحت لکھا ہے کہ اس کا وجود نادر ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَمِنْهُ الْمُتَوَاتِرُ الْمَعْرُوْفُ فِي الْفِقْهِ وَأُصُوْلِهِ وَلَا يَذْكُرُهُ الْمُحَدِّثُونَ، وَهُوَ قَلِيْلٌ لَا يَكَادُ يُوْجَدُ

فِيْ رِوَايَاتِهِمْ۔ اسی مشہور کی ایک قسم متواتر حدیث ہے جو فقہ اور اصول فقہ میں خاصی معروف ہے۔ محدثین اس کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ قلیل تعداد میں ہے بلکہ ان کی روایات میں اس کا وجود بھی نادر ہے۔ (التقریب: تیسویں نوع)

مگر ابن حجر رحمہ اللہ ان سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں ان کی یہ رائے متواتر احادیث کی بکثرت منتشر اسانید کے بارے میں قلت اطلاع پر مبنی ہے۔ بہرحال اگر صرف مرحلہ قبل از تدوین ہی کو لیں تو متواتر احادیث کا وجود ملتا ہے اور بعد از تدوین کو لے کر اگر فیصلہ کریں تو پھر جس نے متواتر کی نفی کی ہے وہ درست ہے۔

اس کا حکم: علماء فقہ و حدیث متفق ہیں کہ متواتر حدیث لفظی ہو یا معنوی اس سے علم یقین وضروری حاصل ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

متواتر حدیث کے لئے رواۃ کی تعداد متعین کرنا ٹھیک نہیں بلکہ لفظ تواتر سے کئی معانی مراد لئے جاتے ہیں۔ کیونکہ متواتر سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس سے علم حاصل ہو۔ کبھی مخبرین کی کثرت سے یہ علم حاصل ہوتا ہے اور کبھی رواۃ کی مخصوص صفات، ضبط اور ان کے دین کی وجہ سے بھی خبر متواتر کہلاتی ہے۔ اور کبھی چند قرائن خبر سے ایسے چمٹے ہوتے ہیں جن سے مجموعی طور پر علم (یقین) حاصل ہوتا ہے۔ کبھی حدیث کو امت قبول کر کے متواتر کا درجہ عطا کر دیتی ہے۔ اس لئے کہ امت کبھی بھی ضلالت پر جمع نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح تواتر حدیث وہ بھی ہوتی ہے جس کی صحت پر محدثین جمع ہو جائیں۔ نیز علم یقین کا حصول کبھی راویوں کی کثرت سے ہوتا ہے اور کبھی دینداری وضبط یا دیگر صفات سے۔ (مجموع الفتاوی ۱۸/۱۶، ۱۴۸)

ب۔ خبر واحد یا اخبار آحاد: اسے حدیث آحاد بھی کہتے ہیں۔

لغت میں لفظ آحاد، احد کی جمع ہے جس کا معنی ہے: ایک۔

جمہور محدثین کی اصطلاح میں:

هُوَ مَا لَمْ يَجْمَعْ شُرُوطُ التَّوَاتُرِ۔ جس میں تواتر کی شرائط اکٹھی نہ ہوسکیں۔

اقسام: جمہور محدثین نے خبر واحد کو تین اقسام میں منقسم کر دیا ہے:

۱۔ غریب **۲۔ عزیز** **۳۔ مشہور**

۱۔ خبر غریب: عربی میں فرد واحد کو غریب کہتے ہیں یا اسے جو اپنے رشتہ داروں سے دور ہو۔ اسے مفرد یا فرد بھی

کہتے ہیں۔

اصطلاح میں:

هُوَ الَّذِيْ يَنْفَرِدُ بِرِوَايَتِهِ شَخْصٌ وَاحِدٌ فِيْ جَمِيْعِ طِبَاقِ السَّنَدِ أَوْ بَعْضِهَا۔ وہ خبر ہوتی ہے جسے سند کے تمام طبقات میں یا بعض میں ایک شخص روایت کرے۔

مثال: آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى۔۔۔الحدیث۔ بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لئے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔ (متفق علیہ عن عمرؓ بن الخطاب)

حکم: یہ حدیث، صحیح، حسن اور ضعیف بھی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے: صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ۔ یا حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔ یا صرف غَرِيْبٌ۔ آخری اصطلاح امام ترمذی بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ امام زیلعی بھی نصب الرایة میں اس کا ذکر تو کرتے ہیں مگر اس کا ضعف نہیں بتاتے۔ مگر امام ترمذی رحمہ اللہ اکثر و بیشتر اس سے مراد ضعیف ہی لیتے ہیں۔

☆......غرابت کبھی سند میں ہوتی ہے اور کبھی متن میں۔ یا کبھی دونوں میں۔ اس لئے تخریج حدیث دونوں۔۔ متن اور سند۔۔ کے ذریعے ہونی چاہئے۔

اقسام: اس کی دو قسمیں ہیں:

غریب مطلق: وَهُوَ مَا كَانَتِ الْغَرَابَةُ فِيْ أَصْلِ سَنَدِهِ۔ یہ وہ روایت ہے جس کی اصل سند میں غرابت یعنی فرد واحد ہو۔ اصل سے مراد جس راوی سے حدیث شروع ہوئی۔ جیسے حدیث إنما الأعمال کی سند میں سیدنا عمرؓ اصل ہیں اور منفرد ہیں۔

غریب نسبی: هُوَ مَا كَانَتِ الْغَرَابَةُ فِيْ أَثْنَاءِ سَنَدِهِ۔ یہ وہ روایت ہے جس کی اثناء سند میں غرابت ہو۔ جیسے:

مَالِكٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ مَكَّةَ وَعَلَى رَأْسِهِ الْمِغْفَرُ۔ (متفق علیہ) آپ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سر مبارک پر خود تھی۔ امام مالکؒ اس حدیث کی روایت میں امام زہریؒ سے منفرد ہیں۔ ایک معین شخص کی طرف نسبت کی وجہ سے اسے غریب نسبی کہتے ہیں۔

کتب: اس موضوع کی احادیث ہمیں درج ذیل کتب سے مل سکتی ہیں:

أ۔ مُسْنَدُ الْبَزَّارِ (م:۲۹۲ھ)

ب۔ المُعْجَمُ الأَوْسَطُ از امام طبرانی (م:۳۶۰ھ)

خاص اسی موضوع پر درج ذیل کتب ہیں:

أ۔ السُّنَنُ الَّتِيْ تَفَرَّدَ بِكُلِّ سُنَّةٍ مِنْهَا أَهْلُ بَلْدَةٍ ۔از ابوداؤد رحمہ اللہ (م:۲۷۵ھ)

ب۔غَرَائِبُ مَالِكٍ از امام دارقطنی (م:۳۸۵ھ)

ج۔الأَفْرَادُ از امام دارقطنی۔

د۔ کتاب أطرافُ الْغَرَائِبِ وَالأَفْرادِ از محمد بن طاہر مقدسی

ز۔ الأحاديثُ الصِّحَاحِ وَالْغَرَائِبِ از ابوالحجاج المزی

۲۔خبرعزیز: یہ لفظ عَزَّزَ یُعَزِّزُ سے ہے۔**لغت** میں: اس کے دو معنی ہیں: طاقتور ہونا یا سخت ہونا۔قرآن مجید میں ہے: ﴿فعززنا بثالث﴾۔تو ہم نے تیسرے سے انہیں قوی کیا۔دوسرا معنی: جس کا وجود کم اور نادر ہو۔اس لئے یہ نام اسم با مسمی ہے۔علم مصطلح میں کم تر، اکثر پر اعتماد کر کے اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔مثلاً تین راوی حدیث روایت کریں اور ایک چوتھا راوی بھی اسے روایت کرے تو ہم اسے قبول کرلیں گے۔

اصطلاح میں:

وَهُوَ مَا لَم يَقِلَّ عَدَدُ رُوَاتِهِ عَنِ اثْنَينِ فِي جَمِيعِ طَبَقَاتِ السَّنَدِ وَإِنْ زَادَ عَنهُ فِي بَعضِ الطِّبَاقِ، وَسُمِّيَ بِذٰلِكَ لِقِلَّةِ وُجُودِهِ، وَإِمَّا لِكَونِهِ عَزَّ أي قَوِيَ بِمَجِيْئِهِ مِنْ طَرِيْقٍ آخَرَ۔وہ ہوتی ہے جس کے راویوں کی تعداد سند کے کسی بھی طبقے میں دو سے کم نہ ہو خواہ بعض طبقوں میں دو سے زائد یہ تعداد ہو جائے۔نادر ہی پائی جاتی ہے اس لئے یہ نام یا پھر یہ عزیز ہو جاتی ہے یعنی یہی حدیث کسی اور سند کے آنے پر قوی ہو جاتی ہے۔

مثال: آپ ﷺ کا وہ ارشاد ہے جسے دو صحابہ انس بن مالک اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں:

لَا يُؤمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيهِ مِنْ وَلَدِهِ وَوَالِدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔(متفق علیہ عن انسؓ بن مالک) تم میں کوئی بھی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے، اس کے والد اس کی اولاد اور تمام

انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔

سیدنا انس سے دو تابعی قتادہ بن دعامۃ سدوسی (م: ۱۱۴ھ) اور عبد العزیز بن صہیب البنانی بصری (م: ۱۳۰ھ) روایت کرتے ہیں اور قتادہ سے ابو بسطام شعبہ بن الحجاج (م: ۱۶۰ھ) اور سعید بن ابی عروبۃ العدوی (م: ۱۵۷ھ) روایت کرتے ہیں جبکہ عبد العزیز بن صہیب سے اسماعیل بن علیۃ (م: ۱۹۳ھ) اور عبدالوارث بن سعید تیمی (م: ۱۸۰ھ) روایت کرتے ہیں۔ صحابہ میں سے دو اس حدیث کو روایت کر رہے ہیں اور پھر اگلی نسل میں انسؓ سے دو پھر ان میں سے ہر ایک سے دو دو روایت کر رہے ہیں۔ سند کے ہر طبقے میں دو دو راوی موجود ہونے سے یہ حدیث عزیز ٹھہری۔

حکم: یہ حدیث بھی صحیح، حسن، ضعیف، مرسل اور موضوع بھی ہو سکتی ہے۔ وہ حدیث قابل عمل ہوگی جو صحیح کی شرائط پر پورا اترے۔ ورنہ نہیں۔ پھر حسن حدیث۔ ورنہ ضعیف مگر موضوع قابل قبول ہیں اور نہ ہی قابل عمل۔

۳۔ خبر مشہور: یہ لفظ شَهَرَ يَشْهَرُ شُهْرَةً سے اسم مفعول ہے۔ مشہور کا مطلب اعلان شدہ اور معروف۔

اصطلاحاً

مَا رَوَاهُ ثَلَاثَةٌ أَوْ أَكْثَرُ فِي كُلِّ طَبَقَةٍ مِنْ طَبَقَاتِ السَّنَدِ وَلَمْ يَبْلُغْ حَدَّ التَّوَاتُرِ۔ وہ ہوتی ہے جسے تین یا تین سے زائد راوی سند کے ہر طبقے میں بیان کریں۔ مگر وہ عدد حد تواتر کو نہ چھوئے۔

امام ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

إِذْ أَنَّ أَقَلَّ مَا تَثْبُتُ بِهِ الشُّهْرَةُ ثَلَاثَةٌ۔ اس لئے کہ کم از کم تین اسانید تک کی حدیث کو شہرت مل ہی جاتی ہے۔

مراد یہ ہے کہ جب ایک حدیث کی مختلف اسانید ہوں اور جسے تین یا تین سے زائد راوی روایت کرتے ہوں۔ اسے شہرت مل گئی۔ جس کی وجہ سے اسے مشہور کہا جاتا ہے۔ مثلاً: آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

نَحْنُ الآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔۔ ہم آخری امت ہیں مگر روز قیامت سب سے آگے ہوں گے۔

اس حدیث کو صحاح ستہ کے علاوہ امام احمدؒ نے بھی سیدنا ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اسے منتشر اور عام ہونے کی وجہ سے مشہور کہا جاتا ہے۔ یہ مشہور خبر صحیح ہے۔

علماء مصطلح نے صحیح مشہور حدیث کی مثال یہ دی ہے: إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعاً يَنْتَزِعُهُ۔۔۔ جسے صحابہ میں سے تین سیدنا ابن عمر، سیدنا ابو ہریرہ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے۔ حسن مشہور کی مثال: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ اور ضعیف مشہور کی مثال: الْأُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ دی ہے۔ (تدریب الراوی: ۳۶۹)

مستفیض: بعض محدثین نے اسی معیار کی ایک اور اصطلاح کا بھی تعارف کرایا ہے جس کا نام مستفیض ہے۔ یہ فَاضَ الْمَاءُ يَفِيْضُ فَيْضاً سے ماخوذ ہے پانی جب بہتا ہے تو وہ زور لگاتا ہے اور پھیل جاتا ہے۔ اسی سے حدیث مشہور کو مستفیض کہا گیا۔ کیونکہ وہ بھی پھیل جاتی ہے اور مشہور ہو جاتی ہے۔ اصطلاحاً اس کی تعریف میں تین اقوال ہیں:

۱۔ یہ مشہور کی مرادف ہے۔

۲۔ نہیں بلکہ یہ اس سے زیادہ خاص ہے۔ کیونکہ اس میں شروع تا آخر راوی عدد میں برابر ہوتے ہیں مگر مشہور میں نہیں۔

۳۔ خاص نہیں بلکہ عام ہے۔ یعنی ہر مشہور، مستفیض ہے اور ہر مستفیض، مشہور نہیں۔

بہر حال مستفیض ایسی خبر کو کہتے ہیں جس کی سند کے شروع، درمیان اور اخیر میں یعنی ہر دور میں کم از کم تین افراد نے روایت کیا ہو۔ مگر مشہور میں یہ قید نہیں بلکہ اس کی سند کے ہر طبقے میں کم از کم تین راوی ہوں جو تواتر کی حد کو نہ پہنچ پائیں۔

نوٹ: یاد رکھئے! ہر دور میں ایسی احادیث زبان زد عام ہوئی ہیں۔ چونکہ اکثریت علم حدیث سے واقف نہیں ہوتی وہ بعض اوقات ان احادیث کو اپنے وعظ، دروس اور محافل میں سنتے یا سناتے بھی ہیں۔ اس لئے محدثین کرام جو اس میدان کے شہسوار ہیں۔ اپنے دور میں مشہور مگر موضوع و باطل احادیث کو جمع کر دیتے ہیں۔ یہ چند کتب ہیں جن میں مشہور احادیث ہیں:

۱۔ اللَّآلِئُ الْمَنْثُورَةُ فِي الْأَحَادِيثِ الْمَشْهُورَةِ۔ از ابن حجر عسقلانی (م: ۸۵۲ھ)

۲۔ اَلْمَقَاصِدُ الْحَسَنَةُ فِيْمَا اشْتَهَرَ عَلَى الْأَلْسِنَةِ۔ از سخاویؒ (م: ۹۰۲ھ)

۳۔ الدرر المنتثرة فی الأحادیث المشتھرة۔ از عبدالرحمٰن سیوطی (م: ۹۱۱ھ)

۴۔البدر المنیر فی أحادیث البشر النذیر۔ازعبدالوہاب شعرانی (م:۹۳۷ھ)

۵۔ تمیز الطیب من الخبیث۔ازعبدالرحمن بن الدیبع الشیبانی (م:۹۴۴ھ)

۶۔التذکرۃ فی الأحادیث المشتہرۃ۔محمد بن عبدالرحمن زرکشی (م:۹۷۴ھ)

۷۔إتقان ما یحسن من الأحادیث الدائرۃ علی الألسن۔ازمحمد الغزی (م:۹۸۵ھ)

۸۔ تسہیل السبیل إلی کشف الالتباس۔ازمحمد الخلیلی (م:۱۰۵۷ھ)

۹۔ کشف الخفاء ومزیل الإلباس۔ازاسماعیل بن محمد عجلونی (م:۱۱۶۲ھ)

۱۰۔أسنی المطالب۔ازعبدالرحمن بن محمد الحوت (م:۱۲۷۶ھ)

خبر واحد اور نظریہ ظن: اکثر اصولی معتزلی حضرات خبر واحد کوظنی الثبوت کہتے ہیں کہ ظن سے یقین کا فائدہ نہیں ہوتا۔محدثین وفقہاء نے لفظ ظن کی وضاحت کی اور شواہد سے ثابت کیا کہ ظن: یقین وشک دونوں کا معنی دیتا ہے۔جو اصول دنیاوی معاملات کو نبھانے کا ہے محدثین نے وہی یہاں بھی لاگو کیا کہ خبر اگر صحت کے قرائن دیتی ہو تو پھر اس سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔اور اگر صحت کے قرائن موجود نہ ہوں تو بھی اختلاف کی گنجائش نہیں۔علماء وائمہ فقہاء کے اکثریت اسی کی قائل ہے۔اس لئے حدیث میں علماء وفقہاء کا اختلاف،تنوع کا ہے حقیقی نہیں اسے مخالفت باور نہیں کرانا چاہئے۔اختلاف تنوع سے ہماری مراد مثلاً: ایک شخص زکوۃ دیتا ہے مگر صدقہ نہیں کرتا،اور دوسرا زکوۃ بھی دیتا ہے اور صدقہ بھی کرتا ہے اور تیسرا نہ زکوۃ دیتا ہے اور نہ ہی صدقہ کرتا ہے۔اسے اختلاف تنوع کہتے ہیں۔

قرائن سے گھری خبر کی انواع ہیں: مثلاً: جو خبر صحیحین میں ہو۔اس خبر کے صحیح ہونے کے قرائن یہ ہیں:

......ان دونوں حضرات کی حدیثی علمی شان وبزرگی مسلمہ اور دیگر فقہاء ومحدثین کے مقابلے میں کم تر نہیں۔

......صحیح حدیث کو نکھارنے اور اسے چھانٹنے میں یہ دونوں سبھی محدثین سے برتر وبہتر ہیں۔

......علماء نے ان دونوں کتب کو سرآنکھوں پہ بٹھایا ہے اور اسے بڑا مقام دیا ہے۔یہ وہ خصوصیت ہے جو تواتر کی بکثرت اسانید وطرق کے مقابلے میں اعلی مقام رکھتی ہے۔اس لئے صحیحین کی احادیث دیگر تمام روایات کے مقابلے میں اعلی نوع کی احادیث ہیں۔دیگر کتب کی احادیث میں بھی اگر صحت کے قرائن دستیاب ہیں تو وہ بھی علم

ویقین کا فائدہ دیں گی اور قابل عمل بھی ہوں گی۔

احناف کے ہاں خبر واحد: اس کی تعریف عام کتب فقہ واصول میں یہی کی گئی ہے۔

هُوَ مَا دُوْنَ الْمَشْهُوْرِ وَالْمُتَوَاتِرِ۔ وہ خبر جو مشہور اور متواتر سے کم درجہ کی ہو۔

اسی طرح خبر واحد دیگر انواع کو ممتاز کرنے کے لئے یہ تعریف کی گئی ہے:

والمَشْهُورُ عِندَ الحَنفِيَّةِ: هُوَ كُلُّ حَدِيثٍ نَقَلَهُ عَنْ رسولِ اللّٰهِ ﷺ عَدَدٌ يَتَوَهَّمُ اجْتِمَاعُهُمْ عَلَى الْكِذْبِ، وَلٰكِنْ تَلَقَّتْهُ الْعُلَمَاءُ بِالقَبُولِ وَالْعَمَلِ بِهِ، بِاعتبارِ الأصلِ هُوَ آحادٌ وَبِاعْتبارِ الفَرْعِ هُوَ مُتَوَاتِرٌ۔ (اصول السرخسی:۲۹۱) احناف کے ہاں مشہور وہ حدیث ہے جسے رسول اللہ ﷺ سے رواۃ کی اتنی تعداد روایت کرے کہ ان کا جھوٹ پر اتفاق ہونے میں وہم ہو۔ بشرطیکہ علماء نے اسے شرف قبولیت بخشا ہو اور اس پر عمل بھی کیا ہو۔ اصل کے اعتبار سے ایسی خبر، آحاد میں شامل ہوگی اور فرع کے اعتبار سے متواتر میں۔

معلوم ہوا کہ احناف محدثین کی تقسیم سے مختلف ہیں۔ ان کے نزدیک ایسی احادیث کی تین اقسام ہیں: متواتر، مشہور اور خبر واحد۔ وہ مشہور کو خبر آحاد کی نہیں بلکہ خبر واحد کی طرح ایک قسم سمجھتے ہیں۔ مشہور کی اس تعریف سے ان کی مراد یہ ہے کہ مشہور خبر عصر صحابہ میں خبر واحد ہو یعنی جس میں صحابہ کی تعداد حد تواتر تک نہ پہنچتی ہو مگر زمانہ تابعین اور تبع تابعین میں یہ تعداد بتدریج بڑھ کر حد تواتر تک ہو جائے۔

جب کہ محدثین متواتر کے لئے ابتدائی تین عصور عصر صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں رواۃ کی مساوی تعداد چاہتی ہے۔ بعد کے عصور میں یہ جماعت محدثین کو مطلوب نہیں۔ اس لئے کہ حدیث اس مبارک دور میں مدون ہو چکی تھی اور متواتر اور عام ہوگئی تھی۔ مثلاً متفق علیہ حدیث، متواتر ہے کیونکہ یہ حدیث وہ عدد رواۃ رکھتی ہے جس سے یقین حاصل ہو۔ نیز صحیحین کی تدوین کے بعد ہزاروں کتب ایسی ہیں جو شیخین سے روایت کرتی ہیں۔ اس لئے کہ سب مانتے ہیں کہ یہ احادیث صحیح ہیں اور ثبوت کے درجہ تک پہنچتی ہیں۔ رہی مشہور تو اس کا زمانہ صحابہ میں حد تواتر تک نہ پہنچنا اور بعد میں پہنچنا یہ غیر واضح سی تعریف ہے، جو بیک وقت متواتر، خبر واحد کے لئے بھی کی جا سکتی ہے۔

دونوں تعریفوں میں فرق اور موازنہ:

۱۔ جمہور محدثین کے ہاں خبر آحاد، اصلاً آحاد اور فرعاً متواتر یا بالعکس بھی ہو سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ

آپ ﷺ سے ایک ایسی جماعت حدیث روایت کرے جو حد تواتر تک نہ پہنچتی ہو پھر آنے والی صدی میں یہ حدیث پھیل کر متواتر ہو جائے۔ یہ ہے اصلاً آحاد اور فرعاً متواتر۔ بالعکس یوں ہوگی کہ وہ خبر متواتر الأصل ہو پھر سند کے کسی طبقہ میں وہ آحاد ہو جائے۔ یا تمام طبقات میں وہ آحاد ہو جائے۔ احناف کے ہاں مشہور آحاد الاصل ہوتی ہے یعنی عصر صحابہ میں وہ آحاد تھی مگر دوسری اور تیسری صدی میں وہ خوب منتشر ہو کر متواتر بن گئی۔

۲۔ جمہور محدثین متواتر اور آحاد کے درمیان کوئی اور درجہ حدیث نہیں رکھتے مگر احناف ان کے درمیان مشہور کا درجہ متعین کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں ۔۔ محدثین کے ہاں ۔۔ مشہور، خبر واحد میں شامل ہوگی کیونکہ وہ متواتر سے کم درجہ کی ہے۔ یعنی جمہور محدثین کے ہاں ہر مشہور خبر، آحاد ہوگی اور احناف کے نزدیک جمہور کی ہر آحاد، مشہور نہیں ہو سکتی۔

۳۔ جمہور محدثین کے ہاں متواتر اور آحاد حجت ہیں۔ وہ خبر متواتر سے قرآن کے عام کو خاص بھی کرتے ہیں اور اس کے مطلق کو مقید بھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک صحیح احادیث قرآن کے مجمل کو بیان بھی کرتی ہیں اور اس کے مشکل کو واضح بھی۔ احکام کے معاملہ میں بھی وہ نص پر ان احادیث سے اضافہ درست سمجھتے ہیں جبکہ احناف حدیث کے مقبول و مردود ہونے کی شرائط کو تسلیم کرتے ہیں لیکن درایت یا شدت احتیاط کے نام سے بعض کمزور اصول وضع کر کے وہ صحیح احادیث کی ایک بڑی تعداد کو رد بھی کر دیتے ہیں۔

۴۔ متواتر اور آحاد ۔۔ دونوں کو محدثین حجیت میں، عمل میں اور قرآن کے ساتھ اپنے تعامل میں برابر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ متواتر علم ضروری کا فائدہ دیتی ہے جبکہ خبر واحد ظنی یا قرائن کے مل جانے سے علم قطعی کا۔

۵۔ احناف کے نزدیک مشہور کا منکر کافر نہیں ہوگا۔ مگر اکثر علماء احناف کے ہاں اس سے ایسا علم طمانیت ضرور حاصل ہوتا ہے جو علم یقین کا ادنی درجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی حدیث بیان قرآن کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ اور مجمل کو مفصل اور عام کو خاص بھی کرتی ہے۔ مطلق کو مقید اور مشکل کی وضاحت بھی کرتی ہے۔ احکام میں نص پر زائد بھی ہو جاتی ہے کیونکہ یہ حدیث عصر ثانی اور عصر ثالث میں قبولیت کا درجہ پا چکی ہے۔ مگر خبر آحاد نہیں۔

۶۔ مشہور حدیث کے لئے احناف، عصر اول کے بعد کا عصر معتبر قرار دیتے ہیں۔ جبکہ جمہور محدثین کے نزدیک ۔۔ حدیث خواہ مشہور ہو یا آحاد ۔۔ اس کا خود صحیح ہونا معتبر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عصر اول کے بعد اس کا

مشہور ہونا اس کی آحادیت کو ختم نہیں کرتا اور نہ ہی اسے بعد میں حدِ تواتر تک پہنچاتا ہے بلکہ ایسی حدیث۔۔۔تصحیح وتضعیف کی۔۔۔اور۔۔۔مطالعہ ونقد کی۔۔۔محتاج ہوجاتی ہے۔اس لئے کہ متواتر کی جو شرائط ہیں وہ ایسی مشہور میں نہیں ہوتیں۔

۷۔جمہور محدثین کے نزدیک کسی بھی حدیث سے اخذ حکم یا ترک حکم کا دارومدار اسی پر ہے کہ وہ صحیح یا حسن درجے کی ہو یا پھر ضعیف ہو۔چہ جائیکہ وہ متواتر ہو یا مشہور ہو یا آحاد۔صرف شہرت حدیث کسی بھی حدیث کی صحت کے لئے کافی نہیں جب تک وہ تصحیح وتضعیف کے عمل سے نہ گذرے۔واللہ اعلم۔

☆☆☆☆☆

نسبت کے اعتبار سے خبر واحد کی اقسام

اس کی تین اقسام ہیں۔

۱۔ مرفوع　　۲۔ موقوف　　۳۔ مقطوع

ا۔مرفوع: (Raised)

لغوی تعریف: لغت میں یہ اسم مفعول ہے۔اور رَفَعَ الشَّيُ يَرْفَعُهُ فَهُوَ مَرْفُوعٌ سے ماخوذ ہے۔اور وضع کی ضد ہے۔

اصطلاح: علماء حدیث نے اس کی دو انداز سے تعریف کی ہے۔

ا۔امام ابن کثیرؒ اختِصَارُ عُلُومِ الْحَدِيثِ کی چھٹی نوع میں لکھتے ہیں:

الْمَرْفُوعُ مَا أُضِيفَ إِلَى النبيِّ ﷺ قولاً أو فعلاً عَنهُ، وَسَواءٌ كَانَ متصلاً أو منقطعاً أو مرسلاً۔مرفوع آپ ﷺ کے اس قول یا فعل کہتے ہیں جو آپ ﷺ کی طرف منسوب ہو خواہ وہ متصل ہو، منقطع ہو یا مرسل ہو۔

اس تعریف سے مرسل اور منقطع نکل گئے ہیں۔محدثین کے ہاں یہی تعریف ہی متداول ہے۔یہ یاد رکھئے کہ مرفوع کے لئے اتصال کی شرط نہیں۔

۲۔ دوسری تعریف خطیب بغدادی نے الکفایہ (۲۱) میں اس طرح کی ہے:

هُوَ مَا أَخْبَرَ فِيهِ الصَّحَابِيُّ عَنْ قَوْلِ رسولِ اللهِ ﷺ وَفِعْلِهِ۔ جس روایت میں صحابی اگر رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل کو بتائے اسے مرفوع کہتے ہیں۔

اصول: امام ابن کثیر رحمہ اللہ کی تعریف سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ مرفوع کے لئے متصل ہونا شرط نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ متصل۔۔ مرفوع، موقوف اور مقطوع سبھی کو شامل ہوتی ہے۔

اصول: حدیث قدسی: وہ ہے جسے رسول اکرم ﷺ اللہ رب العزت کی طرف سے لفظاً یا معناً ارشاد فرمائیں اور جو بذریعہ روایت ہم تک پہنچی ہو۔ یہ قرآن بھی نہیں اور نہ ہی قرآن کریم میں سے ہے۔ اس لئے یہ مرفوع کے ضمن میں آئے گی۔

مثال: اسی تعریف کی رو سے مرفوع کی دو مثالیں دی جاتی ہے۔ ایک سند متصل سے اور دوسری سند منقطع سے۔

امام بخاری رحمہ اللہ اپنی کتاب الأدب المفرد میں روایت کرتے ہیں:

حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ: حَدَّثَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ قَالَ: حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يُقِمْنَ أَحَدُكُمُ الرَّجُلَ مِنْ مَجْلِسِهِ ثُمَّ يَجْلِسُ فِيْهِ وَلٰكِنْ تَفَسَّحُوْا وَتَوَسَّعُوْا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کہ تم میں کوئی بھی کسی کو اس کی جگہ سے مت اٹھائے اور خود بیٹھ جائے۔ بلکہ کھل جاؤ اور وسعت پیدا کرو۔

اس حدیث کی سند متصل ہے اور نیچے سے اوپر رسول اللہ ﷺ تک اسے اٹھایا گیا ہے۔ اس لئے یہ مرفوع ہے۔

منقطع کی مثال:

قَالَ ابْنُ مَاجَةَ: حَدَّثَنَا أَبُوبَكْرِ بْنُ أَبِيْ شَيْبَةَ ثَنَا وَكِيْعٌ عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ الْفَضْلِ الْحُدَّانِيِّ عَنْ أَبِيْ جَعْفَرٍ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْحَجُّ جِهَادُ كُلِّ ضَعِيْفٍ۔

یہ حدیث منقطع ہے راوی ابوجعفر محمد بن علی بن الحسین ہے انہوں نے سیدہ ام المؤمنین سے کوئی حدیث سنی ہی نہیں۔

مرفوع حدیث کا حکم: یہ صحیح بھی ہوسکتی ہے اور حسن وضعیف بھی۔

ب۔ موقوف: (Halted)

لغت میں وقف سے اسم مفعول ہے۔ جس کا مطلب ہے روکا ہوا۔ ٹھہرا ہوا۔

اصطلاح میں: امام نووی ؒ التقریب ۱۸۴/۱ میں کہتے ہیں:

الْمَوقُوفُ هُوَ الْمَرْوِيُّ عَنِ الصَّحَابَةِ قَوْلاً لَهُمْ أَوْ فِعْلاً أَوْ نَحْوَهُ مُتَّصِلاً كَانَ أَوْ مُنْقَطِعاً۔

جو خبر صحابہ سے خواہ وہ ان کا قول ہو یا فعل یا اس سے ملتا جلتا ہو۔ ہمیں متصل ملے یا منقطع۔ اسے موقوف کہتے ہیں۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ موقوف: متصل یا منقطع بھی ہوسکتی ہے۔

متصل موقوف کی مثال: مثلاً سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول:

قَالَ الْبُخَارِيُّ: حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ مُوسَى عَنْ مَعْرُوفِ بْنِ خَرَّبُوذٍ عَنْ أَبِي الطُّفَيْلِ عَنْ عَلِيٍّ قَالَ: حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ، أَتُحِبُّونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ۔

یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور متصل سند کے ساتھ ہے۔

منقطع کی مثال: امام احمدؒ نے کتاب الأشربۃ میں لکھا ہے:

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي السَّفَرِ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنْ عُمَرَ قَالَ: الْخَمْرُ مِنْ خَمْسَةٍ، مِنَ الزَّبِيبِ وَالتَّمْرِ وَالشَّعِيرِ وَالْبُرِّ وَالْعَسَلِ۔

حکم: یہ حدیث صحیح، حسن یا ضعیف بھی ہوسکتی ہے۔

نوٹ: موقوف کی اصطلاح جب کسی غیر صحابی کے لئے ہو تو مقید ہو جاتی ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

وَيُسْتَعْمَلُ فِي غَيْرِهِمْ مُقَيَّداً، فَيُقَالُ وَقَفَهُ فُلَانٌ عَلَى الزُّهْرِيِّ وَنَحْوَهُ۔ غیر صحابہ کے لئے یہ اصطلاح مقید مستعمل ہوتی ہے۔ پھر یوں کہا جاتا ہے: کہ فلاں نے اس روایت کو زہریؒ پر وقف کردیا۔ (تدریب ۱۸۴/۱)

موقوف سے متعلق چند مسائل:

۱۔صحابی کی تفسیر: اس کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں:

ا۔اگر اس کی تفسیر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہو تو اس کا حکم مرفوع کا ہوگا۔

ب۔اگر نہ ہو تو وہ موقوف کہلائے گی۔

۲۔صحابی رسول کا یہ کہنا: جیسے: أُمِرْنَا أَوْ نُهِيْنَا أَوْ أُمِرَ النَّاسُ وَنَحْوَهُ أَوْ مِنَ السُّنَّةِ۔ہمیں حکم دیا گیا، ہمیں منع کیا گیا یا لوگ حکم دیے گئے۔یا یہ بھی سنت ہے۔آیا یہ موقوف ہے یا مرفوع؟ علماء کے دو اقوال ملتے ہیں:

ا۔اس کا حکم مرفوع کا ہے۔یہی جمہور محدثین کہتے ہیں اور اکثر اصولی علماء بھی۔جن میں خطیب بغدادی، امام نووی، ابن الصلاح، الشیرازی، ابن قدامہ رحمہم اللہ شامل ہیں۔ابن قدامہؒ نے اس کی تائید میں یہ لکھا ہے کہ یہی اکثریت کی رائے ہے۔اور یہی صحیح ہے۔

ب۔دوسری رائے یہ ہے کہ یہ قول موقوف ہے۔یہ قول اسماعیلی، الصیرفی اور ابن حزم رحمہم اللہ کا ہے۔

مثال: سیدہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول:

أُمِرْنَا أَنْ نُخْرِجَ فِي الْعِيْدَيْنِ الْعَوَاتِقَ۔ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم عیدین میں بالغ لڑکیوں کو بھی لے چلیں۔

اسی طرح ان کا قول:

نُهِيْنَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ۔ہمیں جنازے کے پیچھے چلنے سے منع کیا گیا۔

یا سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول:

أُمِرَ النَّاسُ أَنْ يَكُوْنَ آخِرُ عَهْدِهِمْ بِالْبَيْتِ الطَّوَافُ۔لوگ حکم دیے گئے کہ ان کا آخری عمل حج، بیت اللہ کا طواف ہو۔

اور اگر لفظ سنت کا استعمال کوئی تابعی کرے تو ایک رائے کے مطابق یہ مرفوع ہوگی اور دوسری رائے کے مطابق موقوف۔مگر مرسل حدیث، مرفوع نہیں ہوگی۔جیسے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبۃ بن مسعود کا کہنا:

السُّنَّةُ أَنْ يَخْطُبَ الْإِمَامُ فِي الْعِيْدَيْنِ خُطْبَتَيْنِ يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا بِجُلُوْسٍ۔سنت یہ ہے کہ امام عیدین میں دو خطبے دے اور ان کے درمیان بیٹھ کر فرق کرے۔(عبید اللہ فقہاء سبعہ میں سے ہیں۔دیکھئے: الإرشاد از خلیلی: ۱۶۰،

تدریب الراوی ۲/۳۴۵) یا:

قَالَ أَنَسٌ: مِنَ السُّنَّةِ إِذَا تَزَوَّجَ الْبِكْرَ عَلَى الثَّيِّبِ أَقَامَ عِنْدَهَا سَبْعاً۔ (متفق علیہ) سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ سنت ہے کہ جب کوئی دوسری شادی کسی کنواری سے کرے تو اس کے پاس سات دن رہے۔

۳۔صحابی کا یہ کہنا : كُنَّا نَفْعَلُ كَذَا أَوْ كُنَّا نَقُولُ كَذَا۔ ہم یہ کیا کرتے یا ہم یہ کہا کرتے۔

اس میں علماء حدیث کا اختلاف یہ ہے کہ کیا اسے موقوف سمجھا جائے یا مرفوع؟ چنانچہ تین آراء یہ ہیں:

أ۔ اگر صحابی اپنے قول کو رسول اکرم ﷺ کے زمانہ کی طرف منسوب کرتا ہے تو وہ مرفوع ہے ورنہ موقوف۔ یہ رائے خطیب بغدادی، ابن الصلاح، امام حاکم، امام نووی، امام رازی اور شیرازی کی ہے جو صحیح ہے۔

ب۔ یہ مرفوع ہے خواہ صحابی اپنے قول کو زمانہ رسول ﷺ کی طرف منسوب کرے یا نہ کرے۔ یہ قول امام عراقی، ابن الصباغ اور محمد بن الخطیب الکبری کا ہے۔

ج۔ یہ موقوف ہے خواہ صحابی اپنے قول کو زمانہ رسول ﷺ کی طرف منسوب کرے یا نہ کرے۔ یہ قول ابوبکر اسماعیلی کا ہے۔

مثال: سیدنا جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كُنَّا نَعْزِلُ عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَبَلَغَ ذٰلِكَ نَبِيَّ اللّٰهِ ﷺ فَلَمْ يَنْهَنَا۔ (بخاری ومسلم) ہم زمانہ رسول میں عزل (Coitus interruptus) کرتے۔ آپ ﷺ کو ہمارا یہ عمل جب پہنچا تو آپ ﷺ نے ہمیں منع نہ فرمایا۔

اصول: ابن عدیؒ کہتے ہیں: حسن بن علی بن شبیب کثیر الحدیث محدث تھے۔ ان کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ احادیث کو مرفوع کر دیتے اور متون میں اضافہ بھی۔ یہ عادت بغدادی ثقہ محدثین میں عام ہے کہ وہ موقوف کو مرفوع کرتے، مرسل کو متصل بناتے اور اسانید میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ امام ذہبیؒ لکھتے ہیں: شاید وہ اس لئے ایسا کرتے جب انہیں ان روایات کا رفع اور وصل معلوم ہو۔ یہ رخصت تو ہے مگر مناسب نہیں۔

اصول: ابن ابی فدیک نے محمد بن اسحاق کو دیکھا کہ وہ ایک کتابی سے لکھ رہے تھے۔ اسرائیلیات کی روایت

میں یہ چیز معیوب نہیں۔ آپ ﷺ ہی کا فرمان ہے: حَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: إِذَا حَدَّثَكُمْ أَهْلُ الْكِتَابِ فَلَا تُصَدِّقُوهُمْ وَلَا تُكَذِّبُوهُمْ۔ کوئی کتابی جو بات کرتا ہے اس کے سماع کی اجازت تو آپ ﷺ نے دے دی۔ کیا ہم ان کی میڈیکل یا سائنس پر مبنی باتیں سن کر یقین نہیں کرتے۔ پھر آگے بھی منتقل کرتے ہیں؟ جب کہ یہ باتیں دین ہوتی ہیں اور نہ ہی حجت۔ حجت تو کتاب اللہ ہے یا سنت رسول ﷺ۔

ج۔ **مقطوع:** (Cut-Off) اس کی تعریف یہ کی گئی ہے۔

مَا أُضِيْفَ إِلَى التَّابِعِيِّ فَمَنْ بَعْدَهُ۔ وہ خبر جو تابعی کی طرف یا اس سے نیچے تبع تابعی کی طرف منسوب ہو۔

خواہ اس کی سند متصل ہو یا منقطع۔ امام نوویؒ التقریب میں ۱۹۴/۱ میں لکھتے ہیں:

المَقْطُوعُ: وَجَمْعُهُ الْمَقَاطِعُ وَالْمَقَاطِيْعُ، وَهُوَ الْمَوقُوفُ عَلَى التَّابِعِيِّ قَوْلاً لَهُ أَوْ فِعْلاً۔

مقطوع کی جمع مقاطع یا مقاطیع آتی ہے اور وہ تابعی کے قول یا اس کے فعل پر وقف ہونے کا نام ہے۔

مثال: سیدنا ابن سیرینؒ کا قول:

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوا عَمَّنْ تَأْخُذُونَ دِيْنَكُمْ یہ حدیث، علم دین ہے لہذا دیکھ لیا کرو کہ تم کس سے یہ علم حاصل کر رہے ہو۔

یا امام مالک رحمہ اللہ کا قول:

أُتْرُكْ مِنْ أَعْمَالِ السِّرِّ مَا لَا يُحْسِنُ بِكَ أَنْ تَعْمَلَهُ فِي الْعَلَانِيَّةِ۔ وہ سری اعمال ترک کردو جو تمہیں علانیہ کرتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔

حافظ ابن حجرؒ النزهة: ۱۵۵ میں مقطوع کی وضاحت کے بعد لکھتے ہیں: وَإِنْ شِئْتَ قُلْتَ: مَوقُوفٌ عَلَى فُلَانٍ۔ اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو: یہ حدیث فلاں پر موقوف ہے۔ وہ یہ بھی النزهة ۱۵۴ میں فرماتے ہیں:

فَحَصَلَتِ التَّفْرِقَةُ فِي الاصْطِلَاحِ بَيْنَ الْمَقْطُوعِ وَالْمُنْقَطِعِ، فَالْمُنْقَطِعُ مِنْ مَبَاحِثِ الإِسْنَادِ كَمَا تَقَدَّمَ وَالْمَقْطُوعُ مِنْ مَبَاحِثِ الْمَتْنِ كَمَا تَرَىٰ!!! لہذا مقطوع اور منقطع کی اصطلاحات میں فرق ہو گیا۔ منقطع اسناد کے مباحث سے تعلق رکھتی ہے اور مقطوع متن کے مباحث سے۔ جیسا کہ ان کی تعریفات سے معلوم

ہو گیا ہے۔

موقوف ومقطوع کی اصطلاحات کا أثر کی مصطلح سے تعلق بتاتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ النزھۃ:۱۵۴ میں لکھتے ہیں:

ويُقَالُ لِلأَخِيْرَيْنِ أيِ الْمَوْقُوفُ وَالْمَقْطُوعِ: الأَثَرُ!!! آخری دو یعنی موقوف ومقطوع کو أثر بھی کہا جاتا ہے۔

نوٹ: امام شافعیؒ مقطوع اور منقطع کو ایک ہی شے سمجھتے ہیں۔امام نوویؒ اس کا سبب بتاتے ہیں۔

إِلَّا أَنَّ الشَّافِعِيَّ اسْتَعْمَلَ ذَٰلِكَ قَبْلَ اسْتِقْرَارِ الِاصْطِلَاحِ كَمَا قَالَ فِي بَعْضِ الأَحَادِيْثِ: حَسَنٌ۔ وَهُوَ عَلَى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ۔ مگر امام شافعیؒ نے اس مصطلح کا استعمال اس وقت کیا جب اصطلاحات حدیث متعین نہیں ہوئی تھیں جیسے انہوں نے بعض احادیث کے بارے میں لکھا ہے: یہ حسن ہے۔ جب کہ وہ حدیث شیخین کی شرط کے مطابق ہے۔ التقریب (۱/۱۹۴)

اثری تصنیفات: علماء حدیث نے آثار وموقوف احادیث کو جمع کر کے کتب بھی لکھی ہیں۔مثلاً (تدریب ۱/۱۹۵):

جَمَعَ أبوحَفْصٍ ابْنُ بَدْرٍ الْمَوصِلِيِّ كِتَاباً سَمَّاهُ: مَعْرِفَةُ الْوَقُوفِ عَلَى الْمَوقُوفِ، أَوْرَدَ فِيهِ مَا أَوْرَدَهُ أَصْحَابُ الْمَوْضُوعَاتِ فِي مُؤَلَّفَاتِهِمْ فِيْهَا، وَهُوَ صَحِيحٌ عَنْ غَيرِ النَّبِيِّ ﷺ، إِمَّا عَنْ صَحَابِيٍّ أَو تَابِعِيٍّ فَمَنْ بَعْدَهُ، وَقَالَ: إِنَّ إِيْرَادَهُ فِي الْمَوضُوعَاتِ غَلَطٌ، فَبَيْنَ الْمَوضُوعِ وَالْمَوقُوفِ فَرْقٌ۔ ابوحفص ابن بدر الموصلی نے ایک کتاب معرفة الوقوف علی الموقوف لکھی ہے اس میں اسی قسم کے مواد کو انہوں نے لکھا ہے جو عام طور پر موضوعات پر لکھنے والوں نے جمع کیا ہوتا ہے۔ جب کہ یہ مواد اس صورت میں صحیح ہے اگر وہ غیر نبی سے ہو۔ یا صحابی سے یا تابعی اور اس کے بعد والے سے۔ اور کہا ہے: ان روایات کا موضوعات میں بیان کرنا ہی غلط ہے کیونکہ موضوع اور موقوف میں بڑا فرق ہے۔

نیز موقوف ومقطوع روایات ہمیں ان کتب میں ملیں گی۔ (تدریب ۱/۱۹۵)

وِمِنْ مَظَانِّ الْمَوقُوفِ وَالْمَقْطُوعِ: مُصَنَّفُ ابْنِ أَبِي شَيْبَةَ، وَ عَبدِ الرزاقِ وَتفَاسيرُ ابْنِ جَرِيرٍ، ابْنِ أَبِي حَاتِمٍ وابْنِ الْمُنْذِرِ وَغيرِهِمْ۔ موقوف ومقطوع روایات کا وجود ہمیں مُصَنَّفُ ابْنِ أَبِيْ شَيْبَةَ اور مُصَنَّفُ عَبدِالرَّزَّاقِ میں ہی ملتا ہے یا پھر ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن المنذر کی تفاسیر میں۔

☆☆☆☆☆

باب ۴
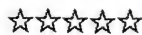
ردو قبول کے اعتبار سے خبر واحد کی اقسام

خبر مقبول اور خبر مردود

خبر واحد اپنی قوت وضعف کی وجہ سے یہی دو قسمیں رکھتی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہیں جیسے فقہاء کے ضعیف وصحیح اقوال ہوتے ہیں اور فقہاء کرام ان میں سے صحیح کا انتخاب کر کے اسے قابل عمل قرار دیتے ہیں جسے وہ مفتی بہا کہتے ہیں اور باقی ضعیف اقوال کو ترک کر دیتے ہیں۔

۱۔ مقبول: جمہور کے نزدیک غلبہ ظن کی وجہ سے جو حدیث صدق میں ترجیح پا جائے وہ مقبول ہوتی ہے۔اور واجب عمل ٹھہرتی ہے۔ایسی صورت میں ہمارے پاس اللہ کے حضور کوئی ایسا عذر نہیں ہوگا کہ ہم اسے ترک کر دیں کیونکہ اس میں صدق کی صفت موجود ہے۔ جو ناقل کی صفت کا ثبوت ہے۔ یہ حدیث اعتقاد میں بھی ہوسکتی ہے اور عمل میں بھی۔ اگر خبر واحد میں اعتقاد کو قبول نہ کریں تو بہت سی دینی چیزیں ہم سے رہ جائیں گی۔ اس کی دو قسمیں ہیں: صحیح اور حسن۔

۲۔ مردود: ایسی حدیث جس کا ناقل یا مخبر غلبہ ظن کی بنیاد پر اپنی سچائی میں ترجیح نہ پا سکے۔ اس لئے یہ رد ہو جاتی ہے اور جمہور محدثین کے نزدیک واجب عمل نہیں ٹھہرتی۔ اصل تو اس کی صفت کذب ہے جو ناقل کی صفت کا ثبوت ہے۔

اس لئے کہ اللہ تعالی نے یہ فرمایا: اس کی تحقیق کر لو۔ اس لئے خبر واحد پر عمل ہوسکتا ہے جب یہ تحقیق ہو جائے کہ اس کے راوی مقبول ہیں یا مردود؟ اس کی سند آیا متصل ہے یا غیر متصل؟ کیا اس کا متن شاذ تو نہیں؟ کیا اس کے متن یا سند میں کوئی علت تو نہیں؟ اس لئے تحقیق کرنے پر کوئی ایسا قرینہ (أَمْرٌ يُشِيْرُ إِلَى الْمَطْلُوبِ کوئی ایسی شے جو مطلوب کی طرف اشارہ کر دے) جو ان دونوں اقسام میں کسی ایک سے جا ملے تو وہ حدیث اس سے ملحق ہو جائے گی۔ ورنہ توقف کرنا ہوگا۔ متوقف حدیث مانند مردود ہو جائے گی اس لئے نہیں کہ اس میں رد ہونے کی صفت تھی بلکہ اس لئے کہ اس میں مقبول ہونے کی صفت مفقود تھی۔

مقبول حدیث کی پانچ اہم شروط

ایسی مقبول حدیث کی توثیق کے لئے محدثین نے پانچ شروط رکھی ہیں تا کہ راوی اور متن دونوں کی تصدیق ہو جائے اور قابل ہو سکے۔

☆...... **متصل** ہو: اس حدیث کی سند میں کہیں کسی راوی کا سقوط نہ ہو۔ بلکہ سند کا ہر راوی اپنے شیخ سے براہ راست روایت کرے اور کہے: حَدَّثَنِي ، یا سَمِعْتُ ، أَنْبَأَنَا، یا رَأَيْتُ فُلَاناً یا عَنْ فُلَانٍ وغیرہ۔ ایسی صورت میں یہ تعریف صحیح، حسن اور ضعیف۔۔ جو بغیر تدلیس کے ہو۔۔ کو شامل ہوگی۔ یہ الفاظ حدیث کی محافل ومجالس، استاذ کی موجودگی، اس سے سماع اور اخذ وتحمل حدیث کے طریقہ کار کو واضح کرتے ہیں۔

اصول: قرون اولی میں غیر متصل سند کو مرسل کہا جاتا تھا۔

اصول: اتصال کے لئے احتمالی الفاظ جیسے: عَنْ فُلَانٍ، قَالَ فُلَانٌ یا فَعَلَ فُلَانٌ وغیرہ درست نہیں۔ اور نہ ہی قابل قبول ہیں۔ ورنہ دوسری یا چودھویں صدی کا کوئی عالم، فقیہ یا ولی بغیر سند کے۔۔ اشارہ، اجتہاد یا خواب کی بنیاد پر۔۔ یہ کہہ دے گا: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ۔ اور لوگ اسے حدیث مان لیں گے۔

☆...... **عادل**: لغت میں لفظ عَدل مصدر ہے۔ جَور کا ضد یہ لفظ ہے۔ طریق عدل وہ راستہ ہوتا ہے جو سیدھا ہو ٹیڑھا نہ ہو۔ عربی میں ٹیڑھا عصا دیکھ کر کہتے ہیں: وَاللّٰه هٰذِهِ عَصَا مَائِلَةٌ مَا هِيَ عَدْلٌ۔ یہ عصا مائل ہے یہ عدل نہیں یعنی سیدھا نہیں۔ اگر یہ سیدھا ہو تو کہتے ہیں: هٰذِهِ عَدْلٌ۔ یہ سیدھا و مستقیم عصا ہے۔ عدل کا اسم فاعل عادل ہے۔ نفس میں جو بات ٹھہر جائے کہ یہی مستقیم ہے اسے عدل کہتے ہیں۔ ایسا راستہ جس کے دونوں اطراف نہ کمی ہو نہ زیادتی اسے بھی وسط وعدل کہتے ہیں۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ امت اسلامیہ بھی اپنے منہج اور عقیدہ کے اعتبار سے تمام امتوں کے مقابلے میں معتدل ہے۔

فقہاء کی اصطلاح میں عَدْلٌ: صیغہ مبالغہ بھی ہے۔ جس سے مراد ایسا راسخ ملکہ جو فرد کو تقوی اور مروئت پر جما دے۔ یہ ملکہ اس وقت نصیب ہوتا ہے جب آدمی کبائر سے اور بعض صغائر ومباح سے بھی مجتنب رہے۔ یا وہ

ایسا متقی شخص ہو جو اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہے اور صاحب مروئت وخیر بھی ہو وہ عادل ہوتا ہے۔

محدثین کی اصطلاح میں: جو راوی مسلمان، بالغ اور عاقل ہو اور فسق کے تمام اسباب وذرائع سے محفوظ ہو۔ نیز خلاف مروئت کاموں سے بھی وہ بچا ہوا ہو۔ وہ عادل ہے۔ اپنے فسق کی وجہ سے فاسق اپنے ضمیر سے انصاف نہیں کر سکتا اس لئے وہ عادل ہو ہی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی صاحب مروئت۔ اس لئے روایت کا استحقاق عادل کو حاصل ہے نہ کہ فاسق کو۔

عدالت کبائر یعنی شرک وکفر، فسق یا بدعت سے مجتنب رہنے اور صغائر پر اصرار نہ کرنے اور خلاف مروئت کاموں سے بچنے کا نام ہے۔ یہی تقوی بھی ہے۔ شرک تو واضح گناہ ہے اور مشرک میں استقامت کہاں؟ رہا فسق یہ بھی غیر مستقیم عمل ہے مگر استقامت کی نفی اس میں مقید ہوتی ہے۔ بدعتی بھی غیر عادل ہیں۔ اگر بدعت غیر مفسقہ کسی عالم سے ہو جاتی ہے تو دیانۃً ایسے عالم کو رد نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہر عالم میں کچھ نہ کچھ بدعت ہوا کرتی ہے۔

مروئت ایسا کام جو لوگوں کی نظر میں خوبصورت بن جائے اور جس سے غلط اور برے کام ختم ہو جائیں۔ جو کام خوبصورت اور باعث زینت ہو وہی مروئت ہے اور عرف میں جو برا اور گندا کام ہو وہ مروئت کے خلاف ہے۔ مثلاً: کسی معاشرے میں مرد عورتوں کے کپڑے پہن لیں یا عورتیں مردوں والے کپڑے پہن لیں تو یہ مروئت نہیں اور نہ ہی یہ دین ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے: لَعَنَ الرِّجَالَ الْمُتَشَبِّهِيْنَ بِالنِّسَاءِ۔ ان مردوں پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں سے مشابہت کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک وقت تھا کہ بازار میں کوئی کچھ کھا رہا ہے تو اس کی مروئت ساقط ہو جاتی تھی۔ یا سگریٹ پیتا یا رشوت لیتا اس کی مروئت بھی ختم ہو جاتی تھی۔ مگر اب سب کچھ ہوتا ہے۔ لوگ غلط وصحیح یا حرام وحلال میں تمیز نہیں کر پاتے۔

راوی کی یہ عدالت دو چیزوں سے معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ **تعدیل:** علماء جرح وتعدیل میں کسی نے اسے عادل قرار دیا ہو۔ دو علماء کی شرط درست نہیں۔

۲۔ **شہرت واستفاضہ:** اہل علم کے ہاں اس کی عدالت وثقاہت ایسی عام ومشہور ہو کہ اسے کسی معدل کی

ضرورت نہ رہے۔ وہ مجالس علمیہ میں شرکت کرنے، ثقہ وعادل اہل علم کی رفاقت اور درست روایت میں معروف ہو۔اس کی توثیق علماء نے کی ہو۔ جیسے امام بخاری ومسلم وغیرہ۔

۳۔راوی غیر معروف سا ہو۔یعنی مجہول ہو۔اس کی دو قسمیں ہیں۔مجہول العین اور مجہول الحال۔

مجہول العین: وہ راوی ہے جس سے ایک آدھ نے روایت کی ہو مگر کسی نے اس کی نہ توثیق کی ہو نہ جرح۔ایسا راوی شدید ضعف کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور مبہم کے حکم میں آجاتا ہے۔

مجہول الحال: وہ راوی ہے جس کی ذات وشخصیت تو معلوم ہو مگر اس پر کسی نے جرح کی ہوتی ہے نہ تعدیل۔ایسے راوی کا ضعف احتمالی (expected) ہوا کرتا ہے اس لئے اس کی حدیث اعتبار (ریفرنس) کے لئے لکھ لی جاتی ہے۔

۴۔ راوی، بدعتی، فاسق اور غیر متقی ہو۔علماء حدیث اس سے احتجاج کے حکم کے بارے میں مختلف الرائے ہیں جس کی تفصیل آپ بدعتی راوی کے باب میں پڑھیں گے۔

۵۔راوی، صاحب مروئت نہ ہو۔مروئت نام ہے اسلامی اخلاق وکردار کے اظہار کا اور لحاظ کا۔راوی حدیث معمولی اخلاق میں اپنے آپ کو حدیث کے مطابق نہیں ڈھالتا تو اس سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ حدیث کی روایت وتفہیم کے بارے میں سنجیدہ ہوگا۔

۶۔ راوی صغیرہ گناہوں کے کرنے پر مصر ہو۔ایسا نہ ہو کہ صغیرہ گناہوں میں لت پت ہوتا رہے کہ وہ کبیرہ کا درجہ حاصل کرلے۔عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان کمزوریوں سے پاک ہو۔

☆...... **ضابط:** لغت میں ضبط کسی شے کو لازم کرلینا اور اسے روک لینا۔ کے ہیں۔ جیسے: ضَبَطَ الشَّيْءَ۔ اس نے شے کو ضبط کیا یعنی اسے پختگی سے یاد کرلیا۔ اسی طرح الرَّجُلُ ضَابِطٌ۔ سے مراد یہی ہے کہ وہ پختگی والا (Accurate) ہے۔

محدثین کی اصطلاح میں ضابط وہ ہے جو حدیث بیان کرتے وقت اپنے حفظ میں رہنے والی عبارت کا محافظ ہو۔اور اگر اپنی کتاب سے روایت کررہا ہے تو وہ اس میں بھی بخوبی ضابط ہو۔اور اگر بالمعنی روایت کررہا ہے تو اس کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ جو معنی وہ پیش کررہا ہے اسے بخوبی جاننے والا بھی ہو۔ یہ ضبط **دو قسم** کا ہوتا ہے:

۱۔ ضبط صدر: حفظ کے ذریعے ۲۔ضبط کتاب: کتابت کے ذریعے

ضبط صدر: جو الفاظ حدیث یا معنی حدیث شیخ سے سنے انہیں نہ صرف یاد کرنا بلکہ وقت ضرورت انہیں بغیر کمی وبیشی کے ویسا ہی سنا دینا۔یعنی الفاظ کا خیال بھی ہو اور صحیح معنی کی ادائیگی کا بھی۔اسے ضبط صدر کہتے ہیں۔ایسا ضابط عربی زبان کا ماہر بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ لفظ کا مدلول یعنی مرادی معنی جانتا ہے اور مترادفات (synonyms) میں تفاوت (variation) کو بھی۔کیونکہ فقہی احکام الفاظ حدیث سے اخذ ہوتے ہیں۔ نیز راوی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مقاصد شریعہ (The Objectives of Islamic Law) اور ان کے اہداف (Objectives) کا عالم بھی ہو۔تاکہ وہ حرام کو حلال یا حلال کو حرام نہ کردے۔

ضبط کتاب: راوی نے اپنے شیخ سے جو احادیث یا واقعات واخبار سنے انہیں خود لکھنے کے بعد شیخ سے تصحیح کرالی ہو۔اور اپنے پاس اس کتاب کو محفوظ مقام پر رکھا ہوتا کہ کسی کے ہاتھ آ کر اس میں کوئی تبدیلی، یا تحریف یا کمی وبیشی نہ ہو پائے۔ایسے نسخہ سے وہ جب چاہے حدیث صحیح سنا بھی سکے۔یہ اصول ایسی کتب کے لئے نہیں جو مشہور ہو کر ہر ایک کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں۔جیسے صحیح بخاری جسے بہت سے شراح نے ضبط کیا ہے۔

ضبط پہچاننے کے اصول: راوی کے درجہ ضبط واتقان کو جاننے کے لئے۔

۱۔ اگر راوی حدیث اپنی روایت میں ثقہ راویوں کی موافقت کرتا ہے اور نادر ہی ان کی مخالفت کرتا ہے تو یہ راوی رواۃ میں اعلی درجے کا تام الضبط مرتبے کا ہے۔اور اس کی حدیث صحیح لذاتہ کہلائے گی۔

۲۔اگر ثقات کی بیشتر روایات کی راوی موافقت کرتا ہے اور بعض میں مخالفت تو یہ پہلے راوی کے مقابلے میں ضبط میں ذرا کم درجے کا راوی ہوگا اور اس کی حدیث حسن لذاتہ کے مرتبہ کی ہوگی۔بشرطیکہ اس کا کوئی متابع نہ ہو۔

۳۔اور اگر راوی روایت حدیث میں ثقات کی بکثرت مخالفت کرتا ہے تو یہ نچلے درجے کا ضعیف راوی ہوگا اس کی حدیث ضعیف ہو کر رد کر دی جائے گی۔بشرطیکہ اس کا کوئی متابع نہ ہو ورنہ اس کی حدیث حسن لغیرہ درجہ کو پہنچ جائے گی۔

۴۔اگر راوی ثقات کی بھر پور مخالفت کرتا ہے اور بہت کم میں موافقت، تو ایسا راوی خطا سے پُر اور کھلم کھلا غلط ہے اس کی حدیث اس کے حافظے میں خرابی کی وجہ سے ترک کردی جائے گی۔اس قسم کے راوی کی احادیث مخالفت اور غلطیوں میں مختلف درجات کی ہوتی ہیں جن کا تذکرہ گذر چکا ہے۔

۵۔معتبر محدثین اسی ضبط کا امتحان لے کر راوی حدیث کا وزن قائم کرتے پھر اسے ضابط قرار دیتے تھے۔امام بخاری رحمہ اللہ ہوں یا ان کے مشائخ ان سب کے ضبط کا امتحان مختلف انداز سے لیا گیا۔کسی نے اسانید ومتون کو ایک دوسرے میں ضم کر کے ضبط کا امتحان لیا اور کسی نے ہر دس احادیث کے بعد اپنی طرف سے ایک حدیث کا اضافہ کر کے لیا۔جس سے راوی کی علمی پختگی اجاگر ہوتی اور شان بھی۔لوگ بھی اس کے علم وفضل کے معترف ہوتے۔

اصول:

☆......تین شروط (اتصال، عدالت اور ضبط) کا تعلق اسناد سے ہے۔جو ایجابی ہیں یعنی ان کا ہونا لازمی ہے۔اور باقی دو شرطیں ۔۔عدم شذوذ وعدم علت ۔۔ سلبی ہیں مراد یہ کہ ان کا نہ ہونا شرط ہے۔

☆......ان تمام صفات کے لئے حَدَّثَنَا، أَخْبَرَنَا، أَنْبَأَنَا،یاسَمِعْتُ، حَدَّثَنِي، أَخْبَرَنِي، أَنْبَأَنِي جیسے الفاظ ہیں۔کبھی ثقہ راوی لفظ عَنْ بھی استعمال کرتا ہے جسے وہ عموماً کسی اور روایت میں مطلوبہ الفاظ کے ساتھ واضح کر دیتا ہے۔مگر سند میں مسلسل لفظ عَنْ یا لفظ قَالَ اور أَنَّ کا استعمال صحت کی مطلوبہ شرائط کو پورا نہیں کرتے۔

☆......**عدم شذوذ: شذوذ:** عربی میں جمہور سے ہٹ کر کوئی منفرد قول وعمل پیش کرنے کو کہتے ہیں۔

اصطلاحاً:

مُخَالَفَةُ الرَّاوِي فِي رِوَايَتِهِ مَنْ هُوَ أَرْجَحُ مِنهُ عِندَ تَعَسُّرِ الْجَمْعِ بَيْنَ الرِّوَايَتَيْن۔ راوی اپنی روایت میں اپنے سے زیادہ راجح سے مخالفت کرے کیونکہ دو روایتوں کے مابین موافقت یا جمع کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مثلاً: اگر ایک راوی دو کا مخالف ہو تو ایک اور دو میں کون سا شاذ ہوا؟ ایک ہوگا۔اسی طرح اگر ایک راوی یادداشت میں کمزور ہو اور دوسرا قوی، دوسرا راوی اب اپنی صفت حفظ میں راجح ہوگا۔مخالفت سے مراد یہ نہیں کہ

حدیث پر ضعف یا نسخ کا حکم لگا دیا جائے بلکہ اس سے مراد دوسرے کا راجح ہونا ہے۔

مگر علماء اصول اپنا یہ اصول نافذ کرتے ہیں: اَلْمُثْبِتُ مُقَدَّمٌ عَلَى النَّافِيْ ثابت کرنے والا نفی کرنے والے سے مقدم ہوگا۔(فتح المغیث ۱/۱۹) اس لئے وہ روایت قبول کر لیتے ہیں اور محدثین اسے شاذ کہتے ہیں۔ کیونکہ راوی اوثق کی مخالفت کرتا ہے۔ اور ایسی صورت میں دونوں احادیث میں موافقت کیسے ہو سکتی ہے؟

☆...... **عدم علت:** علت عربی میں مرض کو کہتے ہیں۔ عدم علت سے مراد یہ ہے کہ وہ کسی بھی قسم کے مرض سے پاک ہو۔

اصطلاحاً:

هِيَ فِي الأَصْلِ سَبَبٌ خَفِيٌّ قَادِحٌ فِيْ صِحَّةِ الْحَدِيْثِ، مَعَ أَنَّ ظَاهِرَهُ السَّلاَمَةُ مِنْهُ۔ كَوَهْمِ الثِّقَةِ وَمَا شَابَهَهُ مِنْ وَصْلِ الْمُرْسَلِ، أَوْ رَفْعِ الْمَوْقُوْفِ، وَقَدْ تُطْلَقُ عَلَى الظَّاهِرِ مِنْهُ مِثْلَ الإِرْسَالِ وَالتَّدْلِيْسِ وَالانْقِطَاعِ وَالتَّعْلِيْقِ وَالإِعْضَالِ فِي السَّنَدِ وَمِثْلَ مُخَالَفَةِ الْحَدِيْثِ لِلْقُرْآنِ، أَوْ لِلْحَدِيْثِ الثَّابِتِ، أَوْ لِلْعَقْلِ السَّلِيْمِ، أَوْ لِلتَّارِيْخِ الثَّابِتِ أَوْ لِلْحَقَائِقِ وَالتَّجَارِبِ الْعِلْمِيَّةِ فِي الْمَتْنِ۔ علت دراصل حدیث میں چھپا ایک مخفی سبب ہے جو بظاہر اپنی سلامتی کے صحت حدیث پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جیسے ایک ثقہ کا وہم کرنا، یا اس سے مشابہ وہم جیسے مرسل کو موصول بنالینا، یا موقوف کو مرفوع کر دینا۔ کبھی ظاہری عیب پر بھی یہ لفظ چسپاں ہوتا ہے جیسے۔ سند میں ارسال، تدلیس، تعلیق یا اعضال وغیرہ کا ہونا۔ یا حدیث کا مخالف قرآن ہونا، یا ثابت شدہ حدیث کے مخالف ہونا یا عقل سلیم، ثابت شدہ تاریخ کے مخالف ہونا۔ یا پھر علمی حقائق اور تجربات کے خلاف متن کا ہونا وغیرہ۔

یہ مخفی عیب حدیث کو ناقابل حجت بنا دیتا ہے۔ یہ علت اثنائے تخریج وتحقیق معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر وہ حدیث صحیح وسلامت نظر آتی ہے۔ مثلاً: ایک حدیث، سند مرفوع کے ساتھ مروی ہو اور وہی موقوف بھی ہو۔ اور موقوف، مرفوع کی نسبت زیادہ صحیح ہو۔ ایسی صورت میں وقف کے ذریعے مرفوع روایت، معلول ہوگی اور حدیث، کلام نبی ﷺ نہیں بنے گی۔ یا وہ حدیث منقطع یا موقوف ہو یا اس کا راوی فاسق یا مبتدع داعی ہو یا برے حافظہ کا مالک ہو۔ اس

صورت میں حدیث معلول ہوگی نہ کہ صحیح ۔ کیونکہ وہ علت قادحہ سے محفوظ نہیں رہی۔ سند کی طرح یہ علت متن میں بھی ہوتی ہے اور کبھی سند کی علت متن میں قدح پیدا کر دیتی ہے۔

اصول:

☆......عدم شذوذ اور عدم علت کی شرط محدثین کی ہے۔ فقہاء کی نہیں۔ اس علم کی ضرورت فقیہ، اصولی اور مفسر کو ہے۔ اس لئے یہ غیر محدثین پر تو حجت ہے مگر محدثین پر نہیں۔

☆......محدثین تو اس روایت کو بھی معلول قرار دیتے ہیں جسے ایک ہی راوی اولاً مرفوع روایت کرے اور بعد میں اسے دوسری اسانید سے موقوف یا مرسل روایت کر دے۔ کیونکہ وہ اسے راوی کا سہو یا جہل سمجھتے ہیں۔ پھر بھی وہ قرائن دیکھ کر حتمی اور ترجیحی فیصلہ کرتے ہیں۔ یہی محقق محدثین کا نقطہ نظر ہے۔ رہے علماء اصول تو وہ ایسے راوی کی حدیث قبول کر لیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ جب راوی کے نزدیک یہ خبر صحیح ہے اور اس کا ایک فتوی اس روایت کے عین مطابق ہے جو اس نے آپ ﷺ سے کی تھی تو اس میں کیا قباحت ہے؟

☆......چونکہ حدیث میں علت ظاہر نہیں بلکہ ہمیشہ مخفی ہوتی ہے۔ اس لئے محدثین ان دو مصطلحات حَدِيثٌ صَحِيحٌ اور حَدِيثٌ إِسْنَادُهُ صَحِيحٌ میں فرق کرتے ہیں۔ پہلی حدیث کو وہ صحیح اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس میں علت نہیں جب کہ دوسری اصطلاح میں علت ہونے کا احتمال ہے۔ (مقدمہ علوم الحدیث:۳۵)

☆......صحیح حدیث کی پانچ شرائط میں سند و متن کا روایتی اور درایتی مطالعہ بھی ہے۔ جس کے بغیر حدیث کا قبول کرنا یا اسے رد کرنا غیر علمی کوشش ہوگی اور اس کے بغیر مسائل فقہ کشید کرنا بھی فقہ اسلامی کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

☆......ان پانچ شرطوں میں سے کوئی ایک موجود نہ ہو تو اس حدیث کو صحیح نہیں کہا جائے گا۔

ان شروط کے فوائد:

ان پانچوں شروط کا فائدہ یہ ہے کہ صحیح حدیث پھر:

۔ روایت و درایت۔ خواہ کسی کی ہو۔ دونوں کو اپنی شروط کے تابع کر دیتی ہے۔

۔ اصول فقہ ہوں یا فقہ اسلامی دونوں کے صحیح و غیر صحیح ہونے کا تعین یہ خود کرتی ہے۔

۔مرسل، معضل اور شاذ احادیث یا ایسی حدیث جس میں علت قادحہ ہو یا اس کے رواۃ میں جرح ہو ان سب سے صحیح حدیث کی یہ شروط پرے ہیں۔

۔امام ابن الصلاحؒ فرماتے ہیں: اہل علم نے اتفاق سے ایسی حدیث کے بارے میں صحیح ہونے کا فیصلہ دیا ہے۔

اصول: امام خطیبؒ بغدادی الکفایۃ: ۲۰ میں لکھتے ہیں: امام ذہبیؒ فرماتے ہیں:

وَلَا يَجُوزُ الِاحْتِجَاجُ إِلَّا بِالْحَدِيثِ الْمُوصِلِ غَيرِ الْمُنْقَطِعِ الَّذِيْ لَيسَ فِيهِ رَجُلٌ مَجْهُولٌ، وَلَا رَجُلٌ مَجْرُوحٌ۔ صرف وہی حدیث قابل احتجاج ہوگی جو متصل ہو، منقطع نہ ہو، اس میں کوئی راوی مجہول ہو اور نہ ہی مجروح۔

قتادہؒ کہتے ہیں:

یہ کوئی حدیث نہیں جو صالح کسی طالح سے اور طالح کسی صالح سے روایت کررہا ہو بلکہ صالح کو صالح سے آخر تک روایت کرنا ہوگا۔

احمدؒ بن زید بن ہارون کہتے ہیں:

إِنَّمَا هُوَ صَالِحٌ عَنْ صَالِحٍ ، وَصَالِحٌ عَنْ تَابِعٍ ، وَتَابِعٌ عَنْ صَاحِبٍ وَصَاحِبٌ عَنْ رسولِ اللهِ ﷺ عَنْ جِبْرِيْلَ ، وَجِبْرِيْلُ عَنِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ۔ بلکہ صحیح حدیث کی سند صالح صالح سے اور صالح تابعی سے اور تابعی صحابی سے اور صحابی رسول اللہ ﷺ سے اور رسول اللہ ﷺ جبریل سے اور جبریل اللہ عزوجل سے ہوگی۔

اصول: روایت حدیث ندا و اذان کی مانند ہے جس میں اجتہاد نہیں چلتا۔ محدثین نے سند کو دیکھا اور پرکھا بلکہ بسا اوقات خود جا کر ملے بھی۔ اس لئے جو چیز موجود ہے وہ اجتہاد نہیں اور جس کی بنیاد ہی نہیں اور کوئی یوں کہہ دے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ یا فلاں بزرگ نے فرمایا۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ وہاں تو سند چلے گی۔

اصول: اگر روایت محتمل صیغوں سے مروی ہو یعنی یہ محسوس ہو کہ اس نے حدیث سنی بھی ہے یا نہیں؟ جیسے:

عَنْ،أَنَّ، حَدَّثَ، أَخْبَرَ یاقَالَ ۔وغیرہ کے الفاظ۔تو ایسی صورت میں راوی میں تین شروط کا ہونا بہت ضروری ہے تاکہ اس کے مستعمل محتمل صیغہ کو اتصال کا درجہ دیا جاسکے۔

حکم: محدثین ،فقہاء اور علماء اصول کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ ایسی صحیح حدیث پر عمل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے اور ایسی حدیث شرعی دلائل میں سے ایک دلیل اور حجت ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

مقبول احادیث اور ان کی اقسام

یہ کل چار قسمیں ہیں: صحیح۔حسن۔محفوظ۔معروف

ا۔ حدیث صحیح اور اس کی اقسام: بعض علماء حدیث نے صحیح کی دو قسمیں بیان کی ہیں: صحیح لذاتہ اور صحیح لغیرہ

حدیث صحیح لذاتہ:

هُوَخَبَرُ الْوَاحِدِ، الْمُسنَدِ الْمُتَّصِلِ إِسْنَادُهُ، بِنَقْلِ الْعَدْلِ الضَّابِطِ، عَنِ الْعَدْلِ الضَّابِطِ، حَتّٰى يَنْتَهِيَ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَ لَا يَكُونُ شَاذًّا وَلَا مُعَلَّلًا (مقدمۃ ابن الصلاح:۱۱) ایسی خبر واحد جس کی سند متصل ہو، جسے شروع سے لے کر آخیر تک عادل اور ضابط راوی نقل (روایت) کرتے ہوں، جس میں کوئی شذوذ ہو اور نہ ہی کوئی علت۔

اسے لذاتہ اس لئے کہا گیا کیونکہ اس حدیث نے اپنی صحت کو اپنی سند اور متن سے اخذ کیا ہے نہ کہ خارج سے۔

متقدمین میں صحیح کی مثال دیکھنا ہو تو امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قاعدہ قابل غور ہے: إِذَا رَوَى الثِّقَةُ عَنِ الثِّقَةِ حَتّٰى يَنْتَهِيَ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَهُوَ ثَابِتٌ۔

مثال: صحیح بخاریؒ (۱۸/۴) میں (كِتَابُ الجِهَادِ وَالسِّيَرِ، بَابُ مَا يُعَوَّذُ مِنَ الْجُبْنِ) یہ روایت ہے:

حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ، حَدَّثَنَا مُعْتَمِرٌ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبِي، قَالَ : سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ۔رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ۔ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقُولُ:اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ، وَالْجُبْنِ وَالْهَرَمِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ، وَأَعُوذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ۔

یہ مثال، صحیح حدیث کی تمام شرائط کو پورا کرتی ہے۔ وہ اس طرح:

ا۔اس کی سند نبی ﷺ تک مسلسل ہے۔

۲۔سند اپنی ابتداء سے لے کر آخر تک متصل ہے: انسؓ بن مالک صحابی رسول ہیں انہوں نے نبی ﷺ سے یہ حدیث سنی۔سلیمان بن طرخان۔معتمر۔کے والد ہیں انہوں نے بصراحت یہ کہا ہے کہ میں نے سیدنا انسؓ سے یہ حدیث سنی ہے۔اسی طرح معتمر بھی اپنے والد سے حدیث سنتے ہیں اسی طرح امام بخاریؒ کے شیخ مسدد بھی بوضاحت کہہ رہے ہیں میں نے معتمر سے حدیث سنی۔اور خود امام بخاری اپنے شیخ سے حدیث سننے کی صراحت فرما رہے ہیں۔سب اپنے اپنے شیخ سے ملے بھی ہیں اور ان کا زمانہ بھی پایا ہے۔

۳۔عدالت وضبط، صحابی رسول سیدنا انسؓ سے لے کر حدیث کے ذکر کرنے والے امام بخاری تک۔تمام راویوں میں یہ دونوں وصف موجود ومیسر ہے۔

......انس بن مالک۔رضی اللہ عنہ۔صحابی رسول ہیں اور الصَّحابَةُ کُلُّهُمْ عَدُولٌ تمام صحابہ عادل ہوتے ہیں۔یعنی وہ آپس میں لڑ سکتے ہیں مگر حدیث رسول نہیں گھڑ سکتے۔

......سلیمان بن طرخان۔معتمر کے والد۔ایک ثقہ وعابد فرد ہیں۔

......ان کا بیٹا۔معتمر۔خود ایک عالم وثقہ راوی ہیں۔

......مسدد بن مسرہد، حافظ حدیث اور انتہائی ثقہ راوی ہیں۔

......امام بخاری، وما أدراك ماالبخاری؟ بس جس حدیث کو قبول کرلیں وہ صحیح اور جسے رد کردیں وہ گئی گذری۔خود صاحب کتاب الجامع الصحیح ہیں۔امیر المومنین فی الحدیث اور حفظ حدیث کا مضبوط وبلند وبالا پہاڑ ہیں۔

۴۔اسی طرح یہ حدیث شاذ بھی نہیں۔

۵۔ اور نہ ہی اس کے متن میں کوئی علت ہے کیونکہ اس کا ہر راوی تو عادل ہے۔

یہ حدیث چونکہ صحت حدیث کی پانچوں شرائط کو پورا کرتی تھی اس لئے امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں اسے لکھا۔

صحیح حدیث کے درجات

یہ یاد رکھئے! تمام صحیح احادیث ایک درجے کی نہیں ہیں۔ امام ابن الملقنؒ کہتے ہیں: صحت اور قوت صحت کے اعتبار سے صحیح حدیث کے اوپر تلے مختلف درجات ہیں۔ جس کی وجہ رواۃ اسناد ہیں ان میں ایک ثقہ ہے تو دوسرا **اوثق**، یا ضابط ہے تو دوسرا **اضبط** یا ایک عادل ہے تو دوسرا **اعدل**۔ اس لئے یہ سب یکساں نہیں۔ نیز شاگرد بھی اپنے شیخ سے مستفید ہونے میں یکساں نہیں ہوتے۔ یہی ترجیح صحیحین میں اختلاف کی صورت میں ہوگی۔ ایمان وتقوی میں بھی سب مومن برابر نہیں۔ فاسق کبیرہ اور فاسق کبیر تین برابر نہیں اسی طرح سب احادیث، صحت میں برابر درجہ کی نہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ راوی میں جس قدر قوی اوصاف ہوں گی اس قدر روایت بھی صحیح ترین ہوگی۔
صحیح حدیث کو علماء حدیث نے سات درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ جو حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہو وہ اعلی درجہ کی صحیح حدیث ہے۔ اسے **متفق علیہ** کہا جاتا ہے گو ان کی سند الگ ہوتی ہے اور متن ایک جیسا ہو۔ کوئی حدیث اس سے اعلی درجے کی نہیں ہوسکتی۔ اور نہ ہی اس کے ہوتے ہوئے کسی حدیث کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔

۲۔ دوسرا درجہ اس حدیث کا ہے جسے صرف امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں روایت کیا ہو۔ اس لئے کہ صحیح بخاری صحت کے اعتبار سے دیگر تمام حدیثی کتب پر فوقیت رکھتی ہے۔ دوسرا درجہ اس لئے ہے کہ شیخین میں جب اختلاف ہو تو پھر کسے ترجیح دی جائے؟ یہاں حدیث صحیح بخاری کو ہی حدیث صحیح مسلم پر ترجیح دی جائے گی۔ یہ **افراد بخاری** کہلاتی ہے۔

۳۔ تیسرا درجہ **افراد مسلم** کا ہے یہ وہ حدیث کا ہے جسے صرف امام مسلم اپنی صحیح میں روایت کریں۔ اس لئے کہ صحت حدیث کے لئے امام مسلم محترم کی شرائط امام بخاریؒ کی شرائط کے بعد سب سے زیادہ سخت ہیں۔

۴۔ چوتھے درجے کی وہ حدیث ہے جو صحیحین کی شرائط (**صحیح علی شرطھما**) کے مطابق روایت ہوئی ہو مگر دونوں میں سے کسی نے اسے روایت نہ کیا ہو۔ یہ شرط حدیث کے رجال اور اس کے اتصال سے پہچانی جائے گی۔ یہ ترجیح اور درجہ اس لئے بھی ہے کہ دیگر کتب کے مقابلے میں علماء امت نے بخاری ومسلم کی احادیث کو شرف قبولیت بخشا ہے۔

۵۔ پانچواں درجہ اس حدیث کا ہے جو ان سخت شرائط پر پورا اترتی ہو جو صرف امام بخاری محترم نے (**صحیح علی شرط البخاری**) اپنی کتاب میں صحیح احادیث کے انتخاب میں ملحوظ رکھیں۔

۶۔ چھٹا درجہ اس حدیث کا ہے جو امام مسلمؒ کی (**صحیح علی شرط مسلم**) ان شرائط کے مطابق ہو جو انہوں نے راوی کے بارے میں اپنی کتاب میں احادیث لکھتے وقت ملحوظ رکھیں۔

۷۔ ساتواں اور آخری درجہ اس صحیح حدیث کا ہے جو بخاری و مسلم کے سوا (**صحیح علی شرط غیرہما**) دیگر محدثین کی شروط کے مطابق ہو۔ اور جسے کوئی قابل اعتماد امام حدیث صحیح قرار دے دے۔ (تدریب الراوی: ۶۳)

نوٹ: اس ترتیب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تعارض کے وقت کس حدیث کو مقدم کرنا ہے۔ لیکن جب تعارض نہ ہو تو پھر ان تمام احادیث کا درجہ اپنا اپنا ہی ہوگا۔

بعض احادیث کے صحیح ہونے پر علماء کا اختلاف:

امام نوویؒ لکھتے ہیں جس حدیث میں یہ پانچ شروط ہوں گی وہ محدثین کے ہاں بلا اختلاف صحیح ہوگی۔ رہی وہ حدیث جس کی صحت میں ان کے مابین اختلاف ہو اس کے اسباب یہ ہو سکتے ہیں:

۱۔ ان پانچ شرائط میں کوئی شرط اس میں نہ ہو۔ یعنی ان کے مابین اس شرط میں اختلاف ہو۔ مثلاً بعض راوی مستور ہوں یا حدیث مرسل ہو۔

۲۔ کیا حدیث میں سبھی شرطیں موجود ہیں یا کوئی رہ گئی ہے؟ اس میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے اور اغلب یہی ہے۔ جیسے حدیث کے رواۃ میں یہ اختلاف کہ آیا یہ صحیح کی شرط پوری کرتا ہے؟ یا رواۃ حدیث میں سبھی ثقات ہیں مگر ان میں سہیل بن ابی صالح، یا العلاء بن عبدالرحمٰن یا حماد بن سلمہ ہیں ان کی روایت کے بارے میں محدثین کہتے ہیں: یہ حدیث شرط مسلم کے مطابق صحیح ہے۔ اور بخاری کی شرط کے مطابق صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان علماء کے نزدیک یہ راوی ان رواۃ میں سے ہیں جن میں صحیح حدیث کی تمام معتبر شرائط موجود ہیں مگر امام بخاری کے نزدیک ایسی شروط ان میں ثابت نہیں۔ یہی حال امام بخاری کی پیش کردہ بعض احادیث کا ہے جو انہوں نے عکرمہ مولی ابن عباس، عمرو بن مرزوق وغیرہ سے روایت کی ہیں اور ان کی روایت کو بطور احتجاج کے ذکر کیا ہے مگر امام مسلم رحمہ اللہ نے ان کی روایت سے کوئی احتجاج نہیں لیا۔

شیخ احمد شاکرؒ نے الباعث الحثیث (۱/۶۳) میں لکھا ہے: عَمرُو بنُ شُعَیبٍ عَنْ أَبِیهِ عَنْ جَدِّهِ کی روایت أَصَحُّ الأَسَانِیدِ ہے۔ جب کہ کچھ دیگر علماء کا یہ کہنا ہے: هَذَا الإِسْنَادُ لَیْسَ بِشَيْءٍ، ضَعِیفٌ۔ علماء حدیث کا یہ اختلاف

باور کراتا ہے کہ کسی بھی سند کے لئے مطلق اصحیت کا فیصلہ کرنا مناسب نہیں۔

☆......وہ حدیث جو صحیح ہو مگر منسوخ ہو چکی ہو اس پر عمل کرنا صحیح نہیں۔

☆......علماء حدیث میں کچھ ایسے علماء بھی گذرے ہیں جنہوں نے حدیث کو صحیح قرار دینے میں تساہل برتا ہے۔ جیسے امام حاکم رحمہ اللہ۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو تصحیح حدیث میں بڑے متشدد ہیں مگر موضوع احادیث میں تساہل برتتے ہیں جیسے: امام ابن الجوزیؒ۔ اس لئے محدثین یہ کہا کرتے ہیں:

لَا عِبْرَةَ لِتَصْحِيْحِ الْحَاكِمِ وَلَا بِمَوضُوعاتِ ابْنِ الجَوزِيِّ وَلَا بِإِجْمَاعِ ابْنِ الْمُنْذِرِ۔ امام حاکم کی تصحیح، ابن الجوزی کی موضوعات اور ابن المنذر کے دعوی اجماع کا کوئی اعتبار نہیں۔

اس لئے ان حضرات کے تجزیہ حدیث کے بارے میں طلبہ حدیث کو محتاط ہونا چاہئے۔

☆☆☆☆☆

صحیح لغیرہ:

هُوَ الْحَدِيثُ الَّذِي اتَّصَلَ سَنَدُهُ مِنْ أَوَّلِهِ إِلَى آخِرِهِ بِنَقْلِ الْعَدْلِ الَّذِيْ قَلَّ ضَبْطُهُ عَنِ الدَّرَجَةِ الْعُلْيَا، وَلٰكِنَّهُ تُوبِعَ بِطَرِيقٍ آخَرَ مُسَاوٍ أَو رَاجِحٍ، وَلَا يَكُونُ شَاذًا وَلَا مُعَلَّلًا۔ وہ حدیث جس کی سند شروع تا آخر متصل ہو۔ جسے ایسا عادل روایت کرے جس کا درجہ ضبط، درجہ عالیہ سے ذرا کم ہو جائے۔ مگر اس کی متابعت ایک اور مساوی درجہ کی سند سے ہو یا اس سے راجح سند سے ہو۔ نیز وہ شاذ ہو نہ ہی اس میں کوئی علت ہو۔

جس حدیث میں قبولیت کی صفات ہوں مگر اعلی درجہ کی نہ ہوں وہ حسن لذاتہ ہوگی اور اگر اس کی متعدد اسانید (متابعت یا شاہد کی صورت میں) ہوں تو وہ (قوی ہو کر) صحیح لغیرہ بن جائے گی۔ حدیث کی یہ قسم حسن لذاتہ سے اعلی اور صحیح لذاتہ سے کم درجہ کی ہوتی ہے۔ اس میں سند سے نہیں بلکہ کسی اور زیادہ قوی سند کے آنے سے صحت آتی ہے۔ جیسے:

مُحمدُ بْنُ عَمرٍوعَن أَبِي سَلَمَةَ عَن أَبي هُريرةَ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ ﷺ قال: لَولَا أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُم بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلٰوةٍ۔ (السنن للترمذی: كتاب الطهارة)

امام ابنؒ الصلاح اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں: محمد بن عمرو بن علقمہ اپنی دیانت اور سچائی میں مشہور ہیں مگر وہ اہل

اتقان میں سے نہیں۔ بعض علماء حدیث نے حافظہ کی کمزوری کی بناء پر انہیں ضعیف کہا ہے۔ جب کہ بعض نے انہیں صدق اور علمی جلالت کی وجہ سے ثقہ بھی لکھا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی حدیث حسن ٹھہری۔ پھر جب اس حدیث کو دوسری ہم مثل یا اقوی سند یا ذرا کم درجے کی متعدد اسانید مل گئیں اور ان کی تائید حاصل ہوئی تو راوی کے برے حافظہ کا خدشہ جاتا رہا۔ اور معمولی نقص کی کمی بھی اس میں ختم ہوگئی۔ اس طرح یہ اسناد صحیح ہوکر درجہ صحیح تک پہنچ گئی۔ جسے صحیح لغیرہ کہا گیا۔

بہرحال محمد بن عمرو مراتب تعدیل میں چوتھے مرتبہ کے راوی ہیں۔ ان کی حدیث حسن لذاتہ ہوگی اگر کوئی ان کا متابع نہیں تو۔ لیکن اگر کوئی متابع ہے جیسا کہ یہاں ہے تو پھر صحیح لغیرہ کا درجہ پائے گی۔ جس کی تخریج کا خلاصہ یہ ہے:

یہ حدیث صحیح بخاری میں مَالِكٌ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الأَعْرَجِ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ سے کتاب الجمعہ میں مروی ہے۔ وہاں أَوْ عَلَى النَّاسِ کے الفاظ ہیں۔

اسی طرح صحیح بخاری کی كِتَابُ التَّمَنِّي میں بَابُ مَا يَجُوزُ مِنَ اللَّهْوِ میں بہ سند اللَّيْثُ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ رَبِيْعَةَ بْنَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ: سَمِعْتُ أَبَاهُرَيْرَةَ۔ جس میں عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ کے لفظ نہیں۔

صحیح مسلم میں یہ حدیث بابُ السِّوَاكِ میں بطریق سُفْيَانُ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الأَعْرَجِ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ ہے۔

سنن ترمذی میں مذکورہ حدیث بہ سند: أَبُو كُرَيْبٍ حَدَّثَنَا عَبْدَةُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ أَبِي سَلَمَةَ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ۔ مروی ہے۔ ایک اور حدیث سنن ترمذی میں بہ سند مُحَمَّدُ بْنُ إِسْحٰقَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ عَنْ أَبِيْ سَلَمَةَ، عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ۔ سے بھی ہے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں: وَحَدِيْثُ أَبِيْ سَلَمَةَ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ، وَزَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ كِلَاهُمَا عِنْدِيْ صَحِيْحٌ۔ ابوسلمہ کی روایت سیدنا ابوہریرہ اور زید بن خالد سے اور ان کی رسول اللہ ﷺ سے، دونوں میرے نزدیک صحیح ہیں۔ کیونکہ بہت سے طرق سے سیدنا ابوہریرہ کی حدیث روایت ہوئی ہے جو صحیح ہے۔

رہے امام بخاریؒ تو انہوں نے ابوسلمۃ کی حدیث جو زید بن خالد سے روایت کرتے ہیں زیادہ صحیح کہا ہے۔ امام ترمذی زید کی روایت ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ۔

بہرحال اس تخریج میں یہ امر قابل غور ہے کہ محمد بن عمرو کی روایت میں جو متابعت آئی ہے وہ زیادہ قوی ہے۔

صحیح احادیث صحیحین کے علاوہ

صحیحین کے علاوہ کچھ دیگر کتب حدیث بھی ہیں جن میں صحیح احادیث موجود ہیں۔ جیسے صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، یا امام الحاکم کی مستدرک۔ مگر انہوں نے صحیح، حسن اور ضعیف میں امتیاز نہیں کیا۔ اس لئے ان کی کتب میں یہ سبھی احادیث ہیں۔ بطور خاص ابن حبان کو ہی لے لیں تو وہ حدیث کی تصحیح اور رواۃ کی توثیق میں متساہل لگتے ہیں۔ یہی حال امام حاکم کا ہے۔ طے شدہ بات یہی ہے کہ اگر کوئی معتمد امام کسی ایسی حدیث کے بارے میں جو صحیحین کے سوا دیگر کتب میں ہو یہ کہہ دے کہ یہ صحیح ہے تو ہم اسے صحیح کہیں گے۔ محض کسی کتاب میں حدیث کا ہونا اس کی صحت کے لئے کافی نہیں۔ جیسے سنن ابوداؤد وغیرہ۔ کیونکہ ان تمام مؤلفین نے صحیح، حسن اور ضعیف روایات بیان کی ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان کتب میں صحیح حدیث کی معرفت کے لئے کہ خود صاحب کتاب حدیث کو صحیح کہے۔ یا کوئی دوسرا معتمد امام اسے صحیح قرار دے۔

صحیحین پر استدراک اور استخراج:

ا۔ **مستدرک**: ایسی کتاب جس میں کوئی مصنف ان احادیث کو پہلی کتاب کے موضوع اور شرائط کے مطابق جمع کردے۔ اسے مستدرک کہتے ہیں۔ مثلاً امام حاکم کی کتاب **الْمُسْتَدْرَكُ عَلَى الصَّحِيحَينِ**، جنہوں نے امام بخاری و امام مسلم پر استدراک لکھا ہے یعنی ان احادیث کو اپنی دانست میں یک جا کردیا ہے جو ان دونوں کی شرائط کے مطابق تھیں مگر دونوں سے رہ گئیں۔ اس لئے وہ لکھتے ہیں:

یہ احادیث صحیح ہیں مگر شیخین نے انہیں اپنی اپنی کتب میں درج نہیں کیا۔

پہلی بات یہ ہے کہ شیخین نے تمام صحیح احادیث کو اپنی کتب میں درج کرنے کا دعوی نہیں کیا۔ دوسری طرف کبھی امام حاکم کو یہ غلطی بھی لگ جاتی ہے کہ حدیث دونوں یا کسی ایک کتاب میں درج ہوتی ہے مگر امام حاکم یہ لکھ دیتے ہیں: لَمْ يُخَرِّجَاهُ۔ باوجود ضخامت کے اس کتاب میں ضعیف وموضوع احادیث کی کثرت نہیں۔

پھر وہ متروکہ احادیث کہاں ہیں جو بخاری ومسلم کی شرائط کے مطابق ہوں؟ اس کے لئے علماء نے سنن اور صحاح کی کتب لکھیں اور صحیحین پر استدراک لکھنے کا اہتمام کیا۔ جن میں مستدرک، اس کی تلخیص از امام ذہبیؒ اور حافظ

ابوذر الہروی (م:۴۳۴ھ) کی مستدرک عَلَی الصَّحِیحَینِ قابل ذکر ہیں۔

۲۔ مستخرج: مثلاً صحیح بخاری کی احادیث کو کوئی مصنف اپنی سند سے روایت کرے اور اس کی سند امام بخاری کے شیخ یا اس سے اوپر کسی بھی راوی سے جا کر مل جائے خواہ وہ صحابی ہی کیوں نہ ہو۔ اسے مستخرج کہتے ہیں۔ ایسا کرنے سے دونوں کی ترتیب یا متون یا اسانید میں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ یہ روایت اس کے لئے مزید تقویت اور ثبوت کا باعث بنتی ہے۔ کبھی کبھی مستخرج، صاحب کتاب کی سند کے ساتھ بھی ان احادیث کو لکھ دیتا ہے۔ امام یعقوب بن اسحق الاِسفرائینی (م:۳۱۶ھ) نے صحیح مسلم پر مستخرج لکھی جو صحیح ابوعوانہ کے نام سے مطبوع ہے۔ اسی طرح صحیح بخاری پر حافظ ابوبکر اسماعیلی (م:۳۷۱ھ) نے بھی اپنی اسانید سے احادیث جمع کی ہیں۔ صحیحین پر بھی محمد بن یعقوب الشیبانی (م:۳۴۴ھ) نے مستخرج تصنیف کی۔ اسی طرح سنن پر مستخرجات لکھی گئی ہیں۔ ایسی کتاب لکھنے کے کئی فوائد ہیں مثلاً:

اصل کتاب پر زوائد مل جاتی ہیں۔ عالی سند کی یافت ہوتی ہے۔ تعدد طرق تقویت حدیث کا باعث بنتا ہے۔ تدلیس کا وہم جاتا رہتا ہے۔ سند میں انقطاع اور ارسال کو وصل مل جاتا ہے۔ مبہم راوی کی صراحت ہو جاتی ہے۔ مہمل ممتاز ہو جاتا ہے۔ واقعہ کی وضاحت بھی مل جاتی ہے۔ حدیث میں نقص ہو تو اس کا تتمہ ہو جاتا ہے۔ علت دور ہو جاتی ہے۔ راوی پر اختلاط کا الزام بھی رفع ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حسن حدیث اور اس کی اقسام

حدیث حسن: **لغت** میں حسن برے اور قبیح کی ضد ہے۔ محسوسات اور معنویات کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اصطلاحاً: امام خطابی رحمہ اللہ نے اس کی تعریف یہ کی ہے:

مَا عُرِفَ مَخْرَجُهُ وَاشْتَهَرَ رِجَالُهُ وہ حدیث جس کا مخرج معلوم ہو اور اس کے راوی مشہور ہوں۔

ان کا کہنا ہے: وَعَلَيْهِ مَدَارُ أَكْثَرُ الْحَدِيْثِ وَيَقْبَلُهُ أَكْثَرُ الْفُقَهَاءِ وَاسْتَعْمَلَهُ عَامَّةُ الْفُقَهَاءِ۔ اکثر احادیث یہی ہیں

اور اکثر علماء اسے قبول کرتے ہیں اور عام فقہاء کے ہاں اسی کا استعمال ہے۔

امام ابن العربیؒ نے مخرج حدیث کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ یہ ایک ایسے راوی کی روایت ہو جو اپنے شہر والوں میں روایت حدیث میں مشہور ہو۔ جیسے قتادہ اہل بصرہ میں اور ابواسحٰق السبیعی اہل کوفہ میں۔ بصریوں کی حدیث اگر قتادہ سے مروی ہو تو اس کا مخرج معلوم ہوگا اور اگر قتادۃ کے علاوہ کوئی اور روایت کرے تو اس کا مخرج معلوم نہیں ہوگا اور وہ شاذ ہوگی۔

امام عراقیؒ نے لکھا ہے وہ حدیث بہت سی روایات سے مروی ہو۔ ان کا کہنا ہے: امام خطابی کی مراد۔ مخرج حدیث نہیں بلکہ اس سے ان کی مراد مرسل اور مدلس کی ایسی اخبار ہیں جو اس کے ارسال اور تدلیس سے پہلے کی ہے، ان سے احتراز ہے۔ یہ بہت اچھی توجیہ ہے کیونکہ مرسل وہی ہے جس کی سند کا کچھ حصہ گر جائے۔ اسی طرح مدلس بھی کچھ حصہ ساقط کر دیتا ہے۔ جس سے حدیث کے مخرج کا علم نہیں ہوتا۔ کیونکہ سند میں ساقط راوی بھی نامعلوم ہے مگر جو حدیث سند کے ہر راوی کو بیان کر دے اس کا مخرج معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال یہ بحث صحیح اور ضعیف کے بارے میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے رواۃ سند کو دیکھ کر ہی حسن کا فیصلہ ہوگا۔

☆......علماء حدیث نے اس کی بھی دو قسمیں لکھی ہیں۔ حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ

حسن لذاتہ:

هُوَ مَا اتَّصَلَ سَنَدُهُ، بِنَقْلِ الْعَدْلِ الَّذِي خَفَّ ضَبْطُهُ عَنْ دَرَجَةِ الصَّحِيحِ، مِنْ غَيْرِ شُذُوذٍ وَلَا عِلَّةٍ۔ وہ حدیث جس کی سند متصل، راوی عادل مگر ضبط صحیح لذاتہ کے راوی سے ذرا ہلکا، بغیر شذوذ وعلت کے روایت ہو۔

جب کوئی اور روایت اس کی تائید نہ کرے تو پھر یہ حدیث صحیح لغیرہ کے مرتبہ سے ذرا کم درجہ کی ہو جاتی ہے۔ جب کہ ضبط کی کمی دونوں میں موجود ہے۔ صحیح سے کم اور حسن سے اوپر بھی ایک رتبہ علماء نے حدیث جید کا لکھا ہے۔ حسن لذاتہ کی پانچ شرائط ہیں:

۱۔ سند متصل ہو۔ ۲۔ راوی عادل ہوں۔ ۳۔ راوی خفیف الضبط ہو۔ ۴۔ شذوذ نہ ہو۔ ۵۔ علت نہ ہو۔

مثال: اوپر گذر چکی ہے۔

صحیح وحسن میں فرق: کبھی کبھی کسی حدیث کے بارے میں محدثین یہ لکھ دیتے ہیں: صَحِیْحٌ حَسَنٌ۔ ایسی صورت میں ان دو مختلف اوصاف کے بارے میں محدثین نے دو باتیں واضح فرمائی ہیں تا کہ یہ جملہ سمجھا جا سکے:

۱۔ اگر حدیث کی دو سندیں ہیں تو پھر مندرجہ بالا جملے کا مطلب ہے کہ اس کی دو سندوں میں ایک صحیح ہے اور دوسری حسن۔ اس طرح اس حدیث کے یہ دونوں اوصاف یک جا کر دیے گئے۔

۲۔ اگر اس حدیث کی سند ایک ہے تو پھر محدثین کو صَحِیْحٌ حَسَنٌ کہہ کر تردد ہوا ہے کہ آیا یہ حدیث مرتبہ صحیح پر ہے یا حسن پر۔ (الباعث الحثیث:۶۲)

یہ جملہ تین طریقوں سے سمجھا جائے گا:

۱۔ صَحِیْحٌ أَوْ حَسَنٌ۔ کیونکہ شک ہے۔ ۲۔ احتمال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث بعض علماء کی تعریف صحیح کے مطابق صحیح ہے یا پھر دوسرے علماء کے مطابق حسن ہے۔ ۳۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حدیث کی دو اسانید ہوں ایک صحیح ہو اور دوسری حسن۔

یاد رہے کہ ضبط کی خفت، صحیح حدیث کے راوی کے مقابلے میں ہوگی۔ یہیں سے مراتب راوی معلوم ہو جاتے ہیں۔

نوٹ: امام یحییٰ بن معین، امام بخاریؒ کے استاذ ہیں وہ جب کسی راوی کے بارے میں لَیْسَ بِهِ بَأْسٌ کہہ دیں تو اس سے ان کی مراد ثقہ راوی ہے جو صحیح حدیث کا راوی ہوتا ہے۔ حسن حدیث کے راوی پر نقاد حدیث عموماً درج ذیل الفاظ کا اطلاق واستعمال کرتے ہیں۔ صَدُوقٌ، لَا بَأْسَ بِهِ، لَیْسَ بِهِ بَأْسٌ، ثِقَةٌ یُخْطِئُ، صَدُوقٌ لَهُ أَوْهَامٌ۔

اصول وقواعد:

۱۔ ابتداء محدثین کے ہاں حدیث کی صرف دو اقسام ہوا کرتیں: صحیح یا ضعیف۔ حتی کہ وہ حدیث جو خفیف الضبط تھی اسے بھی ضعیف کا نام دیا گیا تھا۔ مگر ضعف میں کیا یہ سب احادیث برابر تھیں؟ نہیں بلکہ ان میں فرق واضح تھا۔ مثلاً: وہ حدیث

جس میں صحیح کی تمام شروط موجود ہوں سوائے راوی کے ضبط کے۔ وہ حدیث اور جس کی سند میں انقطاع یا اعضال، یا ارسال، یا کذاب راوی یا غیر ثقہ ہو۔ ظاہر ہے دونوں برابر نہیں۔ اس لئے محدثین نے ضعیف حدیث کی وہ قسم جو حسن کے درجے کی تھی اسے ضعیف کی تعریف سے نکال کر ایک نئی اصطلاح دے دی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ ہی پہلے محدث ہیں جنہوں نے اس مصطلح کا استعمال اپنی کتاب میں کثرت سے کیا اور متعارف کرایا۔ گو امام بخاری اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کے کلام میں کہیں کہیں لغوی استعمال ملتا ہے۔ مگر بطور ایک مصطلح کے اولیت امام ترمذیؒ کو ہی حاصل ہے۔ اس کی تفریق کئے بغیر کئی نادان انتہائی ضعیف حدیث کو بھی دلیل بنا سکتے ہیں (مقدمہ ابن الصلاح: ۱۷)

۲...... امام احمدؒ بن حنبل نے ضعیف کے بارے میں کہا تھا: كُنَّا نُشَدِّدُ فِي الأَحْكَامِ وَنَتَسَاهَلُ فِي الْفَضَائِلِ۔ ہم احکام کی احادیث کو لیتے وقت سخت شروط اپناتے اور فضائل اعمال میں حدیث لیتے وقت تساہل برتتے تھے۔ اس سے ان کی مراد یہی حسن ہی تھی جو ضعیف حدیث سے ذرا قوی تھی۔ ورنہ ضعیف حدیث کی تعریف میں موضوع بھی آ جاتی ہے۔

۳...... ایسی حدیث کو حَسَنٌ لِذَاتِهِ یا صَحِيحٌ لِغَيْرِهِ بھی کہہ دیتے ہیں۔ صَحِيحٌ لِغَيْرِهِ اس لئے کہ اسی حسن حدیث کی تائید میں ایک اور حدیث، ایسی سند کے ساتھ مل جاتی ہے جو یا تو ویسی ہوتی ہے یا اس سے زیادہ قوی۔ کیونکہ صحت اس سند سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ کسی اور سند کی تائید ساتھ مل جانے سے اس میں صحت آ جاتی ہے۔

۴...... ان کا یہ کہنا: حَسَنٌ صَحِيحٌ یا حَسَنٌ غَرِيبٌ یا حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ یا حَسَنٌ لَيْسَ إِسْنَادُهُ بِذَاكَ الْقَائِمِ وغیرہ۔ محدثین نے سند کی ان اوصاف کا کیا معنی ومراد لیا ہے؟ علماء حدیث نے کتاب ترمذی کو بغور پڑھنے کے بعد اس کے جوابات دئے ہیں۔ مثلاً جب وہ کسی حدیث کے بارے میں صرف غریبٌ کہیں تو اس سے مراد ضعیف حدیث ہے۔ اور اگر حسنٌ غریبٌ کہیں یا صحیحٌ غریبٌ کہیں تو پھر ان کی مراد حدیث کا تفرد ہے نہ کہ ضعف۔ اسی طرح ان کا یہ کہنا حَسَنٌ صَحِيحٌ تو علماء میں کچھ کا کہنا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ کچھ اسے صحیح گردانتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ ایک سند کے اعتبار سے اس کی اسناد حسن ہے اور دوسری سند کے اعتبار سے اس کی اسناد صحیح ہے۔ مزید کسی بڑی کتاب مثلاً امام ذہبیؒ کی کتاب المُوقِظَة میں تفصیلاً پڑھا جا سکتا ہے۔

۵...... محدثین کہتے ہیں کہ حسن حدیث کو قبول وقابل عمل سمجھنے میں اصول یہ ہے کہ جب صحیح حدیث نہ ہو تو غلبہ ظن کی بنا پر حسن حدیث پر عمل ہو سکتا ہے اور اسے ہی قابل احتجاج سمجھنا چاہئے۔ لیکن اگر صحیح حدیث موجود ہے اور حسن اس کے خلاف ہے تو پھر صحیح حدیث ہی قابل عمل ٹھہرے۔ یہ اصول غلط ہے کہ صحیح حدیث ترک کر کے حسن حدیث پر عمل کیا جائے

بلکہ مخالفت کی صورت میں وہ شاذ ہے۔

یہی وہ اصول حدیث ہیں جنہیں مصطلحات حدیث میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ مصطلح کا علم ایک حسابی علم بن جاتا ہے۔ جس کا فائدہ اتنا ہوتا ہے کہ طالب علم مصطلحات کو جان لیتا ہے مگر اس کی تطبیق (implementation) سے وہ کورا رہتا ہے۔

کتب: حسن احادیث پر مستقل کوئی کتاب نہیں ہاں حسن حدیث کے حکم کو سمجھ لیا جائے تو مستقل کتاب نہ لکھنے کی وجوہات سمجھ آسکتی ہیں۔ ائمہ حدیث نے اپنی کتب میں حسن احادیث کو روایت کر دیا ہے۔ مثلاً: سنن الترمذی میں امام ترمذیؒ کا یہ کہنا: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ، یا هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ۔ جس کا مطلب ہے کہ یہ حدیث یا تو دو مختلف سندوں سے مروی ہے یا پھر محدثین کا اس کے صحیح یا حسن ہونے میں اختلاف ہے۔ باقی سنداً غریب ہے۔ اسی طرح مسند احمد، سنن ابی داود، اور سنن دارقطنی وغیرہ میں حسن احادیث مل جاتی ہیں۔

نوٹ: امام بغوی ابومحمد الحسین بن مسعود الفراء (م: ۵۱۶ھ) نے حدیث پر ایک کتاب مَصَابِيحُ السُّنَّةِ لکھی۔ جس میں انہوں نے احادیث کو دو حصوں میں تقسیم کر کے یہ لکھا ہے پہلے حصے میں صحیح احادیث ہیں جو صحیحین سے لی گئی ہیں۔ یا کسی ایک صحیح میں سے۔ اور دوسرے حصے کی احادیث حسن ہیں جو سنن کی کتب سے اخذ کی گئی ہیں۔ یہ ان کی ذاتی تقسیم و اصطلاح ہے محدثین کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے کہ دوسرے حصے کی احادیث میں کچھ صحیح بھی ہیں جو کتب سنن سے لی گئی ہیں مگر بغیر صحیح و حسن میں تمیز کئے وہ سکوت اختیار کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کا سکوت اس وجہ سے ہو کہ دونوں احادیث احتجاج میں مشترک ہیں۔

حسن لغیرہ:

الضَّعِيفُ إِذَا تَعَدَّدَتْ طُرُقُهُ عَلَى وَجْهٍ يَجْبُرُ بَعْضُهَا بَعْضاً بِحَيْثُ لَا يَكُونُ فِيهَا كَذَّابٌ وَلَا مُتَّهَمٌ بِالْكَذِبِ۔ وہ ضعیف حدیث جس کے ایسے متعدد طرق ہوں جو ایک دوسرے کو سنبھالتے جائیں بشرطیکہ ان طرق میں کوئی راوی کذاب ہو اور نہ کذب کا اس پر اتہام ہو۔

یعنی اس حدیث کی گو متعدد اسانید ہوں مگر ہر سند میں کوئی نہ کوئی ضعف ہو جو کسی متابع یا شاہد حدیث کی وجہ سے دور ہو جائے۔ یہ حدیث حسن لذاتہ کے مقابلہ میں ذرا کم درجہ کی ہوگی مگر ضعیف کے مقابلہ میں اونچی۔ یہ بھی

اصطلاح امام ترمذی کی ہے مزید معلومات کے لئے (نکت الحافظ علی ابن الصلاح:۱۱۹) کو دیکھئے۔ **مثال:** سنن ترمذی میں:(۳۳۸۶) میں ہے:

حَمَّادُ بْنُ عِيسَى الْجُهَنِيّ عَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَانَ عَن سَالِمِ بْنِ عَبدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ عَن أَبِيهِ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَال: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا مَدَّ يَدَيْهِ فِي الدُّعَاءِ لَمْ يَرُدَّهُمَا حَتَّى يَمْسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ جب دعا کے لئے دونوں ہاتھ پھیلاتے تو انہیں اپنے چہرہ مبارک پر ملے بغیر واپس نہ لوٹاتے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حَدِيثٌ غَرِيبٌ ، لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ حَدِيثِ حَمادِ بنِ عِيسٰى ، وَقَدْ تَفَرَّدَ بِهِ، وَهُوَ قَلِيلُ الْحَدِيثِ۔۔یہ غریب حدیث ہے صرف حماد بن عیسیٰ ہی کی معرفت ہم اسے جانتے ہیں۔ ان کی بہت کم روایات ہیں۔ سنن ترمذی کے محقق ابراہیم عطوۃ نے لکھا ہے: قَالَ التِّرْمِذِيُّ حَدِيثٌ صَحِيحٌ غَرِيبٌ۔ جب کہ امام ترمذی کا پہلا قول راجح ہے۔ سنن ابوداود (:۱۴۹۲) کی حدیث ابن لہیعہ کے ضعف اور حفص بن ہاشم کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے اور الأدب المفرد (۶۲۴) کی حدیث محمد بن فلیح اور اس کے والد کے ضعف کی وجہ سے ضعیف ہے امام ابن معین فرماتے ہیں: مُحمدُ بْنُ فُلَيْحٍ لَيْسَ بِثِقَةٍ وَلَا أَبُوهُ۔ محمد بن فلیح ثقہ ہیں نہ ان کے والد۔

ہاں بلوغ المرام میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ۱۳۴۵ لکھتے ہیں:

وَلَهُ شَوَاهِدُ مِنْها حَدِيثُ ابْنِ عَبَّاسٍ عِندَ أَبِي دَاوُدَ وَغَيرِهِ وَمَجْمُوعُهَا يَقْتَضِي بِأَنَّه حَدِيثٌ حَسَنٌ۔ اس حدیث کے کچھ اور شواہد بھی ہیں جیسے سنن ابوداود میں سیدنا ابن عباسؓ کی حدیث ہے۔ اسے حدیث حسن قرار دے سکتے ہیں۔

اسے حسن لغیرہ اس لئے کہا گیا کہ اگر ہر حدیث کی سند کو انفرادی طور پر دیکھا جائے تو وہ رتبہ حسن تک نہیں پہنچتی مگر مجموعی طور پر اسانید کو دیکھنے کے بعد اس کی سند کچھ قوی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اسے حسن لغیرہ کہتے ہیں۔

اصول: ضعیف حدیث کے راوی میں اگر کمزوری اس کی عدالت کی وجہ سے ہے تو اس کی حدیث کسی بھی صورت میں قوی نہیں ہو سکتی خواہ اس کی بے شمار اسانید ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اگر اس کے راوی میں کمزوری حفظ وضبط کی وجہ سے ہے تو پھر یہ حدیث کثرت طرق کی وجہ سے تقویت پا لے گی اور اس پر عمل بھی جائز ہوگا۔ (الرسالۃ :۵۶۱، فتح المغیث ۱/۴۲، ۱۲۰)

اصول: ایسی حدیث جس میں ضعف کا احتمال ہو اور ضعف شدید کم ہو۔ مگر ایک اور حدیث آ کر اس کے ضعف کو دور کر دے تو یہ ضعیف حدیث اپنی مثیل کی وجہ سے یا اپنی سے قوی تر حدیث کی وجہ سے، اپنے ضعف سے نکل کر حسن لغیرہ کے درجے تک پہنچ جائے گی۔ لیکن اگر راوی، روایت حدیث میں اکیلا ہو تو پھر اس کا شمار ان ضعفاء میں سے ہوگا جن کی حدیث ناقابل احتجاج ہوا کرتی ہے۔

حدیث مقبول غیر صحیح یا حسن کے لئے علماء حدیث کے مستعمل الفاظ: کچھ احادیث ایسی ہیں جنہیں غیر صحیح یا حسن کہا جاتا ہے۔ ان احادیث کا فیصلہ دیتے وقت محدثین چند مخصوص الفاظ بولتے ہیں مثلاً: جَیِّدٌ، قَوِیٌّ، صَالِحٌ، مَعْرُوْفٌ، مَحْفُوظٌ، مُجَوَّدٌ، ثَابِتٌ اور مُشْبِہٌ۔ وغیرہ۔ جب ھٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ بولا جائے گا تو اس سے مراد حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ لِذَاتِہٖ ہوگی اور جب ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنٌ کہا جائے تو اس سے مراد حَسَنٌ لِذَاتِہٖ۔

محفوظ: یہ وہ حدیث ہے جسے اوثق راوی ایک ثقہ راوی کے مقابلے میں یا زیادہ ثقہ راویوں کی روایت کے مقابلے میں ایک ثقہ راوی روایت کریں۔

معروف: ایسی حدیث جسے ثقہ راوی نے ضعیف راوی کی حدیث کے مقابلے میں مختلف بیان کیا ہو۔

ثقہ کی طرف سے کچھ اضافہ

جب صحیح یا حسن حدیث کا راوی منفرد حدیث میں کچھ اضافہ کر دے جبکہ دیگر رواۃ نے اسے نہ کیا ہو تو اسے **زیادۃ الثقۃ** کہتے ہیں۔ کیا یہ اضافہ قابل قبول ہوگا؟ محدثین نے اس کے قبول ورد کے درج ذیل چند اصول بتائے ہیں:

۱...... اگر یہ اضافہ (کثرت تعداد اور قوت حفظ وامانت میں) کبیر راوی کے منافی ہے تو قبول نہیں کیونکہ کبیر بہر حال کبیر ہے۔ دوسرا یہ کہ ایسے اضافہ کو قبول کرنے میں شک پیدا ہوتا ہے۔

۲...... اگر اس کے منافی نہیں تو اس اضافہ کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ وہ راوی خود بھی تو ثقہ ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ اس اضافہ میں عبادت کے (اذکار) الفاظ نہ ہوں کیونکہ وہ تو متعین اور محدود ہی ہیں۔ ورنہ ایسے اضافہ کے بارے میں دل میں کچھ ملال سا آ جاتا ہے۔ متعبّد احادیث کو بہر صورت محفوظ ہونا چاہئے۔ ہاں اگر تعبدی الفاظ نہ ہوں جیسے نکاح یا تجارت وغیرہ کے بارے میں کوئی اضافہ ہو اور کبیر راوی کے الفاظ کے منافی بھی

نہ ہو تو ایسا اضافہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ۔مثلاً ایک راوی کہتا ہے: آپ ﷺ نے شراب پینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔اور دوسرا راوی آپ ﷺ کے ارشاد میں مزید ایک چیز کا اضافہ کرتا ہے کہ آپ ﷺ نے شرابی پر اور سود خوار پر لعنت فرمائی ہے۔ یہ اضافہ پہلے کے منافی نہیں ہے۔اسی طرح ایک راوی کہتا ہے: آپ ﷺ نے گھوڑے کا گوشت کھانے کی اجازت دی ہے اور دوسرا کہتا ہے: آپ نے گھوڑے کا گوشت حلال قرار دیا اور گدھے کا حرام ۔تو یہ اضافہ بھی قابل قبول ہے۔مگر یہ نا قابل قبول ہوگا کہ ایک ثقہ روایت میں یہ کہے: آپ ﷺ نے یہ کرنے کا حکم دیا اور دوسرا ضعیف راوی یہ روایت کرے کہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ یہ تو کھلی منفی اور مخالف بات ہے۔

۳...... مطلق منفی اضافہ کی اجازت خواہ کسی نے ہی دی ہو وہ بھی درست نہیں ۔اگر ایسا ہو تو صحیح وحسن حدیث کی شرائط میں شاذ کی شرط رکھنے کی ضرورت ہی نہیں ۔جو علماء اسے جائز کہتے ہیں ہوسکتا ہے ان سے یہ شرط نظر انداز ہوگئی ہو۔وہ بشر تھے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بعض شروط کو بھول گئے ہوں۔

۴...... ائمہ متقدمین بھی روایت میں ثقہ کے مشروط اضافے کے قائل ہیں۔

۵...... اسی مقام پر محفوظ اور شاذ روایت کو بھی پہچانا جا سکتا ہے۔

طبقات کتب حدیث

امام علی بن محمد بن حزم رحمہ اللہ نے صحیحین کو پہلے درجے کی کتب قرار دے کر دوسرے درجے میں صحیح ابن السکن، منتقی از ابن الجارود اور منتقی از القاسم بن اصبغ کو رکھا ہے اور تیسرے درجے میں سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کو۔ جبکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے صاحب زادے شاہ عبد العزیز دہلوی رحمہما اللہ نے کتب حدیث کی درجہ بندی ان کی صحت، شہرت اور قبولیت میں اعلی درجہ کو پیش نظر رکھ کر یہ کی ہے۔

پہلا درجہ: کتب متفق علیہ اور موطا کا ہے۔ جس کی وجہ مجتہدانہ فقاہت ہے جو ان کے تراجم میں جھلکتی ہے اور صحیح مسلم میں ترتیب احادیث کی عمدگی اور حسن ہے۔موطأ میں اسانید عالیہ ہیں۔اس لئے علماء امت کا اتفاق ہے کہ یہ دونوں کتب، قرآن مجید کے بعد مسلمانوں کیلئے صحیح ترین کتب ہیں۔ موطا امام مالک بھی اسی درجہ کی کتاب ہے۔اس میں

مسند مرفوع احادیث کے علاوہ اقوال وفتاوٰی صحابہ وتابعین بھی ہیں۔ مگر ہمارے لئے صرف متصل مسند مرفوع احادیث ہی اولین حیثیت رکھتی ہیں۔

دوسرا درجہ (2nd Catagory): اس طبقہ میں وہ کتب شامل ہیں جن میں درجہ بالا تینوں صفات تو موجود ہوں مگر پہلے درجہ کی کتب سے ذرا کم درجہ کی ہوں۔ سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی اور ابن ماجہ کی کتب اسی طبقہ کی ہیں جنہیں سنن اربعہ کہا جاتا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مرتب فقہی مسائل ہیں۔ جہاں ان مؤلفین نے حدیث کے ضعیف ہونے کی نشاندہی کی ہے اسے ہم ظاہر ہے ترک کردیں گے۔ اور جو مسئلہ پہلے درجہ کی کتب میں باوضاحت نہیں تو ان کتب سے ہم مدد لیں گے۔ مسند احمد کو بھی اس درجہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ عبد اللہ اور ان کے شاگرد ابوبکر قطیعی کی اضافہ شدہ احادیث قابل اعتناء نہ سمجھی جائیں۔

تیسرا درجہ (3rd Catagory) تیسرے طبقہ میں ایسی کتب ہیں جو صحت، شہرت اور قبولیت میں ادنی درجہ رکھتی ہوں۔ یعنی علماء کے ہاں بھی زیادہ متداول نہ رہی ہوں اور ان کی روایات میں صحیح وسقیم دونوں کو چھانٹا نہ گیا ہو۔ اس طبقہ میں صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، مصنفات ابن ابی شیبہ اور عبد الرزاق، کتب از امام بیہقی اور کتب از امام طحاویؒ بھی شامل ہیں۔ ان کی باری پہلے دو درجوں کی کتب میں حدیث کے نہ ہونے پر آئے گی۔

چوتھا درجہ (4th Catagory) آخری طبقہ کی یہ کتب پہلی کتب کے مقابلے میں انتہائی کم درجہ کی ہوں گی بلکہ ان میں وہ صفات ہی نہیں جو اول درجہ کی کتب میں ہیں۔ ان میں کتاب الضعفاء از امام ابن حبان، کتب خطیب بغدادی، یا الکامل از ابن عدی وغیرہ ہیں۔

طبقات محدثین

تعداد طبقات: یہ بارہ طبقات ہیں جن کا ذکر امام ابن حجر عسقلانی نے اپنی معروف کتاب تقریب التہذیب میں کیا ہے۔ کیونکہ ان کی روایات صحاح ستہ میں ہیں اور یہی زیادہ مشہور تقسیم ہے اور جن کی تاریخ وفات کا قاعدہ بھی انہوں نے مرتب متعین کردیا ہے۔:

پہلا طبقہ: صحابہ کرام کا ہے۔ مختلف مراتب کے باوجود درجہ صحابیت ہی اس طبقہ کی اصل ہے۔

دوسرا طبقہ: یہ صحابہ کرام سے نچلا طبقہ ہے۔ کبار تابعین اس میں شامل ہیں جیسے سعید بن المسیب وغیرہ۔

تاریخ وفات: ان دونوں طبقات کی وفات پہلے سو سال کے دوران ہوئی ہے۔

تیسرا طبقہ: تابعین کرام کا درمیانہ طبقہ ہے جن میں الحسن بصری اور ابن سیرین جیسے علماء ہیں۔

چوتھا طبقہ: یہ طبقہ روایت حدیث میں کبار تابعین سے ملتا جلتا ہے جیسے امام زہری اور قتادۃ وغیرہ۔

پانچواں طبقہ: صغار تابعین اس میں شامل ہیں جنہوں نے ایک یا دو صحابہ کرام کو دیکھا ہوتا ہے۔

چھٹا طبقہ: یہ طبقہ پانچویں طبقہ کا معاصر ہے مگر ان میں سے کسی کی ملاقات کسی صحابی سے ثابت نہیں۔ جیسے: ابن جریج وغیرہ۔

ساتواں طبقہ: کبار اتباع تابعین کا ہے جن میں امام مالکؒ اور امام سفیان ثوری شامل ہیں۔

آٹھواں طبقہ: اتباع تابعین میں درمیانہ طبقہ جن میں امام ابن عیینہ اور اسماعیل ابن علیہ شامل ہیں۔

تاریخ وفات: ان سبھی طبقات کی وفات پہلی صدی ہجری کے بعد سے لے کر دوسری صدی کے اختتام تک۔

نواں طبقہ: اتباع تابعین کا طبقہ صغری ہے جیسے: یزیدؒ بن ہارون، امام شافعیؒ، امام طیالسیؒ اور امام عبدالرزاقؒ صنعانی وغیرہ۔

دسواں طبقہ: تبع تابعین سے اخذ حدیث لینے والوں میں کبار لوگ جو کسی کبیر تبع تابعی کو نہیں ملے۔ جیسے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ۔

گیارہواں طبقہ: وہ علماء جو اسی طبقہ کے درمیانہ درجہ کے ہیں اور جنہوں نے درمیانہ درجہ کے صغار تبع تابعین سے اخذ حدیث کیا ہے۔ جیسے امام ذہلیؒ اور امام بخاریؒ وغیرہ۔

بارہواں طبقہ: تبع تابعین سے اخذ حدیث کرنے والے صغار علماء کا طبقہ ہے۔ جن میں مولفین صحاح ستہ کے وہ مشائخ بھی شامل ہیں جن کی وفات تاخیر سے ہوئی۔ جیسے امام ترمذی اور امام نسائی رحمہما اللہ کے شیوخ وغیرہ۔

تاریخ وفات: ان سب کی وفات تیسری صدی ہجری کے آغاز سے تا انتہائے عمر۔

☆☆☆☆☆☆

اعتبار، متابعت اور شاہد

اعتبار: لغت میں اعْتَبَرَ سے مصدر ہے۔ مراد کہ معاملہ میں غور وفکر کرنا کہ اسی کی جنس کی کوئی شے معلوم

ہو جائے۔

اصطلاحاً: اس کی تعریف یہ کی گئی ہے:

تَتَبُّعُ طُرُقِ حَدِيْثٍ انْفَرَدَ بِرِوَايَتِهِ رَاوٍ، لِيُعْرَفَ هَلْ شَارَكَهُ فِيْ رِوَايَتِهِ غَيْرُهُ أَوْ لَا۔ ایک ایسی حدیث کی اسانید کو تلاش کرنا جسے ایک ہی راوی نے روایت کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کیا اس کی روایت میں کوئی اور بھی شریک ہے یا نہیں۔

جب کسی روایت کا راوی اکیلا ہو تو محدثین ذخائر حدیث میں کسی اور راوی کو بھی تلاش کرتے ہیں جس نے یہی حدیث روایت کی ہو۔ اس طرح یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ منفرد راوی ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہے یا کسی نے اس کی متابعت کی ہے یا اس کا کوئی شاہد بھی ہے۔ محدث کی یہ بحث وتفتیش اعتبار کہلاتی ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ:

......اس حدیث کا راوی منفرد ثقہ ہے اور کوئی بھی اسے روایت نہیں کر رہا۔ تو اسے **فرد مطلق** یا **غریب مطلق** کہہ دیتے ہیں۔

......اگر کوئی اور راوی مل جائے تو اس سند کو **متابعت** کہتے ہیں۔

......اور اگر یہ علم ہو جائے کہ حدیث کسی دوسرے صحابی سے بھی مروی ہے تو ایسی حدیث **شاہد** کہلاتی ہے۔

اسی لئے محدثین کا یہ کہنا: اعْتَبَرْنَا هَذَا الْحَدِيثَ۔ اس حدیث کو ہم نے اعتبار کیا۔ یہ اعتبار ہے۔ پھر اعتبار کا نتیجہ بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً: ابو بکر الخطیبؒ فرمایا کرتے: میں نے عبداللہ بن خیران کی بہت سی احادیث کا اعتبار کیا تو میں نے انہیں مستقیم پایا۔ یہ احادیث ان کی ثقاہت کی شاہد بن گئیں۔

متابعت: لغت میں: تَابَعَ سے اسم فاعل ہے اور وَافَقَ کے معنی میں آتا ہے۔ اسے تَابِعٌ بھی کہتے ہیں۔

اصطلاحاً:

حَدِيْثٌ شَارَكَ فِيْهِ رُوَاتُهُ رُوَاةَ الْحَدِيْثِ الْفَرْدِ لَفْظاً وَمَعْنىً أَوْ مَعْنًى فَقَطْ، مَعَ الإِتِّحَادِ فِي الصَّحَابِيِّ۔ ایک حدیث جس کے راوی حدیث فرد کے راویوں سے لفظی ومعنوی اعتبار سے یا صرف معنوی اعتبار سے شریک ہو جائیں اور راوی صحابی میں متفق ہوں۔

جب راوی ایک ہی حدیث کی روایت میں کسی دوسرے راوی کے ساتھ شریک ہو جائے تو یہ شراکت دو طریقوں سے ہوتی ہے:

أ. تامہ: شروع اسناد میں راوی کو دوسرے راوی کی مشارکت مل جائے تو اسے متابعت تامہ کہہ دیتے ہیں۔ نیچے دی گئی مثال دیکھئے۔

ب. قاصرہ: اثناء سند میں راوی کو دوسرے راوی کی مشارکت مل جائے تو اسے متابعت قاصرہ کہتے ہیں۔ مثلاً: حَدَّثَنا أبو أُسامةَ عَن عُبَيدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَن نافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ یہ حدیث صحیح مسلم کی ہے۔ مگر اس کے آخری الفاظ یوں ہیں: فَإِنْ أُغْمِيَ عَلَيْكُم فَاقْدُرُوا لَهُ ثَلاثِينَ۔ یہ حدیث امام ابن خزیمۃ نے عَنْ عَاصِمِ بْنِ مُحَمدِ بْنِ زَيدٍ عَن أَبِيهِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللّٰه عنهُمَا سے روایت کی ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں: فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَكَمِّلُوا ثَلَاثِيْنَ۔ اس حدیث میں راوی کو متابعت جا کر سیدنا ابن عمرؓ سے ملی ہے اور آخری لفظ حدیث بھی مختلف ہیں اس لئے اسے متابعہ قاصرہ کہتے ہیں۔ (النکت: ۶۸۴/۲)

شاہد: اسم فاعل ہے شہادۃ سے۔ کیونکہ وہ گواہی دیتا ہے کہ اس حدیث فرد کی کوئی اصل و بنیاد ہے جس سے حدیث قوی ہو جاتی ہے۔ جیسے ایک گواہ مدعی کی بات کو گواہی دے کر قوی کر دیتا ہے۔

اصطلاحاً:

حَدِيْثٌ يُشَارِكُ فِيْهِ رُوَاتُهُ رُوَاةَ الْحَدِيْثِ الْفَرْدِ لَفْظاً وَمَعْنًى أَوْ مَعْنًى فَقَطْ ، مَعَ الِاخْتِلَافِ فِي الصَّحَابِيِّ۔ ایک حدیث جس کے راوی، حدیث فرد کے راویوں سے لفظی اور معنوی طور پر یا صرف معنوی طور پر جا شریک ہوتے ہیں۔ اور راوی صحابی میں الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

ساری کوشش کے باوجود حدیث فرد ہی رہی۔ پھر کوئی اور ایسی حدیث ملی جو اسی حدیث کا معنی پیش کر رہی تھی تو دوسری حدیث پہلی حدیث کی شاہد کہلائے گی۔ شاہد دراصل صحابی ہوتے ہیں جو اصل حدیث کی روایت میں لفظاً شریک نہیں ہوتے بلکہ مفہوم حدیث کی تائید ان سے مل جاتی ہے۔ مثلاً امام ترمذی رحمہ اللہ کا یہ قول: وَفِي الْبَابِ عَنْ فُلَانٍ وَفلَانٍ۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ محدثین اس قول پر یوں تبصرہ کرتے ہیں: اس سے مراد اصل حدیث ہے نہ کہ بعینہ یہ حدیث۔ علماء نے امام ترمذی رحمہ اللہ کے اس قول پر احادیث کو ڈھونڈا اور ان کی تخریج کی

ہے۔اور کتب لکھی ہیں۔

ایک جامع مثال: جس میں اعتبار، متابعت اور شاہد کو بخوبی سمجھا جا سکے: امام شافعی رحمہ اللہ کتاب الأم میں ایک حدیث بہ سند: امام شافعیؒ عن مالک عن عبداللہ بن دینار عن عمر سے روایت کرتے ہیں:

الشَّهْرُ تِسْعٌ وَّعِشْرُونَ، فَلَا تَصُوموا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ، وَلَا تُفْطِرُوا حَتّٰى تَرَوْهُ، فَإِنْ غُمَّ عَلَيكُمْ فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِينَ۔ (الأم:۲/۹۴) مہینہ انتیس کا ہوتا ہے جب تک چاند نہ دیکھو روزہ نہ رکھو اور افطار بھی نہ کرو۔ اگر بادل تم پر چھائے ہوئے ہوں تو گنتی تیس پوری کرو۔

امام ابن حجرؒ فرماتے ہیں موطأ کے تمام نسخوں میں امام مالکؒ سے یہ حدیث فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوا لَهُ کے الفاظ سے ہے۔ مگر متن کے ایک جملے فَإِنْ غُمَّ عَلَيكُم فَأَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِينَ۔ میں امام شافعیؒ اپنے دیگر ساتھیوں سے فَاقْدُرُوا لَهُ روایت کر کے منفرد ہو جاتے ہیں جب کہ سب کے شیخ امام مالکؒ تھے۔

اس کی مزید اسانید تلاش کی گئیں تو صحیح بخاری میں یہ حدیث اس سند سے ملی: حَدَّثَنَا عَبدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْلَمَةَ الْقَعْنَبِيُّ، ثَنَا مَالِكٌ ۔آگے اسناد اور لفظ بھی وہی ہیں جو امام شافعیؒ نے اپنی روایت میں ذکر کیے ہیں۔ اس طرح امام شافعیؒ کی متابعت، عبداللہ بن مسلمۃ القعنبیؒ سے ہوگئی جو صحیح ترین حدیث کی علامت ہے۔ اسے **متابعت تامہ** کہتے ہیں۔

مزید تحقیق کی تو یہی حدیث صحیح ابن خزیمہ میں بہ روایت عاصمُ بْنُ مُحمدٍ عَن أبيهِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِي اللّٰه عَنهُمَا بہ لفظ فأَكْمِلُوا ثَلَاثِينَ کی ملی۔ یہ **متابعت قاصرہ** ہوئی۔ اور صحیح مسلم میں بھی یہ حدیث بروایت حَدَّثَنَا أبو أُسامَةَ عَنْ عُبَيدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ بہ الفاظ فَاقْدُرُوا ثَلَاثِينَ ملی۔ یہ بھی **متابعت قاصرہ** ہوئی۔

اسی حدیث کی ایک شاہد حدیث بروایت محمدُ بْنُ حُنَينٍ عَنِ ابْنِ عَباسٍ عَنِ النبيِّ ﷺ سنن نسائی میں ملی۔ انہوں نے بھی اسے عبدُ اللّٰهِ بْنُ دِينارٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ والی حدیث کی مانند بعینہ انہی الفاظ میں بیان کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے بھی بروایت محمدُ بْنُ زِيادٍ عَن أبِي هُرِيرَةَ سے ان الفاظ میں یہ حدیث بیان کی ہے: فَإِنْ غُبِّيَ عَلَيْكُم فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِينَ۔ یہ حدیث بھی معناً **شاہد** کی حیثیت رکھتی ہے۔

امام ابن حجرؒ فرماتے ہیں: متابعت اور شاہد کے انکشاف کی جو صورت و ہیئت بنتی ہے اسے اعتبار کہتے ہیں۔ انہوں

نے امام ابن الصلاحؒ کی اس تقسیم کا تعاقب کیا ہے جس میں انہوں نے اعتبار کو متابعت اور شاہد کی ایک قسم قرار دیا۔

اعتبار کے درج ذیل مقاصد ہیں:۔

☆......راوی اگر ثقہ ہے تو اس پر تفرد کا الزام دور کیا جا سکے۔

☆......اگر ایک راوی ضعیف ہے تو اس عمل سے حدیث کو تقویت مل سکے۔

☆......اسے دیگر احادیث پر ترجیح دی جا سکے۔

☆......جوامع، معاجم اور مسانید جیسی کتب میں اسی حدیث کی مزید اسانید وغیرہ تلاش کی جا سکیں۔

متابعت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی راوی کی حدیث کی مزید تحقیق ہو جائے۔ مثلاً: حماد بن سلمۃ ایک حدیث کو عَنْ أَيُّوبَ عَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ روایت کرتے ہیں۔ محدثین اس حدیث کی تحقیق مزید کے لئے یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کسی اور ثقہ نے یہی حدیث ایوب سے روایت کی ہے؟ اگر ایسی روایت مل جائے تو وہ اسے **متابعت تامہ** کہہ دیتے ہیں۔ اور اگر نہ ملے تو پھر یہ تلاش کرتے ہیں کہ ایوب کے سوا کسی اور ثقہ نے یہی حدیث ابن سیرین سے روایت کی ہے اگر وہ مل جائے تو اسے **متابعت قاصرہ** کہہ دیتے ہیں اور اگر یہ بھی نہ ملے تو پھر اس تلاش میں لگ جاتے ہیں کہ ابن سیرین کے سوا کسی اور ثقہ نے یہی حدیث ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔ اگر وہ مل جائے تو بھی اسے **متابعت قاصرہ** کا نام دیتے ہیں اور اگر نہ ملے تو پھر کوشش کرتے ہیں کہ کوئی ایسی حدیث مل جائے جسے ابو ہریرہ کے علاوہ کسی اور صحابی نے آپ ﷺ سے یہی حدیث روایت کی ہو۔ اگر ایسی روایت مل جائے تو یہ بھی **متابعت قاصرہ** کہلاتی ہے ورنہ ایسی حدیث فرد یا غریب ہوگی۔ جیسے یہ حدیث: أَحْبِبْ حَبِيبَكَ هَوْنًا مَّا۔۔۔ اسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے بہ سند سابق حماد بن سلمۃ روایت کر کے کہا ہے: غَرِيبٌ لَا نَعْرِفُهُ بِهٰذَا الإِسْنَادِ إِلَّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ۔ یہ حدیث غریب ہے جسے ہم سوائے اسی استاد کے کہیں اور نہیں جانتے۔ امام سیوطی تدریب میں اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں: أَيْ مِنْ وَجْهٍ يَثْبُتُ وَإِلَّا فَقَدْ رَوَاهُ الْحَسَنُ بْنُ دِينَارٍ عَنِ ابْنِ سِيرِينَ، وَالْحَسَنُ مَتْرُوكُ الْحَدِيثِ لَا يَصْلُحُ لِلْمُتَابَعَاتِ۔ یعنی ایسی سند سے جو ثابت ہے۔ ورنہ اس حدیث کو حسن بن دینار نے ابن سیرین سے روایت کیا ہے۔ یہی حسن متروک ہے جو متابعات کے لائق نہیں۔

شاہد کو پیش کرنے کا مقصد: یہ ہوتا ہے کہ:

☆......صحابہ کرام کے بارے میں یہ علم ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی معنی کی حدیث کو تواتر کے ساتھ روایت کرتے رہے۔

☆......کبھی متن میں موجود اضافہ کو ثابت کرنا ہوتا ہے۔

☆......کبھی حدیث کو تقویت مل جاتی ہے جب اس میں معمولی ضعف کا احتمال ہو۔ضعف شدید کی صورت میں تو ایسی حدیث سے استشہاد نہیں لیا جا سکتا۔مثلاً راوی متہم ومتروک ہو۔

☆......کبھی متن میں ابہام کو دور کرنے اور اس کی وضاحت کے لئے شاہد کی ضرورت پڑتی ہے۔

☆......کبھی زمان ومکان کی وضاحت کے لئے بھی ضرورت پڑتی ہے۔

قدیم محدثین، متابع وشاہد کا استعمال ایک دوسرے کے لئے کیا کرتے۔وَالأَمْرُ فِيهِ يُسْرٌ۔بقول امام ابن حجرؒ اس معاملہ میں آسانی ہے۔اصطلاحات کے استقرار کے بعد زیادہ مناسب یہی ہے کہ ان کا مفہوم وہی لیا جائے جو متعین ہو چکا ہے۔

چند اصول: متابعت اور شاہد میں یہ شرط نہیں کہ اس کا راوی ثقہ ہو بلکہ ثقہ سے کم تر بھی ہو سکتا ہے اس لئے اس کی حدیث معتبر ہوگی۔یعنی اس کا اعتبار کیا جائے گا۔محدثین کے اس قول: لَا يُعْتَبَرُ بِهِ، اس سے اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کا یہی مطلب ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ اس کے بڑے ماہر تھے جیسا کہ سنن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

☆......کبار ائمہ محدثین کو متابع کی ضرورت نہیں ہوتی۔الزعفرانی کہتے ہیں: میں نے امام احمدؒ بن حنبل سے عرض کی: اس حدیث میں عفان کی کس نے متابعت کی؟ مجھے فرمانے لگے: کیا عفان کو کسی متابع کی ضرورت ہے؟(سیر اعلام النبلاء ۱۰/ ۲۴۷)

☆......اگر ایک راوی ثقات کی متابعت کرتا ہے تو یہ اس کی تقویت کا باعث ہے۔عفانؒ کہتے ہیں: یحییٰؒ بن سعید، ہمام کی بیشتر احادیث پر اعتراض کیا کرتے۔جب معاذؒ بن ہشام تشریف لائے اور ہم نے ان کتب کو بغور دیکھا تو وہ بہت سی احادیث میں ہمام کی روایات کے موافقت کر رہے ہیں۔اس کے بعد یحیی بھی اعتراض سے رک گئے۔

اہمیت متابعات: اختلاف رواۃ کے وقت راجح کا متابعات سے پتہ چل جاتا ہے۔عباسؒ دوری کہتے ہیں میں نے یحییٰؒ بن معین سے پوچھا: اعمشؒ کی وہ حدیث جس میں وکیعؒ اور ابو معاویہؒ اختلاف کریں تو؟ فرمانے لگے: توقف کرو یہاں تک کہ ان میں سے کسی کا متابع مل جائے۔مثالیں اوپر گذر چکیں ہیں۔

......ایسے رواۃ جن کا حدیثی اعتبار تو کیا جاتا ہے مگر احتجاج نہیں۔جیسے امام احمدؒ، عمرو بن شعیب کی روایت

میں بہت سی مناکیر پاتے ہیں مگر انہیں صرف اعتبار کے لئے لکھنے کا فرماتے ہیں باقی وہ حجت ہوں ایسا نہیں۔

......سیدنا انسؓ بن مالک کے وہ شاگرد جو ثقہ ہیں ۱۵۰ھ تک باقی رہے۔ ان کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ جو ۱۹۰ھ تک زندہ رہے وہ ضعیف ٹھہرے۔ اس لئے ان کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔ کچھ اور بھی رہے جو نا قابل اعتماد اور غیر مقبول ٹھہرے۔ جیسے ابراہیم بن ہدبہ، ابوہیس دینار، خراش بن عبداللہ، موسی الطّویل، وغیرہ۔ یہ لوگ دو سو ہجری کے بعد تک کچھ عرصہ رہے مگر ان کی روایت کا اعتبار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆☆☆

روایت و نقل ہی ایسا طریقہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کیا لائے۔ اس کی معرفت کے لئے صرف عقل کافی نہیں بلکہ آنکھ جس طرح اپنے آگے روشنی نہ پا کر اپنا نور کھو بیٹھتی ہے اور اسے اندھیرا ہی نظر آتا ہے اسی طرح عقل کا نور بھی کبھی راہ راست نہیں پا سکتا جب تک کہ اس پر رسالت کا سورج طلوع نہ ہو۔ سیدنا ابورافع، ابوثعلبہؓ اور دیگر صحابہ نے آپ ﷺ سے متعدد روایات میں یہ ارشاد نبوی ﷺ روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

> خبردار! میں تم میں سے کسی کو اپنے تکیہ پر ٹیک لگائے نہ پاؤں کہ اس کے پاس میرے معاملات میں سے کوئی معاملہ آتا ہے جس کا میں نے کوئی حکم دے رکھا ہو یا اس سے منع کیا تو وہ کہے: ہمارے اور تمہارے درمیان قرآن ہی حکم ہے تو جو ہم اس میں حلال پائیں گے اسے حلال سمجھیں گے اور جو اس میں حرام پائیں گے اسے حرام۔ خبردار! میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے ساتھ اس کے مثل بھی۔ ایک اور روایت میں ہے: خبردار! وہ کتاب کی مانند ہے۔ (ابوداؤد: ۴۶۰۵، ترمذی: ۲۶۶۳)

☆☆☆☆☆

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

ردوقبول کے اعتبار سے خبر واحد کی دوسری قسم

مردود احادیث اور ان کی اقسام

ا۔حدیث ضعیف

هُوَ مَا لَمْ يَجْمَعْ صِفَاتِ الصَّحِيحِ وَالْحَسَنِ، بِفَقْدِ شَرْطٍ مِنْ شُرُوطِهِ۔ایسی حدیث جس میں صحیح یا حسن کی صفات میں کوئی صفت موجود نہ ہو یا اس میں کوئی صفت مفقود ہو۔

اس کی مختلف صورتیں ہیں:

ا۔اس حدیث کی سند ہی نہ ہو۔ایسی صورت میں اللہ کے رسول یا صحابہ یا تابعین یا ائمہ کرام کی طرف منسوب قول،فعل یا فتوی سب بے سند ثابت ہوئے اور ضعیف بھی۔

۲۔سند ہو مگر متصل نہ ہو تو یہ روایت منقطع،مرسل وغیرہ ہوگی اور ضعیف بھی۔

۳۔اس کا راوی عادل نہ ہو یا غیر ضابط ہو۔عدالت نہ ہونے کی صورت میں وہ حدیث متروک ہوگی اور اگر ضبط نہ ہو تو ضعیف یا موضوع۔

۴۔اگر چوتھی شرط عدم شذوذ اس میں نہ ہو تو پھر وہ حدیث شاذ یا منکر کہلائے ہوگی۔

۵۔اور اگر پانچویں شرط عدم علت اس میں مفقود ہو تو حدیث معلل ہو جائے گی۔

اس ضعف کے کچھ اسباب و وجوہات ایسی ہیں جنہیں ایک محقق کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔محدثین کرام نے جب روایات کو جانچا،پرکھا تو انہیں حدیث میں ضعف کے درج ذیل مختلف اسباب و درجات نظر آئے جن کی بنیاد بھی دو اہم سبب ہیں۔ذیل کا خاکہ شاید ان اسباب کو زیادہ واضح کر سکے۔اس طرح ضعیف حدیث کی اقسام دو چند ہو گئیں۔

ا۔ راوی میں طعن کے اسباب

اس طعن کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔ یا طعن اس راوی کی **عدالت** پر ہوتا ہے یا ضبط پر۔

أ۔ عدالت راوی پر طعن: راوی پر یہ نقد و طعن چار اسباب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

ا۔ جھوٹ بولنا اسے محدثین وضع کہتے ہیں۔ اس کی تعریف پھر یہ کی گئی ہے:

اصطلاحاً: اس حدیث کو کہتے ہیں:

هُوَ مَا نُسِبَ إِلَى الرَّسُولِ ﷺ اخْتِلَاقاً وَ كَذِباً مِمَّا لَمْ يَقُلْهُ أَوْ يَفْعَلْهُ أَوْ يُقِرَّهُ، وَ كَانَ مَتْنُهُ مُخَالِفاً لِلْقَوَاعِدِ الثَّابِتَةِ فِي الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ۔ موضوع اسے کہتے ہیں جس کا راوی جھوٹا ہو اور وہ اپنی طرف سے ایک بات گھڑ کر رسول اکرم ﷺ کی طرف منسوب کردے۔ جو آپ ﷺ نے نہ کہی، نہ کی اور نہ ہی اسے برقرار رکھا۔ اور یہ قول، فعل و تقریر کتاب و سنت کے ثابت شدہ قواعد کے بھی خلاف ہو۔

مثال: تاریخ بغداد میں (۵/۲۹۷) بہ سند:

مُحَمَّدُ بْنُ سُلَيْمَانَ بْنِ هِشَامٍ، حَدَّثَنَا وَكِيعٌ، عَنِ ابْنِ أَبِي ذِئْبٍ، عَنْ نَافِعٍ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ۔ رضی الله عنهما۔ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: لَمَّا أُسْرِيَ بِي إِلَى السَّمَاءِ، فَصُرْتُ إِلَى السَّمَاءِ الرَّابِعَةِ سَقَطَ فِي حِجْرِي تُفَّاحَةٌ، فَأَخَذْتُهَا بِيَدِيْ، فَانْفَلَقَتْ، فَخَرَجَ مِنْهَا حَوْرَاءُ تُقَهْقِهُ۔ فَقُلْتُ لَهَا: تَكَلَّمِي، لِمَنْ أَنْتِ؟ قَالَتْ: لِلْمَقْتُولِ شَهِيداً عُثْمَانَ۔

یہ حدیث محمد بن سلیمان بن ہشام کی وجہ سے موضوع ہے۔ خطیب بغدادیؒ لکھتے ہیں: یہ حدیث وضع کیا کرتا۔ امام ذہبیؒ نے بھی میزان الاعتدال (۳/۵۷) میں اسے جھوٹا قرار دیا ہے۔ ابن عدیؒ کہتے ہیں: یہ حدیث متصل بناتا اور چوری کرتا تھا۔

اس کا رتبہ: آپ ﷺ کی طرف منسوب شدہ یہ روایت بدترین کوشش ہے۔ اسی کے مرتبہ سے ملتی جلتی روایت متروک کی بھی ہے۔ پھر منکر کی، اس کے بعد معلل کی اور پھر مدرج، مقلوب اور مضطرب کی۔

وضاع لوگ:

......**زنادقہ:** یہ سیکولر اور دین دشمن لوگ (Heretics) ہیں جو ہر وقت دین دشمنی میں تپتے اور جلتے رہتے اور اہل دین کو بدنام کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان کا کام دین دشمنوں کے ہاتھوں کھیلنا ہوتا۔ اسلام کے خلاف بکتے مگر ساتھ ہی اسلام کا نام بھی لیتے۔ قرآن کریم کو نہیں چھیڑتے تھے کیونکہ اس میں کسی ترمیم وتحریف کا بس نہیں چلتا مگر حدیث رسول میں شک پیدا کرتے۔ اضافے کرتے اور پھیلا دیتے تھے۔

......**قصاص:** (Story-Teller) یہ قصہ گو واعظ تھے جو محفل آباد رکھنے کے لئے قصوں اور حکایات سے کام لیتے۔ طلب شہرت، پیسہ اور حب جاہ کے حریص یہ لوگ پرکشش اور دلفریب خطابت کا ملکہ رکھتے۔ احادیث میں اضافہ اور حاشیہ نگاری سے اپنی مجالس کو آباد کرنا ان کے دائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جس سے یہ مرض متعدی ہوا اور امت اس کے اثرات اب بھی دیکھتی ہے۔ اسی طبقے نے موضوع احادیث کے انبار لگائے۔

معلوم یہی ہوتا ہے کہ عوام کے نزدیک اہمیت ہمیشہ انہی پرجوش واعظین کی رہی ہے نہ کہ اہل علم کی۔ وہ انہیں ہی سب سے بڑا عالم سمجھتے ہیں۔ جاہل عوام کے شوق کو بلیک میل کرنا، قرآن وسنت سے دور کر کے معاشرے میں دینی روح کو ختم کرنا انہیں واعظ حضرات کا کام ہے جو دین کے لئے بڑے نقصان دہ ثابت ہوئے ہیں۔ دین کی اہم بات کو غیر اہم اور غیر اہم بات کو اہم دین بنا دیتے ہیں۔ جس نے نتیجۃً بیشمار خرافات وبدعات کو بھی جنم دیا ہے۔

......**عابدوں اور زاہدوں کا ایک گروہ:** (Ascetics)۔ ان کے زہد وعبادت کے باوجود ان میں کیا بگاڑ تھا اور ہے؟ وہ ان کے اثرات سے نمایاں ہے۔ انہیں یہ سوجھا کہ لوگوں کو دین کے قریب کم مگر اپنے قریب زیادہ کیسے لایا جائے؟ چنانچہ سورتوں کے فضائل، مختلف اذکار، ان کی معین تعداد، اوقات اور حرکات وحالات پر اپنے تجربوں کو انہوں نے حدیث بنا کر پیش کیا۔ اعمال کی فضیلت پر غیر معمولی اجر وثواب بتا کر حرام وحلال کی تمیز ختم کی اور معمولی سے گناہ کی سخت ترین سزا سنا کر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس کیا۔ معاشرے میں اپنی حالت ایسی بنائی کہ نہ کمانے کی فکر اور نہ ذمہ داری اٹھانے کے مکلّف۔ جس سے غیروں نے یہی نتیجے نکالے کہ اگر اسے دین

کہتے ہیں تو میں اس سے بھلا۔

ان میں غلام خلیل نے شہرت پائی جس کی وفات پر بغداد کے بازار بند ہو گئے۔لیکن بلا خوف وہ احادیث گھڑتا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تم نے یہ احادیث کیوں گھڑیں؟ جواب یہی تھا: لِنُرَقِّقَ قُلُوْبَ النَّاسِ۔ تاکہ ہم لوگوں کے دلوں کو نرم کریں۔ یہی جذبہ فضائل اعمال میں کارفرما ہوتا ہے جس کی نمائندگی خلیل جیسے افراد نے کی اور اپنے زعم میں لوگوں کو دین کی دعوت موضوعہ احادیث سے دینا مناسب سمجھی۔ جب ایسے افراد کو احادیث گھڑنے کی وعید سنائی جاتی تو کہتے: نَحْنُ نَكْذِبُ لَهُ لَا عَلَيْهِ۔ ہم آپ ﷺ کے لئے جھوٹ گھڑتے ہیں نہ کہ آپ کے خلاف۔

آج بھی یہ افراد موجود ہیں جو صحیح احادیث کی موجودگی کے باوجود ان موضوع احادیث پر عمل کرنے میں بڑے متشدد Stubborn ہیں۔ کتنی بدقسمتی ہے کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ شہرت جن بیانات کی ہے وہی علمی اعتبار سے سب سے زیادہ غیر معتبر اور ناقابل تسلیم ہیں۔ یہی حال ہر علم وفن کا ہے۔

...... **متعصب لوگ:** مذہبی عناصر نے بھی محض اپنے فقہی مسلک کی تائید وتوثیق کے لئے وضع حدیث میں اپنا حصہ ڈالا۔ شیخ عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں:

> قَوْمٌ حَمَلَهُمْ عَلَى الْوَضْعِ التَّعَصُّبُ الْمَذْهَبِيّ، وَالتَّجَمُّدُ التَّقْلِيْدِيّ، كَمَا وَضَعَ مَأْمُوْنُ الْهَرَوِيُّ حَدِيْثَ مَنْ رَفَعَ يَدَيْهِ فَلَا صَلوٰةَ لَهُ، وَوَضَعَ حَدِيْثَ مَنْ قَرَأَ خَلْفَ الْإِمَامِ فَلَا صَلوٰةَ لَهُ۔ (الآثار المرفوعة:۱۲) ایک گروہ ایسا بھی ہے جنہیں حدیث سازی کے لئے مذہبی تعصب اور تقلیدی جمود نے ابھارا۔ جس طرح مامون ہروی نے یہ روایت وضع کی: جو نماز میں رفع یدین کرے گا اس کی نماز نہیں۔ یا یہ روایت اس نے وضع کی: جو امام کے پیچھے قرائت کرتا ہے اس کی نماز نہیں۔

یہ محدثین کرام ہی تھے جو تحقیق وتفتیش کی زحمت اٹھاتے اور ایسا رجحان نہیں رکھتے تھے کہ ضعیف، بے اصل اور موضوع چیز کو بھی قبول کرلیں۔ ہمارے معاصر عظیم مفسر، فقیہ اور شیخ الحدیث لکھتے ہیں:

> ایسے لوگوں کو علم ہونا چاہئے کہ عربی زبان میں اگر یہ کہا جائے: كَذَبَ عَلَى فُلَانٍ: اس نے فلاں پر جھوٹ بولا۔ اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس نے اس پر جھوٹ گھڑا۔ اور ایسی بات اس کی طرف منسوب کی جو اس نے نہیں کہی۔ خواہ یہ اس

کے حق میں ہو یا اس کے خلاف ہو۔ کسی بادشاہ کو اگر کوئی کہے کہ فلاں نے آپ کی بڑی تعریف کی اور ہر موقعے پر آپ کے حق میں اچھے کلمات کہے۔ بادشاہ خوش ہو کر حکم دے: اسے ہزار دینار، ایک گھوڑا اور ایک گھر وغیرہ دے دو۔ کیا یہ اس پر جھوٹ ہے یا نہیں؟ کیا یہ سوال کرنا درست ہوگا: آدمی نے بادشاہ پر جھوٹ بولا یا نہیں؟ ظاہر ہے اس نے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ باقی اس شخص کی طرف جو بات اس نے منسوب کی وہ تو یقیناً جھوٹ ہے۔ اس لئے جتنی بھی انسان تاویلات کر لے آپ ﷺ پر بولا ہوا جھوٹ جھوٹ ہی ہے خواہ نیت کتنی ہی اچھی ہو۔ آیات اور احادیث صحیحہ ایک مسلمان کے لئے کافی ہیں اسے اس جھوٹے سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ صحیح حدیث بتائے جو سبھی کو ضعیف اور موضوع سے پرے کر دے گی۔ (شرح نزہۃ النظر از محمد بن صالح)

۲۔ **جھوٹ کی تہمت**: جب کسی قاعدے اور اصول کی مخالفت کسی حدیث سے ہو رہی ہو اور جسے صرف ایک راوی روایت کر رہا ہو تو اس راوی پر جھوٹ کی تہمت آ جاتی ہے مگر اسے جھوٹا قرار نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ وہ ایسی روایت کر رہا ہوتا ہے جو معلوم شرعی قاعدے کے مخالف ہے اور جو بطور جھوٹ منتشر ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک خطیب کی کسی بات کو سینکڑوں لوگوں نے سنا مگر اس کی یہ بات صرف ایک ہی صاحب روایت کریں اور باقی خاموش رہیں یا لاعلمی کا اظہار کریں تو ایسی بات پر جھوٹ کی تہمت لگ سکتی ہے۔ اس کی حدیث متروک کہلاتی ہے۔

یا جھوٹ سے وہ راوی متہم ہو سکتا ہے جو بدعت کا داعی ہو اور حدیث رسول کو اپنی بدعت کی تقویت کے لئے پیش کر رہا ہو۔ بدعتی یہ کام کر لے گا مگر اپنی بدعت کو نہیں چھوڑے گا کیونکہ وہ اسے قابل ثواب شے سمجھتا ہے۔

کبھی راوی اور مروی دونوں میں کوتاہی و تقصیر ہوتی ہے جس کی بنا پر جھوٹ کا اتہام لگتا ہے۔ مثلاً راوی ایسی بات حدیث میں روایت کر دے جس کا کہنا رسول اکرم ﷺ سے محال ہو اور عام قاعدے کے بھی خلاف ہو۔ ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جاتا کہ اس نے عمداً جھوٹ بولا ہے مگر راوی پر جھوٹ کی تہمت لگ جاتی ہے۔ اسے طعن کہتے ہیں۔ اب ان دونوں میں سے کس کا کردار زیادہ بھیانک ہے؟ جھوٹے کا یا جھوٹ سے متہم ہونے والے کا؟ جواب یہی ہے: جھوٹا راوی زیادہ خطرناک ہے۔ ایسے راوی کی روایت عموماً ترک کر دی جاتی ہے اور اسے یا اس کی روایت کو متروک کہہ دیتے ہیں۔

متروک:

هُوَ الْحَدِيثُ الَّذِيْ يَكُونُ أَحَدُ رُوَاتِهِ مُتَّهَمًا بِالْكَذِب ولا يُعْرَفُ الحديثُ إلا مِنْ جِهَتِهِ مُخَالِفاً لِلْقَوَاعِدِ المَعْلُومَةِ۔ ہر وہ حدیث جس کا کوئی راوی جھوٹ سے متہم ہو۔ اور ایسی حدیث صرف اسی راوی ہی کی طرف سے پہچانی جاتی ہے کیونکہ وہ عام معلوم قاعدوں کے مخالف ہوتی ہے۔

اگر ایک امام جرح وتعدیل کسی راوی کی احادیث کھنگالنے کے بعد بطور ثبوت یہ کہہ دے کہ یہ اس روایت میں جھوٹ بولتا ہے۔ ایسا راوی جھوٹا ہونے کی وجہ سے ترک کردیا جاتا ہے۔ اور اس اتہام کی وجہ سے اس کی حدیث متروک کہلاتی ہے۔

محدثین کی یہ شرط کہ اس کا روایت کردہ متن معلوم قواعد کے مخالف ہو۔ متروک وموضوع دونوں میں ہوسکتی ہے۔ خاص طور پر جب یہ متہم راوی اپنی روایت میں منفرد ہو اور کسی نے اس کی متابعت نہ کی ہو۔ مثلاً:

جُوَيْبِرُ بْنُ سعيدِ الأزدِيُّ، عَنِ الضحَّاكِ، عَنِ ابْنِ عَباسٍ عَنِ النبيِّ ﷺ قَالَ: عَلَيْكُمْ بِاصْطِنَاعِ الْمَعْرُوفِ، فَإِنَّهُ يَمْنَعُ مَصَارِعَ السُّوءِ، وَعَلَيكُم بِصَدقَةِ السِّرِّ فَإِنَّهَا تُطْفِئُ غَضَبَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ۔ (قضاءُ الحوَائِجِ: ٦)

اس سند میں جویبر راوی کے بارے میں امام نسائی ودارقطنی کا کہنا ہے: مَتْرُوكُ الْحَدِيثِ۔ ہے۔ امام ابن معینؒ کہتے ہیں: لَيْسَ بِشَيْءٍ جس کا مطلب ان کے ہاں متروكُ الحَديثِ کا ہی ہے۔

تنبیہ: بعض علماء حدیث اس قسم کی حدیث کے راویوں کو متروك کہنے کی بجائے ذرا وسعت سے کام لیتے ہوئے انہیں یا ان کی حدیث کو مطروح کہہ دیتے ہیں یا کچھ ایسی حدیث کو واہٍ کہتے ہیں۔ چونکہ اس کی (Cradibility) ختم ہو چکی ہوتی ہے اس لئے ایسے شخص کی روایت رد ,اتی ہے جسے کوئی تائیدی یا شاہدی حدیث بھی قابل قبول نہیں بنواسکتی۔ بہر حال ایسے متروک رواۃ کی حدیث اس ضعیف حدیث سے کم تر درجہ رکھتی ہے جس کا کوئی مثیل آکر اسے مُنْجَبِر کردیتا ہے مگر موضوع حدیث سے ادنی درجے کی ہوا کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔

۳۔ **فسق:** فسق عربی میں نکلنے کو کہتے ہیں۔ چوہیا کو اس بنا پر فاسقہ کہتے ہیں کہ بل سے نکل کر وہ خرابیاں کرتی ہے۔ شرعاً جو شخص قول وفعل میں اللہ کی اطاعت سے نکل کر اتنا آگے چلا جائے کہ کفر تک جا پہنچے۔ فاسق کہلاتا ہے۔ محدثین کرام جو تارک نماز ہوتا اس سے حدیث روایت کرنا مناسب ہی نہ سمجھتے۔ اور جس کی معصیت ظاہر ہوتی علماء اس کی روایت سے کوئی حجت بھی نہ لیتے۔ خلافت عباسیہ کا بڑا شاعر ابونواس تھا۔ اس کا فسق اس کی عریاں شاعری تھی۔ اس لئے اسے روایت کا اہل نہیں سمجھا گیا۔ (المیزان ۴/۵۸۱)

غیبت کرنا قولی فسق ہے اور جھوٹ سے متہم ہونا فعلی فسق ہے۔ حرام وحلال یا واجب ومباح کو جانتے ہوئے پھر بھی راوی صغیرہ وکبیرہ گناہوں پر ڈٹا رہے مگر توبہ نہ کرے وہ فاسق ہے اور جو صغیرہ پر جما رہے اور باز نہ آئے وہ بھی فاسق ہے۔ مثلاً راوی جھوٹ بولتا ہے مگر حدیث میں نہیں۔ یہ فاسق ہے۔ اسی طرح ڈاڑھی شیو کرنے والا مرد یا بھنویں بنانے والی خاتون بھی فاسق ہے۔ فاسق کی خبر بالکل رد نہیں کی جاتی اور نہ ہی بالکل قبول کی جاتی ہے۔ لہذا وہ پہلے دو کے مقابلے میں درجے میں کم ہوگا۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿..إن جاء كم فاسق بنبإ فتبينوا..﴾ اگر تمہارے پاس فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو۔ اس لئے اس کی خبر کی تحقیق ہوگی پھر اسے رد یا قبول کیا جائے گا۔ اس فسق کا تعلق عدالت سے ہے۔

۴۔ **جہالت:** اس کا تعلق عدالت اور ضبط دونوں سے ہے۔ ایسا راوی دینی اعتبار سے بھی مجہول ہوتا ہے یعنی اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ عادل ہے یا نہیں؟ اسی طرح ضبط کے اعتبار سے بھی اس کی لاعلمی رہتی ہے کہ وہ ضابط بھی ہے یا نہیں؟ یہ راوی آخری مرتبہ کا ہوتا ہے کیونکہ اس میں احتمال ہے کہ وہ ضابط یا عادل ہو۔ بطور خاص جب وہ حدیث رسول بیان کرے تو کیا اس کی حدیث قبول کی جائے یا رد کی جائے؟ ایسے مختلف درجات کے رواۃ کی تمام احادیث محدثین رد کردیتے ہیں جب تک کہ ان کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا۔ اسی طرح جہالت کی متعدد وجوہات ہوتی ہیں۔ مثلاً:

أ. جب راوی کی بے شمار صفات ہوں مثلاً: نام، کنیت، لقب، یا کوئی صفت یا نسب وغیرہ۔ مگر راوی ان میں کسی ایک سے مشہور ہو۔ مگر دوسرا راوی اپنی کسی خاص غرض کے لئے اسے غیر معروف نام سے ذکر کردے۔ اور سامع

اسے کوئی اور سمجھے۔ یہی راوی کی جہالت ہے۔

ب۔ جب راوی روایت حدیث میں مقل ہو۔ یعنی اس کی روایات کم ہوں۔

ج۔ اس کا نام غیر واضح ہو۔

ا. **مجہول راوی:** اسے کہتے ہیں جو علمائے حدیث کے ہاں طلب علم میں محنت اور اس کی خاطر رحلہ کرنے میں غیر معروف ہو۔ راوی کی جہالت کی وجہ سے اس کی روایت رد کردی جاتی ہے۔ یہ جہالت دو قسم کی ہوتی ہے:

ب۔ **مجہول العین:** ظاہری اور باطنی طور پر اس کی عدالت کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا اس لئے اسے مجہول العین کہتے ہیں۔ یہ جہالت اس راوی کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے جو طلب علم میں مشہور ہو اور نہ ہی علماء حدیث اسے جانتے ہوں۔ جس سے سوائے ایک شخص کے کسی اور نے روایت نہ کی ہو۔ اسی طرح علماء حدیث میں سے کسی نے نہ اس پر جرح کی ہو اور نہ ہی تعدیل۔ جیسے شدادالطائی، جبار، مالک بن الأغر اور قیس بن کریم احدب۔ ان میں ہر ایک سے سوائے ابواسحٰق السبیعی کے اور کسی نے روایت نہیں کی۔ جہالت کی وجہ سے محقق علماء حدیث کے ہاں اس کی روایت نا قابل قبول ہے کیونکہ صحت حدیث کے لئے ان کی یہ شرط ہے کہ راوی ثقہ اور ضابط ہو۔ مگر جس سے صرف ایک ہی راوی روایت کرے اور ثقات میں سے کسی نے اس کی توثیق نہ کی ہو تو وہ ثقہ وضابط کیسے ہوسکتا ہے؟

اس قسم کی جہالت سے جو راوی موصوف ہوئے ہیں ان میں حفص بن ہاشم بن عتبہ ہے جس سے سوائے عبداللہ بن لہیعہ کے کوئی اور روایت نہیں کرتا۔ اور نہ ہی کسی نے اس کی جرح وتعدیل کی ہے۔ مثلاً:

حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيْدٍ، حَدَّثَنَا ابْنُ لَهِيْعَةَ، عَنْ حَفْصِ بْنِ هَاشِمِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ، عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ، عَنْ أَبِيهِ يَزِيدَ بْنِ سَعِيدِ الْكِنْدِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا دَعَا فَرَفَعَ يَدَيْهِ مَسَحَ وَجْهَهُ بِيَدَيْهِ۔ رسول اکرم ﷺ جب دعا کرتے تو اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے اور انہیں چہرہ مبارک پر ملتے۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

لَيْسَ لَهُ ذِكْرٌ فِي شَيْءٍ مِنْ كُتُبِ التَّوَارِيْخِ، وَلَا ذَكَرَ أَحَدٌ أَنَّ لِابْنِ عُتْبَةَ ابْناً يُسَمَّى حَفْصاً۔ نہ

تو کتب تواریخ میں ان صاحب کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہی کسی نے یہ ذکر کیا ہے کہ ابن عتبہ کا کوئی بیٹا حفص نامی تھا۔

اس طرح یہ راوی مجہول العین ہیں۔ امام ابنؒ حبان اس رائے سے متفق نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف ایک راوی نے اس سے روایت کی لیکن اس پر کسی کی جرح بھی تو نہیں لہذا وہ ثقہ ہے۔ اس لئے ایسے شخص کو انہوں نے اپنی کتاب الثقات میں لکھا ہے اور ابن الہیثمی نے بھی مجمع الزوائد میں اسی پر اعتماد کیا ہے۔

ب۔ **مجہول الحال**: یہ راوی بظاہر جانا بوجھا مگر باطنی طور پر اس کی عدالت کا علم نہیں ہوتا۔ اسے مجہول العدالۃ بھی کہتے ہیں۔ مگر اس کی جہالت اندرونی ہوتی ہے بیرونی نہیں۔ اسے **مستور** بھی کہتے ہیں۔ جس سے طلب حدیث میں مشہور ایک سے زائد افراد روایت کرتے ہیں مگر کسی ناقد نے اس کی توثیق نہیں کی ہوتی۔ خطیبؒ بغدادی فرماتے ہیں:

وَأَقَلُّ مَا تَرْتَفِعُ بِهِ جِهَالَةُ الْعَيْنِ أَنْ يَرْوِيَ عَنِ الرَّجُلِ اثْنَانِ فَصَاعِداً، إِلَّا أَنَّهُ لَا يَثْبُتُ لَهُ حُكْمُ الْعَدَالَةِ بِرِوَايَتِهِمَا۔ کم از کم جہالت عین جس چیز سے دور ہوتی ہے وہ اس سے دو یا دو سے زائد راویوں کا روایت کرنا ہے مگر یہ بھی یاد رہے کہ دو راویوں کی روایت سے اس کی عدالت ثابت نہیں ہو سکتی۔

علماء حدیث خواہ قدیم ہوں یا جدید ان کا موقف یہی ہے۔ اس نوع کی جہالت سے یزید بن مذکور ہی موصوف ہوئے ہیں۔ جن سے وہب بن عقبۃ، ان کا اپنا بیٹا مسلم اور القاسم بن الولید روایت کرتے ہیں۔ مگر ان کی توثیق کسی نے بھی نہیں کی۔ مثلاً: امام بیہقیؒ (۳) بہ سند:

الْقَاسِمُ بْنُ الْوَلِيدِ عَنْ يَزِيدَ۔۔أُرَاهُ ابْنُ مَذْكُورٍ۔۔ أَنَّ عَلِياً رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ رَجَمَ لُوطِياً۔

روایت کی ہے۔ اس سند میں یزید مجہول الحال ہے۔

☆...... امام ابن ابی حاتم مجہول اسے کہتے ہیں جسے وہ خود نہیں جانتے۔ اس لئے وہ اس پر ضعیف یا ثقہ ہونے کا حکم نہیں لگاتے۔ ورنہ ثقات محدثین اس سے روایت کرتے ہیں۔ جیسے داؤد بن یزید ثقفی۔ (المیزان ۲/۴/۲۷)

☆...... امام احمد بن حنبل جب یہ کہہ دیں: ما أعرفه۔ میں اسے نہیں جانتا۔ ان کی مراد مجہول ہوتی ہے۔

ج. **مبہم:** یہ بھی جہالت کی ایک قسم ہے۔جس کی تعریف علماء نے یہ لکھی ہے:

تعریف: هُوَ مَعْرِفَةُ مَنْ أُبْهِمَ ذِكْرُهُ فِي الإِسْنَادِ، وَالْمَتْنِ۔ ایساراوی یا شخص جس کا سند یا متن میں نام نہ لیا گیا ہو۔

☆......راوی کا یہ کہہ دینا: حدَّثَنِي الثِّقَةُ مجھے ایک ثقہ نے حدیث بیان کی۔ یا حَدَّثَنِي مَنْ أَثِقُ بِهِ مجھے ایک ایسے شخص نے حدیث بیان کی جس پر میں اعتماد کرتا ہوں۔ یا حَدَّثَنِي مَنْ لَا أَتَّهِمُ مجھے ایسے شخص نے حدیث بیان کی جسے میں جھوٹا نہیں کہہ سکتا۔ یا رجل یا امرأة یا فلان بن فلان یا زوج فلانة یا زوجة فلان وغیرہ کے الفاظ ہوں۔ گو راوی اس کی تعدیل کر رہا ہوتا ہے پھر بھی یہ ابہام نا قابل قبول ہے۔ کیونکہ جس کی ذات غیر معلوم ہے اس کی عدالت کیسے معلوم ہوگی؟ چونکہ یہ راوی غیر واضح ہوتا ہے اس لئے اس سند میں علماء حدیث طعن کرتے ہیں۔ مثلاً: مسند احمد میں ہے:

قال الإمامُ أحمدُ بنُ حنبلٍ: ثَنَا أبو كاملٍ حَمَّادٌ عن عمران الجُونِيِّ عن رجلٍ عَنْ أبي هريرة مرفوعاً: إِنْ أَرَدتَّ تَلْيِيْنَ قَلْبِكَ فَأَطْعِمِ الْمِسْكِيْنَ وَامْسَحْ رَأْسَ الْيَتِيْمِ۔

اس سند میں عن رجل مبہم نام ہے اس سے مراد کون ہے؟ اس ابہام کی وجہ سے حدیث میں ضعف آ گیا ہے۔ بعض محدثین اسے مجہول بھی کہہ دیتے ہیں۔

☆......کبھی کبھار سند میں راوی کی نسبت کی وجہ سے دیگر رواۃ اس کا نام نہیں لیتے۔ خواہ نسبت کسی شہر یا حرفت کی طرف ہو یا راوی میں عاھة یعنی گفتگو کی کمزوری یا جسمانی عیب ہو۔ مثلاً: سنن ابی داود(۱) میں یہ سند:

محمدُ بْنُ مُهَاجِرٍ، عَنْ عُرْوَةَ بْنِ رُوَيْمٍ، قَالَ حَدَّثَنِي الأَنْصَارِيُّ: أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: لِجَعْفَرٍ۔۔۔فَذَكَرَ حَدِيثَ صَلاَةِ التَّسَابِيْحِ۔

اس سند میں انصاری کون ہیں؟ اصل نام ذکر نہیں کیا۔ یہ ایک عیب ہے جو ابہام کر کے پیش کیا گیا ہے۔

☆......یہ بھی ایک رائے ہے کہ معدل عالم ہو اور امین بھی، وہ اگر حَدَّثَنِي مَنْ أَثِقُ بِهِ کہہ دے تو یہ ابہام قبول کر لیا جائے گا۔ کیونکہ معدل عالم، توثیق کے ساتھ اسے مقبول بھی کہہ رہا ہے۔ جیسے عبد اللہ بن احمد بن حنبل کا کہنا ہے:

كُلُّ شَيْءٍ فِي كِتَابِ الشَّافِعِيِّ: أَنَا الثِّقَةُ فَهُوَ عَنْ أَبِي ۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب میں ہر وہ حدیث جو أنا الثقة سے ہے وہ میرے والد کی طرف سے ہے۔

☆..... امام مسلمؒ اکثر و بیشتر اسانید میں صرف نام کو ذکر کر کے اس کی نسبی وضاحت کر دیتے ہیں تا کہ ابہام نہ رہے اور قاری نام کی طرف متوجہ ہو۔ مثلاً: حَدَّثَنِي مُحَمَّدٌ أي ابْنَ إبراهِيمَ الْخَلِيلِيِّ ۔

☆..... محدثین جس پر تنقید کرتے اسے مجہول کہنا درست نہ سمجھتے۔ محمد بن الفضل راوی پر بڑے بڑے محدثین نے نقد کی ہے۔ مگر اس کے بارے میں یہ نہیں کہا: لَا يُدْرَى مَنْ هُوَ؟ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کون ہے؟ جن میں امام احمد، ابن ابی شیبہ، الفلاس اور ابن حبان وغیرہ ہیں۔ مگر ابن حزم نے کہا ہے: مجهول۔ وہ مجہول ہے۔ جبکہ وہ ترمذی اور ابن ماجہ کے راوی ہیں۔ اور اپنے زہد اور عبادت کے باوجود بالاتفاق متروک وضعیف ہیں۔

مبہم روایت کا حکم: حدیث مبہم مجہول العین جیسی حدیث ہوتی ہے کیونکہ اس میں راوی کی شخصیت اور حالت معلوم نہیں ہوتی تا کہ حدیث دلیل بنے اور قبول کی جائے۔ ہاں اگر معلوم ہو کہ راوی کون ہے تو اس پر وہی قاعدہ لاگو ہو گا جس کا وہ متقاضی ہو گا۔ اور اگر مبہم صحابی ہو تو اس کا یہ ابہام حدیث کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اس لئے کہ الصَّحَابَةُ كُلُّهُم عُدُولٌ ۔

مبہم متن: متن حدیث میں بھی کبھی مبہم نام آتے ہیں جیسے رَجُلٌ، یا امْرَأَةٌ وغیرہ۔ ایسا ابہام عموماً صحت حدیث کے لئے مضر نہیں ہوا کرتا کیونکہ اصل غرض رواۃ حدیث سے ہے نہ کہ ان سے جو متن میں آ گئے ہیں۔ لیکن اگر متنی گفتگو کا انحصار کسی مبہم پر ہو تو وہاں محدثین کو وضاحت مطلوب ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اس حدیث کے متن پر ابہام کا قاعدہ نافذ ہو گا۔

کتب: امام خطیب بغدادی رحمہ اللہ کی اس موضوع پر بہت عمدہ کتاب مُوَضِّحُ أَوْهَام ہے۔ ابن بشکوال کی الغوامض والمبهمات، امام نووی کی الإشارات إلى المبهمات، ولی الدین العراقی کی المستفاد من مبهمات المتن وغیرہ۔

۴۔ **بدعت:** راوی میں جرح کا ایک سبب بدعت کا ہونا بھی ہے۔ لغت میں بدعت نئی شے کے آغاز کرنے کو کہتے ہیں۔ جس کی سابق میں مثال نہ ملتی ہو۔ جیسے سیدنا عمرؓ نے قیام رمضان کے بارے میں فرمایا: نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهِ۔ یعنی یہ نئی چیز ہے جو پہلے نہیں تھی اگرچہ ماضی میں اس کی کوئی تردید نہیں ملتی بلکہ اس کا ناطہ اس سنت سے ہے جو آپ ﷺ نے تین رات باجماعت تراویح پڑھائی اور پھر اسے فرض ہونے کے خوف سے چھوڑ دیا۔

اصطلاح محدثین میں: الحَدَثُ فِي الدِّيْنِ بَعْدَ الإِكْمَالِ: بدعت دین مکمل ہونے کے بعد اس میں نئی چیز دین بنا کر داخل کر دینا ہے۔ یعنی ہر وہ کام بدعت ہے جو بطور ثواب وعبادت کیا جائے اور رسول اکرم ﷺ جس ثواب وعبادت پر تھے اس کے مخالف ہو۔ بدعت بھی حدیث کو ضعیف بنا دیتی ہے۔ اس کا تعلق عدالت سے ہوتا ہے اور راوی دین سے عدل نہیں کر رہا ہوتا۔

اقسام: دین میں ایسی محدثات کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ **بدعت کبری:** اسے بدعت مکفرہ بھی کہتے ہیں۔ ایسی بدعت کے مرتکب چونکہ کفر کی حد تک جا چکے ہوتے ہیں اس لئے ان کی احادیث کو لینے یا سننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی قدری، انکار تقدیر کے لئے کسی حدیث کو سنائے یا روایت کرے۔ یا کوئی رافضی اپنا یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالی، سیدنا علیؓ میں حلول کر گیا ہے۔ اور اپنے اس عقیدے کے ثبوت کے لئے آیات واحادیث کو غلط معنی پہنا دے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

الْمُبْتَدِعُ الَّذِيْ يُكَفَّرُ بِبِدْعَتِهِ لَا تُقْبَلُ رِوَايَتُهُ بِالاتِّفَاقِ۔ جو بدعت مکفرہ کا مرتکب ہے اس کی روایت تو بالکل قبول نہیں کی جا سکتی۔

۲۔ **بدعت صغری:** یہ بدعت مفسقہ بھی ہے۔ اس کی روایت لینے میں علماء کی پانچ آراء ہیں:

۱۔ اسے بالکل رد کر دیا جائے۔ ۲۔ قبول کر لی جائے۔ ۳۔ اگر وہ حدیث اپنے اعتقاد کو پیش کرنے کے لئے روایت نہیں کر رہا تو لے لی جائے ورنہ نہیں۔ یہ قول امام شافعیؒ، سفیان ثوریؒ، ابو یوسفؒ القاضی کا بیان کیا گیا ہے۔ امام رازیؒ کہتے ہیں: یہی بات حق ہے۔ ابنؒ دقیق العید نے بھی اقوال میں اسے ہی ترجیح دی ہے۔ ۴۔ جو داعی نہ ہو اس کی روایت قبول کر لی جائے ورنہ نہیں۔ یہ امام احمدؒ، ابنؒ مہدی، ابنؒ المبارک، ابن معینؒ، ابنؒ الصلاح اور امام نووی

رحمہم اللہ کا ہے۔۵۔ ہر وہ روایت رد کردی جائے جو اس کی بدعت کو تقویت دے۔ یہ قول امام ابواسحق جوز جانی کا ہے۔

مبتدع کے بارے میں محدثین کا نکتہ نظر

محدثین کرام کا موقف ان بدعتیوں کے بارے میں زیادہ سخت نہیں۔ جس کے بارے میں یہ ثابت ہوا کہ وہ اپنے اوپر جھوٹ کو حرام سمجھتا اور وہ اپنی بدعت کا داعی نہیں اس کی روایت کو قبول کرلیا۔ ورنہ نہیں۔

☆...... جھوٹ بولنا اور گھڑنا ان کا مذہب وایمان تھا۔ اس لئے محدثین ان سے مجتنب رہے۔ اور جو معتدل تھے مگر تبرا، تکفیر صحابہ سے مجتنب نیز سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو منصب خلافت میں اول نمبر پر رکھتے کہ وہ آپ ﷺ کے داماد، اور آپ ﷺ ہی کے خاندان سے تھے مگر سیدنا ابوبکر اور عمر وعثمان رضی اللہ عنہم کو بالترتیب بعد میں خلافت کا مستحق کہتے۔ ایسے حضرات محدثین کے نزدیک شیعہ کہلائے۔

امام ذہبیؒ لکھتے ہیں:

> زمانہ سلف میں ایک غالی شیعہ اسے سمجھا جاتا تھا جو سیدنا عثمان، زبیر، طلحہ، اور معاویہ رضی اللہ عنہم یا ان صحابہ کی شان میں گستاخی وسب وشتم کرے جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے لڑے تھے۔ مگر ہمارے زمانہ میں اب رافضی وہ ہے جو ان سادات کی تکفیر کرے اور شیخین پر بھی تبرا کرے۔ یہ ضال ہے اور مفتری ہے۔ مگر ابان بن تغلب شیعہ راوی بالکل شیخین کی توہین نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا اعتقاد یہ تھا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ شیخین سے افضل ہیں۔ (المیزان ۵/۱)

روافض کی روایت کیا حجت ہے؟ علماء کی تین آراء ہیں:

۱۔ بالکل نہیں۔

۲۔ ہاں رخصت ہے جب تک وہ جھوٹ نہ بولے یا حدیث وضع نہ کرے۔

۳۔ اس میں تفصیل ہے۔ جو صادق رافضی ہے اور جو حدیث بیان کررہا ہے اسے وہ جانتا بھی ہے اس کی روایت قبول کرلی جائے اور جو اپنی بدعت کا داعی ہے خواہ وہ کتنا ہی سچا کیوں نہ ہو اس کی روایت رد کردی جائے۔

اہم نوٹ: جن ثقات رواۃ میں ادنی سی بدعت یا معمولی اوہام کا ذکر محدثین اگر کرتے ہیں تو اس کے فوائد ہیں۔ مثلاً:

ا۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ان کے علاوہ اوثق وارجح راوی ہے جو ان سے معارض ہے یا مخالف ہے تو اس کی حدیث ترجیح پا جائے گی۔ کیونکہ اشیاء کو خدا خوفی اور انصاف سے تولنا چاہیے۔

۲۔ ان محدثین کا مسلک معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے جا تعصب یا گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوتے بلکہ ان میں فکری توسع ہوتا تھا اور برداشت تھی۔ (المیزان ۳/۱۴۱)

إِنِ اشْتَمَلَتْ رِوَايَةُ غَيْرِ الدَّاعِيَةِ عَلَى مَا يُشَيِّدُ بِدْعَتَهُ وَيُزَيِّنُهُ وَيُحَسِّنُهُ ظَاهِرًا، فَلَا تُقْبَلُ، وَإِنْ لَمْ تَشْتَمِلْ فَتُقْبَلُ۔ اگر غیر داعیہ کی روایت بھی اس کی بدعت کو تقویت دیتی یا مزین کرتی یا اسے خوبصورت بناتی ہے تو اس کی روایت بھی قبول نہیں کی جاتی اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر قبول کر لی جاتی ہے۔ (ہدی الساری: ۳۸۲)

ب۔ ضبط راوی میں طعن کے اسباب

راوی کے ضبط میں طعن کی متعدد وجوہات ہوتی ہیں جن سے اس کی حدیث ضعیف ہو جاتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ **فاحش الغلط ہو:** یعنی راوی اداء حدیث کے وقت بکثرت غلطیاں کرتا ہو خواہ وہ دیکھ کر کرے یا اپنے حافظے سے۔ عربی میں فحش بمعنی بکثرت یا بڑا ہونے کے بھی ہے اور غلط کا مطلب صواب سے ہٹا ہوا۔

۲۔ **مغفّل:** جو مجلس حدیث میں چوکنا ہو کر نہ بیٹھے۔ بلکہ غفلت کا شکار ہو۔ مثلاً شیخ حدیث بیان کر رہا ہے اور اس طالب علم کو گھمیری آ رہی ہے۔ کوئی اسے اگر ہلائے تو فوراً پوچھتا ہے: کیا کہا شیخ نے؟ جب وہ غفلت سے متہم ہو گیا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ضبط کس قسم کا ہو گا؟ ان دونوں کی حدیث منکر کہلاتی ہے۔

۳۔ **راوی وہمی ہو:** وہم غلطی تو نہیں مگر اس میں غلطی کی طرح کا یقین نہیں ہوتا بلکہ وہم ہوتا ہے۔ ایسا راوی گمان غالب پر حدیث بیان کر دیتا ہے۔ مگر دوسرا محدث دیکھتا ہے کہ نہ وہ کثیر الخطاء ہے اور نہ ہی عمداً وہ غلطی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ بلکہ اپنی سمجھ کی حد تک وہ درست ہے مگر ہوتا اسے وہم ہے۔ وہم سوء حفظ اور غفلت کے قریب قریب کی چیز ہے۔ اگر ایسا راوی کثیر الوہم ہو تو یہ اس کے ضبط کی کمی ہے جس سے اس کی روایت رد ہو جاتی ہے۔

۴۔ **مخالفت:** یعنی یہ راوی ثقات کی مخالفت کرے۔ وہ اس طرح کہ اپنی روایت میں وہ ہمیشہ ثقات کی روایت کے مقابلے میں اپنی روایت میں کچھ گھٹائے یا بڑھائے یا الفاظ حدیث کو آگے پیچھے کر دے۔ اس مخالفت کی درج

ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں::

ا. **مدرج:** اس کی دو قسمیں ہیں:

أ. مدرج الإسناد: سیاق روایت کو بدل دینا۔ ب۔ مدرج المتن: موقوف کو مرفوع میں داخل کر دینا

۲۔ **مقلوب**: روایت میں تقدیم و تاخیر کر دینا ۳۔ **مزید فی متصل الأسانید**: راوی کا سند میں اضافہ

۴۔ **مضطرب**: راوی کو راوی سے بدل دینا۔ ۵۔ **محرف**: حرف کی شکل بدل دینا۔

٦۔ **مصحف**: نقطوں کو بدل دینا۔

جن کی تفاصیل درج ذیل ہیں:

ا۔ مُدرَج:

یہ لفظ أدرَجَ سے اسم مفعول ہے۔ لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جس پر کوئی شے لپیٹی جائے۔ جیسے ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا آپ ﷺ کے کفن کے بارے میں یہ قول:

كُفِّنَ فِي ثَلاَثَةِ أَثْوابٍ سَحُولِيَّةٍ لَيْسَ فِيهَا عِمَامَةٌ وَلَا قَمِيصٌ، أُدْرِجَ فِيها إِدْرَاجاً۔ آپ ﷺ کو سحولی مقام کے تین کپڑوں میں کفنایا گیا۔ اس میں عمامہ تھا اور نہ ہی کوئی قمیص۔ بس انہی تینوں میں آپ لپیٹ دئے گئے تھے۔

اصطلاحا اس کی تعریف یہ ہے۔

هِيَ أَلْفَاظٌ تَقَعُ مِنْ بَعْضِ الرُّوَاةِ، مُتَّصِلَةٌ بِالْمَتْنِ، لَا يُبَيَّنُ لِلسَّامِعِ إِلَّا أَنَّهَا مِنْ صُلْبِ الْمَتْنِ۔ یہ بعض رواۃ کی طرف سے ایسے زائد الفاظ ہوتے ہیں جو متن میں داخل ہو جاتے ہیں۔ سامع پر بھی واضح نہیں ہوتے۔ مگر وہ الفاظ صلب حدیث سے ہی بتائے جاتے ہیں۔

اقسام: مدرج کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ مدرج سند ۲۔ مدرج متن

مدرج سند: اس کی چند صورتیں ہیں مثلاً:

۱۔ایک ہی حدیث، محدثین مختلف اسانید سے روایت کریں۔ پھران سب سے ایک اور راوی روایت کرے اور ان تمام اسانید کو ایک سند بنالے مگر اختلاف کا ذکر ہی نہ کرے۔

۲۔متن حدیث، ایک راوی کے پاس ہو۔مگراس کا آخری حصہ اس کے پاس کسی اور سند سے ہو۔راوی اسے مکمل حدیث بنا کر پہلی سند سے پیش کردے۔یا راوی اپنے شیخ سے حدیث سنے۔مگراس کا آخری حصہ اس نے اپنے شیخ سے بالواسطہ سنا۔راوی اسے مکمل حدیث کا حصہ بنا کر روایت کرے اور واسطے کا ذکر ہی نہ کرے۔

۳۔راوی کے پاس دو مختلف متن حدیث اور دو مختلف اسانید ہوں۔لیکن راوی ان میں ایک سند پر اکتفاء کر کے روایت کردے۔یا ان میں سے ایک متن کو اسی کی سند سے روایت کرے مگر دوسری حدیث کے متن کو بھی اس کا آخری حصہ بنالے۔

۴۔راوی سند روایت کرے۔اس دوران کوئی مشکل پیش آئے تو اپنی بات کردے۔سامع یہ سمجھے کہ شاید یہ الفاظ بھی اس اسناد کا یا متن کا حصہ ہیں اور پھر وہ بھی آگے اسی طرح روایت کردے۔

مدرج متن: اسے کہتے ہیں:

أنْ يُدْخِلَ أحَدُ الرُّواةِ فِي الْحَدِيْثِ كَلَاماً مِنْ عِنْدِهِ بِدونِ بَيانٍ، إمَّا تفسيراً لِكَلِمَةٍ أوِ اسْتِنباطاً لِحُكْمٍ أو بياناً لِحِكْمَةٍ۔ راوی اپنی طرف سے کوئی کلام حدیث میں بغیر کسی وضاحت کے داخل کردے۔ یہ کلام کسی لفظ کی تفسیر بھی ہوسکتا ہے یا کسی حکم کا استنباط بھی یا کسی حکمت کو بیان کرنے کا سبب بھی۔ (شرح النخبۃ: ۲۴۷، الباعث الحثیث: ۱۰۴)

اس کی آگے تین اقسام ہیں:

۱۔ حدیث **مرفوع** کے ابتداء متن میں ہی راوی چند الفاظ داخل کردے جب کہ ایسے الفاظ صحابی رسول کا استدلال ہوتے ہیں جو اس نے حدیث رسول سے لیا ہوتا ہے مگر سامع یہ سمجھتا ہے کہ یہ بھی متن کا حصہ ہے لیکن ہوتا نہیں۔

مثال: خطیب بغدادی نے تاریخ ۶/۳ میں بہ سند صحیح مسلم یہ حدیث روایت کی ہے:

أبوقَطَنٍ، وَشَبَابَةُ عَن شُعبَةَ، عَن مُحمدِ بنِ زِيادٍ، عَن أبي هريرة قال: قال رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ:

أَسْبِغُوا الْوُضُوءَ، وَيْلٌ لِلأعقابِ مِنَ النَّارِ۔

اس حدیث میں لفظ: أَسْبِغُوا الْوُضوءَ یہ سیدنا ابو ہریرہؓ کے الفاظ ہیں جسے بعد کے راوی نے حدیث کا حصہ بنا کر پیش کر دیا جس کی دلیل صحیح بخاری کی یہ حدیث ہے جو بہ سند:

عَنْ آدَمَ، عَنْ شُعْبَةَ، عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ زِيادٍ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: أَسْبِغُوا الْوُضُوءَ، فَإِنَّ أَبَا الْقَاسِمِ قَالَ: وَيْلٌ لِلأعقابِ مِنَ النَّارِ۔ (صحیح بخاری: ۱۶۵، صحیح مسلم: ۲۴۲)

علماء کا یہ کہنا ہے کہ یہ الفاظ أَسْبِغُوا الْوُضوءَ، دراصل سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی فقاہت اور طرز استدلال ہے کہ انہوں نے ایک فرعی مسئلے کا استنباط نص حدیث سے پیش کیا ہے۔

۲۔ متن کے درمیان ہو۔ متن کے وسط میں یہ ادراج ہوتا ہے جو عموماً کسی لفظ حدیث کی تفسیر ہوتا ہے۔

مثال: امام بخاری نے صحیح (۳) میں بہ سند سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کی ہے جس میں یہ:

فَكَانَ يَخْلُو بِغَارِ حِرَاءَ، فَيَتَحَنَّثُ فِيهِ۔ وَهُوَ التَّعَبُّدُ ۔ اللَّيَالِي ذَوَاتِ الْعَدَدِ۔۔۔) الحدیث۔

اس میں ۔۔ وَهُوَ التَّعَبُّدُ ۔۔ تفسیری جملہ ہے مدرج ہے اور جو اسی حدیث کے راوی امام زہری رحمہ اللہ کی طرف سے ہے۔ مراد یہ کہ گناہ سے بچنے اور علیحدہ رہنے کے لئے غار حرا میں خلوت کو آپ نے اختیار کیا۔

۳۔ متن کے آخر میں ادراج ہوتا ہے۔ مثال: سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت:

إِنَّ أُمَّتِي يُدْعَوْنَ غُرًّا مُحَجَّلِينَ مِنْ آثَارِ الْوُضوءِ۔ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُم أَنْ يُطِيْلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ۔ میری امت روز قیامت پکاری جائے گی تو ان کے اعضاء وضو چمکتے ہوں گے۔ جو اپنے اعضاء چمکا سکتا ہے وہ ضرور ایسا کرے۔ (متفق علیہ)

یہاں بھی محدثین یہی کہتے ہیں کہ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُم۔۔۔ سے آخر تک کے الفاظ دراصل سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی فقاہت اور ان کا طرز استدلال ہے کہ انہوں نے ایک فرعی مسئلے کا استنباط نص حدیث سے پیش کیا ہے۔

مدرَج کی پہچان کیسے ہو؟

مذکورہ بالا طریقوں سے ہم ادراج کو پہچان سکتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ کسی اور سند سے یہی حدیث روایت ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا اضافہ وادراج وہاں نہیں۔

۲۔ راوی خود اقرار کرلے کہ میں نے اضافہ کیا ہے۔

۳۔ اس علم کے ماہر ائمہ اس ادراج کے بارے میں مطلع کردیں۔

۴۔ مقلوب:

هُوَ مَا خَالَفَ فِيهِ الرَّاوِيُّ مَنْ هُوَ أَوْثَقُ مِنهُ فَأَبْدَلَ فِيهِ شَيْئاً بِآخَرَ فِي سَنَدٍ أَوْ مَتْنٍ سَهْواً أَوْ عَمَداً۔ وہ حدیث جس میں راوی اپنے سے بڑے ثقہ کی مخالفت یوں کرے کہ سند یا متن میں سہواً یا عمداً کچھ بدل دے۔

تقدیم وتاخیر کی یہ تبدیلی متعدد صورتیں رکھتی ہے۔ مثلاً:

...... سند کے راویوں میں سے کسی کا نام الٹ دے۔ جیسے نام تھا مرۃ بن کعب اور اسے کعب بن مرۃ بنادیا۔ کیونکہ ان میں ایک کا نام دوسرے کے والد کا ہے۔ یا

...... متن میں ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ بدل دے جیسے حدیث ابن عمر میں وہ یوں کہہ دے: فَإِذَا أَنَا بِالنَّبِيِّ ﷺ جَالِساً عَلَى مَقْعَدَتِهِ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ مُسْتَدْبِرَ الشَّامِ۔ جب کہ الفاظ یوں ہیں: مُسْتَقْبِلَ الشامِ مُسْتَدْبِرَ الْقِبلَةِ۔ یا حدیث ابوہریرہؓ کو وہ یوں پڑھ لے: حَتّٰى لَا تعلم يَمِينُهُ مَا تُنْفِقُ شِمَالُهُ۔ جب کہ حدیث کے الفاظ یوں ہوں: حَتى لا تعلمَ شِمالُهُ ما تُنْفِقُ يَمِينُهُ۔

پہچان: اس تبدیلی کو دوسری درست اور راجح روایت کے ذریعے ہی پہچانا جاسکتا ہے۔ یا خود معنی پر غور کرکے جانا جاسکتا ہے کہ یہ معنی درست نہیں۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ زاد المعاد میں مقلوب کی مثال یوں سمجھاتے ہیں:

إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلَا يَبْرُكُ كَمَا يَبْرُكُ الْبَعِيرُ وَلْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ۔ فرماتے ہیں: یہ حدیث راوی سے تبدیل ہوگئی ہے اور درست یوں ہے: فَلْيَضَعْ رُكْبَتَيهِ قَبْلَ يَدَيْهِ۔ کیونکہ اونٹ جب بیٹھتا ہے تو پہلے وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو آگے رکھتا ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ درست عبارت یہی ہے: فَلْيَضَعْ يَدَيْهِ قَبلَ رُكْبَتَيهِ تو حدیث کا آخری حصہ پہلے حصہ کے مخالف ہوجاتا ہے۔ اس لئے اس کا پہلا حصہ اگر ایک قاعدہ مان لیں تو آخری حصہ بھی مانا جاسکتا ہے۔ جیسے: الأَصْلُ رَدُّ الْمِثَالِ إِلَى الْقَاعِدَةِ۔ اصول یہ ہے کہ مثال کو قاعدہ پر لوٹا لے جائیں۔ اس لئے یہ عبارت درست یوں ہی ہوگی: وَلْيَضَعْ رُكْبَتَيهِ قَبْلَ يَدَيهِ۔ مگر راوی پر یہ عبارت ذرا تبدیل ہوکر آگے پیچھے ہوگئی اور اس نے اسے اور طرح سے پڑھ دیا۔ ایسی تبدیلی سے حدیث میں ضعف آجاتا ہے کیونکہ حدیث کے الفاظ

آگے پیچھے ہوئے تو معنی ہی بدل گیا۔ اور جب معنی ہی بدل گیا تو حدیث، حدیث نہ رہی۔ یا
...... راوی، اسناد حدیث ہی پلٹ دے اور کسی اور متن کی بنا دے۔

ایسی خطأ کا درجہ متعین ہونے کے بعد ہی فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آیا راوی سے وہم ہوا ہے یا اس نے عمداً یہ حرکت کی ہے۔ جو بہت بڑی خیانت اور جھوٹ ہے۔ بہر حال ایسا شخص جو کسی سند کو دوسرے متن کے ساتھ لگا دے اسے سارق حدیث یعنی حدیث کا چور بھی کہتے ہیں جو اس کی عدالت کے لئے بہت ہی بدنما چیز ہے اور اس کی حدیث رد ہو جاتی ہے۔

۳۔ متصل سند میں اضافہ:

هُوَ أَنَّه يَزِيْدُ رَاوٍ فِي الإسنادِ رَجُلاً لَمْ يَذْكُرْهُ غَيرُهُ۔ ایسی حدیث جس کی سند کے راویوں میں راوی ایک آدمی (خواہ نام لے یا اسے مبہم رکھے) کا اضافہ کردے جس کا تذکرہ دیگر راویوں میں سے کسی نے اس سند میں نہ کیا ہو۔

اسے المَزِيْدُ فِي مُتَّصِلِ الأَسَانِيدِ بھی کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ایک ثقہ آدمی حدیث کو سند متصل کے ساتھ یوں روایت کرتا ہے: حَدَّثَنِي ۱ حَدَّثَنِي ۲ حَدَّثَنِيْ ۳ حَدَّثَنِيْ ٤ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ۔ یہ حدیث متصل ہے اس میں چار راوی ہیں۔ اسی طرح ایک اور روایت ہے جس کی متصل سند میں ایک راوی کا مزید اضافہ کر دیا گیا ہے۔ جس نے اضافہ نہیں کیا وہ اس راوی سے زیادہ متقن ہے جس نے اضافہ کیا ہے۔ اس بنا پر محدثین اسے راوی کا وہم قرار دیتے ہیں۔۔ اضافہ کا حکم دو شرطوں سے مشروط ہے:

۱۔ کم سند والا، اضافہ کرنے والے سے ارجح ہو۔

۲۔ کم سند میں راوی سماعت کی صراحت کرے۔ اس لئے مزید فی متصل الأسانید کو ہمیں متصل ہی سمجھنا چاہئے جو پیش کردہ روایت کے طریقے یا سماع پر غور کر کے ہی سمجھ آتی ہے۔ صریح روایت کے ساتھ اس کا عنعنہ بھی فائدہ وتقویت دے سکتا ہے۔

بہتر یہی ہے کہ قرائن ودلائل دیکھ کر اس کا فیصلہ کیا جائے تاکہ صحیح روایت ترجیح پا سکے۔

مثال: امام احمد نے مسند (۲/۳۸۶، ۴۱۶، اور ۴۶۷) میں، صحیح مسلم: ۴۷۵۱ میں اور ابوعوانہ نے (۲/۱۰۹) میں یہ سند:

أبوعَوَانَةَ، عَنْ يَعْلَى بْنِ عَطَاءٍ، عَنْ أَبِي عَلْقَمَةَ، عَن أبي هريرةَ۔رَضی اللّٰهُ عنهُ۔مَرفُوعاً:

مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ، وَمَنْ أَطَاعَ أَمِيْرِيْ فَقَدْ أَطَاعَنِي، وَمَنْ عَصَى أَمِيْرِيْ فَقَدْ عَصَانِي۔

یہی حدیث امام نسائی نے بھی سنن (۲۷۶/۸) میں بہ سند:

أَخْبَرَنَا أبوداود، قَالَ حَدَّثَنَا أبو الْوَلِيدِ، قَالَ حَدَّثَنَا أبوعَوَانَةَ، عَنْ يَعْلَى بْنِ عَطَاءٍ، عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي عَلْقَمَةَ، عَنْ أبي هُريرةَ بِهِ۔

اس سند میں عَنْ أَبِیهِ کا اضافہ انہوں نے کیا ہے۔ یہ ہے مزید فی متصل الأسانید جو عنعنہ کے ساتھ ہے جب کہ صحیح مسلم کی روایت میں یعلی بن عطاء کی اپنے شیخ ابوعلقمہ سے سماع کی صراحت ہے۔

۴۔ مضطرِب

بِكَسْرِ الرَّاءِ ، وَقِيل بِفَتْحِهَا، مَا اخْتَلَفَ الرُّوَاةُ فِي سَنَدِهِ أَوْ مَتْنِهِ وَتَعَذَّرَ الْجَمْعُ فِي ذٰلِكَ وَالتَّرْجِيْحُ۔يَعْنِي رَوَى مَرَّةً عَلَى وَجْهٍ، وَمَرَّةً عَلَى وَجْهٍ آخَرَ مُخَالِفٌ لِلأَوَّلِ عَلَى وَجْهِ التَّسَاوِيْ، وَلَمْ يُمْكِنِ الْجَمْعُ بَيْنَهُمَا۔وَلٰكِنَّهُ مَقْبُولٌ إِذَا دَارَ الإِضْطِرَابُ عَلَى الرُّوَاةِ الثِّقَاتِ الْمُتْقِنِينَ فِي السَّنَدِ كَالزُّهْرِيِّ فَلاَ يُعَدُّ إِضْطِرَاباً اَلْبَتَّةَ، وَإِلاَّ فَضَعِيفٌ وَمَرْدُودٌ۔ وہ حدیث جس کی سند یا متن کو ایک بار کسی ایک راوی یا ایک متن سے روایت کیا جائے اور دوسری بار وہ مختلف ہو مگر درجہ میں دونوں مساوی ہوں۔ روایت میں ایسی مخالفت ہو کہ ان کے مابین جمع یا ترجیح مشکل ہو۔ ہاں یہی حدیث اس وقت مقبول ہوگی جب سند میں اضطراب کا دارومدار ثقہ اور متقن راویوں پر ہو جیسے امام زہری پر، ایسی صورت میں یہ بالکل اضطراب نہیں ہوگا۔ ورنہ وہ ضعیف ہوگی اور مردود۔

مثلاً: ایک محدث زید سے حدیث روایت کرتا ہے۔ پھر یہی حدیث اس سے روایت کرنے والا زید کی بجائے عمرو سے روایت کرتا ہے۔ جس راوی نے زید کا نام لیا اور جس نے اسے عمرو سے بدلا وہ عمرو سے کسی بھی صورت میں ترجیح نہیں پا رہا۔ اسے مضطرب کہتے ہیں کیونکہ رواۃ حدیث اس راوی کے بارے میں مضطرب ہو گئے۔ کسی نے کہا: وہ زید ہے اور کسی نے کہا: وہ عمرو ہے۔ ترجیح کی کوئی صورت وہاں نہیں ملتی۔ اگر ہو تو پھر اضطراب باقی نہیں رہتا۔

سند میں اضطراب: سیدنا ابوبکر صدیق کی یہ حدیث: آپ نبی ﷺ سے عرض کرتے ہیں: یَارَسولَ اللّٰهِ! أَرَاكَ

شِبْتَ؟ قَالَ: شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَأَخَوَاتُهَا۔ امام دارقطنیؒ (العلل ۱/۱۹۳) فرماتے ہیں: یہ حدیث مضطرب ہے۔ اس لئے کہ یہ حدیث صرف ابو اسحٰق السبیعی کی سند سے آئی ہے۔ علماء حدیث نے اس حدیث میں دس وجوہ سے اختلاف کیا ہے۔ کچھ نے ابو اسحٰق سے مرسل روایت کی ہے اور کسی نے اسے مسند ابو بکر بنا دیا ہے اور کوئی اسے مسند سعد کہتا ہے تو کوئی مسند عائشہؓ۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اس لئے ان کے مابین جمع کرنا بہت مشکل ہے اور ترجیح بھی ناممکن۔ ان تمام وجوہ کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنی (النکت: ۳۳۰) میں جمع کر دیا ہے۔

متن میں اضطراب: تسمیہ کی حدیث ہے یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ قرائت فاتحہ سے قبل پڑھنا۔ امام ابن عبد البرؒ نے اس پر اضطراب کی علت لگائی ہے۔

نوٹ: سند میں اضطراب زیادہ ہوتا ہے بہ نسبت متن کے۔

اضطراب کا حکم: اگر ان احادیث میں جمع کرنا ممکن ہو تو کر دیا جائے تاکہ اضطراب ختم ہو۔ جیسے، حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ کے احرام باندھنے والی روایات ہیں۔ آپ ﷺ نے تلبیہ حج افراد کے لئے فرمایا، یا حج تمتع کے لئے یا قران کے لئے؟ یہ سب مختلف روایات موجود ہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَلَا تَنَاقُضَ بَيْنَ ذَلِكَ فَإِنَّهُ تَمَتَّعَ تَمَتُّعَ قِرَانٍ، وَأَفْرَدَ أَعْمَالَ الْحَجِّ، وَقَرَنَ بَيْنَ النُّسُكَيْنِ الْعُمْرَةِ وَالْحَجِّ، فَكَانَ قَارِناً بِاعْتِبَارِ جَمْعِهِ النُّسُكَيْنِ، وَمُفْرِداً بِاعْتِبَارِ اقْتِصَارِهِ عَلَى أَحَدِ الطَّوَافَيْنِ وَالسَّعْيَيْنِ، وَمُتَمَتِّعاً بِاعْتِبَارِ تَرَفُّهِهِ بِتَرْكِ أَحَدِ السَّفَرَيْنِ۔ ان روایات میں باہم کوئی اختلاف نہیں۔ کیونکہ آپ نے فائدہ قران کا ہی اٹھایا اور حج مفرد کے اعمال کئے۔ عمرہ و حج جیسے مناسک کو آپ ﷺ نے جمع کیا۔ دونوں مناسک کو جمع کرنے کے اعتبار سے آپ قارن ٹھہرے اور دو طوافوں اور دو سعیوں میں ایک پر اکتفاء کرنے سے آپ ﷺ مفرد ٹھہرے اور دو سفروں میں سے ایک کو اپنے سکون اور آرام کی خاطر ترک کرنے کے اعتبار سے آپ متمتع بن گئے۔

اصول:...... مضطرب روایات میں جو روایت راجح ہوگئی تو دوسری شاذ یا منکر بن جائے گی۔ اس طرح اضطراب بھی ختم ہو جائے گا۔ جیسے: سیدہ بریرہ رضی اللہ عنہا جب آزاد ہوئیں تو آپ ﷺ نے انہیں اختیار دے دیا کہ تم اپنے خاوند کے ساتھ رہو یا اس سے جدا ہو جاؤ۔ (صحیح بخاری: ۵۰۹۷) کیا ان کے خاوند مغیث غلام تھے یا آزاد؟ اس پر متعدد مختلف روایات ہیں۔ اسود نے ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے: وہ اس وقت آزاد تھے۔ جب کہ عروہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر دونوں ام المؤمنین سے روایت کرتے ہیں کہ وہ غلام تھے۔ اختلاف کی

اس صورت میں عروہ بن زبیر اور قاسم بن محمد کی روایت کو اسود کی روایت پر ترجیح قرابت کی وجہ سے دیں گے اس لئے کہ ام المؤمنین، عروہ کی خالہ اور القاسم کی پھوپھی ہیں۔ رہے اسود تو وہ ایک اجنبی ہیں نیز ان کی روایت میں انقطاع بھی ہے۔ (فتح الباری ۹/۱۶۸)

اصول:...... مضطرب حدیث ضعیف ہوگی اور نا قابل احتجاج بھی۔ کیونکہ اس حدیث کا اضطراب آ گاہی دے رہا ہے کہ اس کی روایت کو ضبط ہی نہیں کیا گیا۔ مقصد حدیث میں جب اضطراب ہی نہ ہو تو پھر اسے اضطراب نام نہیں دینا چاہئے۔ جیسے: فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ نے روز خیبر بارہ دینار کا ایک ہار خریدا جو سونے اور گوہر کا تھا۔ پھر اسے توڑ کر علیحدہ علیحدہ کر کے بیچا تو انہیں بارہ دینار سے زیادہ ملے۔ آپ ﷺ کو بتایا تو تائید کی اور فرمایا: لَا تُبَاعُ حَتّٰی تُفَصَّلَ۔ جب تک اسے علیحدہ علیحدہ نہ کیا جائے اسے مت بیچا جائے۔ کسی روایت میں یہ ہے: فضالہ نے اسے خریدا۔ کسی میں یہ ہے کہ کسی اور نے ان سے اسے خریدنے کا کہا۔ پھر کسی میں ہے: وہ سونے اور گوہر کا تھا۔ کچھ میں سونے کے ساتھ موتی لٹکے ہونے کی بات ہے۔ کسی میں بارہ دینار، تو کسی میں نو دینار قیمت کہی ہے اور کسی میں سات دینار۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> هَذَا لَا يُوجِبُ ضَعْفاً يَعْنِي الْحَدِيْثَ بَلْ بِالْمَقصودِ مِنَ الإِسْتِدْلَالِ مَحْفُوظٌ لَا اخْتِلَافَ فِيهِ، وَهُوَ النَّهْيُ عَنْ بَيْعِ مَا لَمْ يُفَصَّلْ، وَأَمَّا جِنْسُهَا أَوْ مِقْدَارُ ثَمَنِهَا فَلَا يَتَعَلَّقُ بِهِ فِي هَذِهِ الْحَالِ مَا يُوجِبُ الإِضْطِرَابَ۔ یہ اختلاف حدیث کو ضعیف نہیں کر سکتا بلکہ استدلال کا مقصد اس میں بغیر اختلاف کے محفوظ نظر آتا ہے۔ اور وہ اس چیز کی بیع سے روکنا ہے جو علیحدہ علیحدہ نہیں کی گئی۔ باقی اس کی جنس اور اس کی قیمت کی مقدار وغیرہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں جو حدیث میں اضطراب کو واجب ٹھہرائے۔

نوٹ: اصول حدیث کی مبادیات سے ناواقف لوگ آج ان احادیث میں کیڑے نکالتے ہیں جن پر عمل کیا قبول ہی نہیں کرنا چاہتے۔ اس طرح انہیں ہر حدیث میں اضطراب واختلاف نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ توفیق وترجیح کے قواعد سے بے خبری ہے۔ ورنہ یہ اضطراب واختلاف کیا فقہ، تفسیر یا اصول فقہ میں نہیں؟ اور یہ حقیقت ہے کہ حدیث میں اس اضطراب واختلاف کی مثالیں نادر ہی ملتی ہیں جبکہ ایک ہی مسلک کی کتب فقہیہ میں فقہی اختلاف کی بھرمار ہے۔

اصول:......اسی طرح راوی کی شخصیت پر اتفاق کے بعد اس کے نام اور کنیت میں اگر دو احادیث میں اختلاف ہو جائے تو یہ اضطراب نہیں۔ احادیث میں یہ چیز عام ہے۔

۵. محرَّف:

اسے کہتے ہیں کہ حدیث کے لفظ کے حروف تو باقی رہیں مگر اس کے اعراب یعنی حرکت میں تبدیلی واقع ہو جائے۔ مثلاً: کُلاب کو کوئی کِلاب یا سَلام کو کوئی سَلّام پڑھ لے یا جُناح کو جَناح کہہ دے یا لکھ لے۔

۶. مُصَحَّف:

ایسی حدیث جس کے الفاظ میں نقطوں کی تبدیلی ہو جائے۔ مثلاً: عوام بن مراجم کو ابن مزاحم لکھا یا پڑھا جائے یا متن میں کلمہ ستاً اگر کوئی شیئاً پڑھ لے یا لکھ لے۔ یہ تصحیف ہوگی۔ جیسے:

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهرِ۔ جو رمضان کے روزے رکھے پھر ان کے فوراً بعد چھ روزے شوال کے رکھ لے تو اسے پورے سال کے روزوں کا ثواب ملے گا۔

☆......یہ محدثین کی اصطلاح ہے ورنہ مصحف ومحرف دونوں تحریف ہیں۔ تصحیف وتحریف کا علم ہو جانے کے بعد اسے ثابت شدہ صحیح اور اصلی صورت کی طرف لوٹانا اور پڑھنا یا لکھنا چاہئے۔ پھر اس کی صحت یا ضعف کا اندازہ کر کے عمل کرنا یا ترک کرنا چاہئے۔

☆......یہ فن اتنا اہم ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کو کہنا پڑا: وَمَنْ يَعْرِى عَنِ الْخَطَأِ وَالتَّصْحِيفِ۔ کون ہے جو غلطی اور تصحیف سے بچا ہو؟ ۔ یا: مَنْ يُفْلَتُ مِنَ التصحيفِ۔ کون ہے جو تصحیف کی لغزشوں سے بچا ہو؟ بڑے حاذق علماء بھی کچھ نہ کچھ خطأ کر بیٹھے۔ اِلا ماشاءاللہ۔ اس کی وجہ بآسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ بیشتر کتابی تحریر اس دور میں بغیر نقطوں اور اعراب کے ہوا کرتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہی ہوتا کہ نگاہ اس لفظ کو سمجھنے میں خطأ کر بیٹھتی۔ پھر اداء میں بھی خطأ ہوتی اور سماع میں بھی۔ فہم بھی بعض اوقات دھوکا کھا جاتا۔ جیسے: محمد بن المثنی عنزی نے ایک بار ایک حدیث کو پڑھ کر یہ کہا: نَحْنُ قَومٌ لَنَا شَرَفٌ، نَحْنُ مِنْ عَنَزَةَ، صَلَّى إِلَينَا رسولُ اللهِ ﷺ۔ ہم عنزی لوگوں کے لئے اتنا شرف ہی کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے قبیلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی ہے۔ اکثر کاتب تسع کو سبع لکھ لیتے ہیں یا برید کو یزید۔

سیدنا زید بن ثابت کی حدیث: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِحْتَجَرَ فِي الْمَسْجِدِ۔ کو ابن لہیعہ نے اخْتَجَمَ پڑھا۔ حدیث میں ہے: آپ ﷺ نے: نَهَى عَنِ التَّحْلِيقِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ قَبْلَ الصَّلَاةِ۔ نماز جمعہ سے قبل حلقے بنا کر بیٹھنے سے منع فرمایا۔ ایک صاحب اس حدیث سن کر کہتے ہیں کہ میں نے چالیس برس اس پر عمل کیا ہے کہ نماز سے قبل میں نے کبھی حجامت نہیں بنوائی۔ انہوں نے تحلیق کا مطلب سر منڈوانا لے لیا۔

عثمان بن سعید الدارمیؒ کہتے ہیں ہم مصر میں سعید بن ابی مریمؒ کے ہاں بیٹھے تھے ایک شخص آیا اور عرض کی کہ مجھے چند احادیث بیان فرما دیجئے۔ ابن ابی مریم نے اس کی اس درخواست پر کوئی توجہ نہ دی۔ اتنے میں ایک اور صاحب آئے انہوں نے احادیث سننے کی خواہش ظاہر کی ابن ابی مریم نے انہیں سنا دیں۔ پہلا شخص بولا کہ میں نے آپ سے عرض کی مگر آپ حدیث سنانے سے باز رہے لیکن اس شخص کی درخواست پر آپ نے اسے احادیث سنا دیں آخر کیوں؟ ابن ابی مریم فرمانے لگے کہ جب تم شیبانی اور سیبانی یا ابو جمرۃ اور ابو حمزہ کے مابین اس وقت تمیز کر لو کہ ان دونوں میں کون کون ابن عباس سے کیا کیا روایت کرتا ہے تو ہم تمہیں نہ صرف احادیث سنائیں گے بلکہ اس کی طرح اپنے خاص طلبہ میں شامل کر لیں گے۔ (المحدث الفاصل: ۲۷۴، سیر اعلام النبلاء ۱۰/۳۲۹)

امام ذہبی رحمہ اللہ اس واقعہ پر اپنا تبصرہ یوں فرماتے ہیں:

یہ تو ہمارے اسلام کی علمی حالت تھی اور آج ہماری حالت کیا ہے؟ ہم ایک مصحف صحیفہ سنتے ہیں جس میں غیر معروف شیخ کی اجازت ہے اور پھر ہم اس کا دوسرے نسخہ سے مقابلہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اختلاف اور غلطیوں کو بتاتے ہیں۔ ایک اور فاضل صاحب اس کی تصحیح فرماتے ہیں اور ہمارا طالب علم اسی نسخے پر بچوں کے نام لکھ کر اپنا شغل کر رہا ہے۔ ہمارا عالم اسے لکھ رہا ہے اور شیخ صاحب گھمیریاں لے رہے ہیں۔ بزرگ ایک وادی میں بیٹھے ہیں جہاں اس نسخے کی مشکلات پر گفتگو ہو رہی ہے۔ مبتدع اس نسخے سے بھرپور استدلال لے رہا ہے۔ اور ہر مومن سوال کر رہا ہے کہ کیا ان چھچھوروں نے امت کا دین محفوظ کرنا ہے؟

د۔ سوءِ حفظ: بھی دو وجہ سے تھا۔ یا تو اپنے سے زیادہ ثقہ کی مخالفت ہوتی یا پھر سارا معاملہ ہی خلط ملط تھا۔ پہلی مخالفت شاذ ہے اور دوسرا اختلاط۔

۵۔شاذ:

هُوَ مَا خَالَفَ فِيهِ الْمَوصُوفُ بِالضَّبْطِ مَنْ هُوَ أَضْبَطُ مِنهُ، أَو مَا انْفَرَدَ بِهِ مَنْ لَا يَحْتَمِلُ حَالَةَ قَبُولِ تَفَرُّدِهِ۔ ایک حدیث کا مقبول ضابط راوی اسی روایت میں اپنے سے مرتبہ میں بڑے ضابط کی مخالفت کر رہا ہو۔ یا اسے بھی شاذ کہہ دیتے ہیں جو ایسے راوی سے منفرد ہو جس کے حالات اس کے تفرد کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

...... بڑے ضابط سے مراد ایک راوی کا دوسرے راوی کے مقابلے میں ضبط میں اعلی درجہ کا ہونا۔ مثلاً ثقہ راوی، صدوق سے بڑے درجے کا ہے۔ اسی طرح ائمہ ابن معین، احمد بن حنبل، نسائی اور ابو حاتم کسی راوی کو ثقہ کہتے ہیں تو یہ راوی اس راوی سے درجے میں بڑا ہوگا جسے صرف ابن معین اور نسائی ثقہ کہیں۔

شذوذ کے اہم اصول ونکات:

...... محدثین کم ثقہ کی روایت کو شاذ قرار دیتے ہیں اور بڑے ثقہ یا امام کی روایت کو **محفوظ**۔ مگر صرف اس روایت میں مخالفت کی وجہ سے اس کی دیگر روایات کو رد نہیں کر دیتے۔

...... یہ شرط اس لئے ہے کہ فرد واحد کا علم حدیث، ضروری نہیں کہ کامل ہو یا دیگر علماء کے برابر ہو۔ اس لئے جب ایک عالم، فقیہ یا امام کی منفرد روایت ہو یا اس کی ذاتی رائے یا علم ہو تو ضروری ہے کہ اس کے علم کو دیگر فضلاء وعلماء کے ذریعے بھی پرکھا جائے۔ ایسی منفرد روایت یا رائے جب دیگر فضلاء اور علماء کے علم سے مختلف ہو تو اسے شذوذ کہتے ہیں۔

......شذوذ کا اصول یہ ہے کہ اسے ایک عالم کی ذاتی رائے یا علم سمجھ کر بڑے احترام کے ساتھ نظر انداز کر دینا چاہئے اور دیگر بڑے علماء وفضلاء کی روایت وعلم کو ترجیح دینی چاہئے۔ حدیث وفقہ کے علم اور روایت میں بھی یہی اصول چلے گا۔ اور اگر اس خاص شذوذ کے علاوہ اس عالم کا علم دوسرے فضلاء سے ہم آہنگ ہے تو ایسا عالم وفقیہ باوجود اس ایک آدھ شذوذ کے پھر بھی قابل قدر رہوگا۔

......کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ اکیلا راوی بھی شاذ نہیں ہوتا بشرطیکہ وہ دو سے زیادہ ضابط اور حفظ میں زیادہ قوی ہو۔

......شاذ روایت محدثین کے ہاں قابل عمل اس لئے نہیں کہ اس کے مقابلے میں زیادہ ثقہ راوی اس کی نفی کر رہے ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہیں دونوں کے مابین جمع کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس لئے اوثق یا ثقات کی روایت کو وہ ترجیح دیتے ہیں۔

......بعض اوقات اصولی الْمُثْبِتُ مُقَدَّمٌ عَلَى النَّافِيْ ثابت کرنے والا نفی کرنے والے سے مقدم ہوگا۔ کہہ کر

شاذ کی روایت کو لینا بھی پسند کرتے ہیں۔ اور اوثق کو چھوڑ دیتے ہیں۔

شذوذ کی مختلف حالتیں

ضابط کی اضبط سے متن میں مخالفت: سنن ابی داؤد میں حدیث (۲۸۳۷) بہ سند:

هَمَّامُ بْنُ يَحْيَى، قَالَ: حَدَّثَنَا قَتَادَةُ ، عَنِ الْحَسَنِ، عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ، عَن رسولِ اللهِ ﷺ قَالَ: كُلُّ غُلامٍ رَهِينَةٌ بِعَقِيقَتِهِ، تُذْبَحُ عَنهُ يَومَ السَّابِعِ، وَيُحْلَقُ رَأسُهُ ويُدْمَى۔ ہر نومولود اپنے عقیقے کے ساتھ مرہون ہوتا ہے، اس کی طرف سے ساتویں دن ذبح کیا جائے، اس کا سر مونڈا جائے اور۔۔۔۔۔۔۔

ابوداؤد کہتے ہیں: ہمام کے اس کلام میں دیگر رواۃ نے مخالفت کی ہے۔ کیونکہ یہ ہمام کا وہم ہے۔ قتادۃ کے دیگر شاگردوں میں مثلاً سعید بن ابی عروبۃ اور ابان بن یزید العطار نے يُسَمّٰى کہا ہے۔ اور یہ صاحب کہتے ہیں: يُدْمَى۔ اس لئے اس لفظ کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔

ضابط کی اضبط سے سند میں مخالفت: مسند احمد (۴۰۲،۳۸۲/۵)، صحیح بخاری (۵۲/۱)، مسلم (۲۲۸/۱) میں بہ سند:

عَنِ الأَعْمَشِ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ عَنْ حُذَيْفَةَ بِنِ الْيَمَانِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَتَى سُبَاطَةَ قَومٍ فَبَالَ عَلَيْهَا قَائِماً، فَأَتَيْتُهُ بِوَضوءٍ، فَذَهَبْتُ لِأَتَأَخَّرَ عَنهُ، فَدَعَانِي حَتَّى كُنْتُ عِندَ عَقِبَيْهِ، فَتَوَضَّأ وَمَسَحَ عَلَى خُفَّيهِ۔

یہی حدیث اسی سند کے ساتھ اعمش سے اور لوگوں نے بھی روایت کی ہے جن میں: ابن عیینہ، وکیع، شعبہ، ابوعوانہ، عیسی بن یونس، ابومعاویہ، یحیی بن عیسی الرملی اور جریر بن حازم شامل ہیں۔

مگر اس جماعت کی مخالفت ابوبکر بن عیاش نے کی ہے۔ جب کہ وہ خود ثقہ ہیں اور ان کی ایسی غلطیاں بھی ہیں۔ وہ اسے أَعْمَش، عَن أَبِي وَائِلٍ عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ سے روایت کرتے ہیں۔ حافظ ابوزرعہ الرازی فرماتے ہیں: ابوبکر بن عیاش نے اس حدیث میں غلطی کھائی ہے صحیح سند وہی ہے جو أعْمش عن أبي وائل عَنْ حُذَيْفَةَ ہے۔ اس طرح ابوبکر بن عیاش کے ذریعے اس حدیث کی سند، شاذ ہوئی۔

متن میں غیر ثقہ کا تفرد بغیر مخالف کے بھی نا قابل قبول ہوگا: جب منفرد راوی ایسا ہو جس کے حفظ یا اتقان کی توثیق نہ کی گئی ہو اور نہ ہی یہ منفرد کسی کی روایت کا مخالف ہو۔ اس کا یہ تفرد اسے کمزور کر دے گا اور صحیح کے دائرہ سے دور کر دے گا۔ پھر اس کے بعد یہ راوی حسب حالت مختلف مراتب کی وجہ سے اوپر تلے ہوگا۔ اگر یہ منفرد راوی

حافظ، ضابط اور مقبول کے درجہ سے بہت دور نہیں یعنی وہ صدوق ہو تو اس کی حدیث حسن شمار ہوگی اور درجہ ضعف تک نہیں پہنچے گی۔ لیکن اگر وہ اس درجہ سے دور ہو تو وہ ضعیف ہوگا خواہ وہ حفظ کی وجہ سے کیوں نہ ہو تو اس کا شمار شاذ و منکر میں ہوگا۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: اگر وہ ضبط میں ثقہ نہیں مگر ضابط کے درجہ سے پرے بھی نہیں تو اس کی حدیث حسن ہوگی ورنہ شاذ، منکر اور مردود ہوگی۔ ابوداؤد (۱۲۹۷)، ابن ماجہ (۱۳۸۷)، ابن خزیمہ (۱۲۱۶)، اور طبرانی نے المعجم الکبیر (۲۴۳/۱۱) میں یہ سند:

عَبْدُ الرحمنِ بْنُ بِشْرِ بْنُ الْحَكَمِ، عَنْ مُوسَى بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ الْقَنْبَارِيِّ، عَنِ الْحَكَمِ بْنِ أَبانَ، عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ.........

صلاۃ التسبیح کی حدیث روایت کی ہے۔ اس روایت میں موسیٰ قنباری صدوق ہیں مگر منفرد ہیں۔ جن کا کسی معتبر سند سے کوئی متابع ہے نہ کوئی شاہد۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس لئے یہ شاذ ہے۔ پھر نماز کی ہیئت میں مخالفت بھی اس میں ہے۔

اہم نکتہ: بعض علماء موسیٰ بن عبدالعزیز کی اس حدیث کو منکر کہتے ہیں اور بعض شاذ، اس لئے جب راوی کے تفرد یا مخالفت پر شذوذ یا نکارت کا لفظ بولا جاتا ہے تو یہ اصطلاح کے خلاف نہیں۔

سند میں غیر ثقہ کا تفرد بغیر مخالف کے ناقابل قبول ہوگا: جیسے یہ روایت:

عَبْدُ المجيدِ بْنُ عَبدِ العزيزِ بْنِ أَبي رَوَّادٍ، عَن مَالِكٍ، عَن زيدِ بْنِ أَسلَمَ، عَنْ عَطاءِ بْنِ يَسارٍ، عَنْ أَبِي سعيدِ الخُدْرِيِّ ـ رضي الله عنه ـ مَرْفوعاً: إِنَّما الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ـ الحديث ـ

اس روایت میں عبدالمجید کو بہت سے علماء نے ثقہ قرار دیا ہے۔ مگر یہاں وہ امام مالک سے یہ سند روایت کرنے میں اکیلے ہیں۔ جب کہ درست یہی ہے کہ امام مالک کے علاوہ دوسروں نے بھی یہی حدیث بہ سند:

يَحْيَى بْنُ سعيدِ الأنصاريُّ، عَن مُحمدِ بْنِ إِبْراهِيمَ التَّيْمِيِّ، عَنْ عَلْقَمةَ بْنِ وَقَّاصٍ، عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ۔

روایت کی ہے۔ چنانچہ عبدالمجید کا سندی تفرد شذوذ ہے۔ امام بخاری اسی لئے اس غریب صحیح حدیث کو اپنی کتاب کی ابتداء میں لائے ہیں۔

اہم نکتہ: یہ بات ذہن میں رہے کہ کسی حدیث کے راوی کا تفرد۔ خواہ سند میں ہو یا متن میں۔ بہرحال مخالفت کی

انواع میں سے ہے۔ کیونکہ اسے دوسرا معین صورت میں روایت کرتا ہے اور یہ اس کی مخالفت کرتے ہوئے ویسے روایت نہیں کرتا۔

تفرد ثقہ یعنی جس کا کوئی مخالف نہیں اس کی دو صورتیں ہیں:

ا۔ ثقہ راوی ایسی حدیث روایت کرے جو صرف اسی کے ذریعے سے ہوئی ہو اور اس کا کوئی معارض نہ ہو۔ یہ حدیث بلا خلاف مقبول حدیث ہے۔ امام حدیث یا حافظ حدیث کی روایت کردہ اس حدیث کی اہمیت کو کوئی روایت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ اس کے برعکس یہ منفرد حدیث اس کے حفظ و اتقان کی دلیل ہے کہ ایسی شے اس نے محفوظ کی ہے جو کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ اسی لئے امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ کہنا ہے:

شاذ حدیث یہ نہیں ہوتی کہ ایک ثقہ راوی اس حدیث کو روایت کرے جو کسی اور نے نہ کی ہو بلکہ شاذ وہ ہوتی ہے کہ ثقہ ایسی حدیث روایت کرے جو دیگر لوگوں کی روایت کی مخالف ہو۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: جب ایک متقن اور ضابط ثقہ راوی حدیث روایت کرنے میں منفرد ہو تو اس کی یہ روایت بلا خلاف مقبول ہے۔ اور خطیبؒ بغدادی نے تو اس پر علماء کا اتفاق لکھا ہے۔

حافظ عراقیؒ کہتے ہیں: جب راوی کسی روایت میں منفرد ہو تو اس کی روایت جانچی جائے اگر وہ کسی کی مخالفت نہیں کر رہا تو پھر یہ اسی کی روایت ہے جو کسی اور کے پاس نہیں۔ پھر بھی اس منفرد راوی کو جانچا جائے کہ آیا وہ عادل و حافظ ہے اتقان و ضبط میں قابل اعتماد ہے؟ اگر ہے تو اس کی منفرد روایت قبول ہوگی اور اس کی انفرادی حیثیت اس کے حق میں بری شے نہ ہوگی۔

امام مسلم لکھتے ہیں: امام زہری رحمہ اللہ کی نوے منفرد روایات ہیں۔ جس میں ان کے ساتھ کوئی بھی دوسرا شریک نہیں اور یہ سب روایات جید ہیں۔ کتب حدیث میں روایات پیش کرتے وقت اسی اصول کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سے بہتر کوئی اور دلیل نہیں ہو سکتی کہ ائمہ حدیث نے اپنی تصنیفات میں غریب احادیث روایت کیں جو صرف ایک ہی سند سے جانی جا سکتی تھیں اور اس سے انہوں نے احتجاج بھی لیا۔ حتی کہ شیخین نے صرف صحیح احادیث کی تصنیفات لکھیں اور بکثرت ان غریب احادیث کو روایت کیا جن کی سند یا مصدر ایک ہی تھا۔ جن میں ایک حدیث سیدنا عمر بن الخطاب کی إنما الأعمال بالنیات والی ہے۔ یہ حدیث محمد بن ابراہیم التیمی سے منتشر ہوئی

اور پھر یحییٰ بن سعید الانصاری سے ایک سو سے زیادہ رواۃ نے اسے روایت کیا۔ اسے آحاد مطلق یا فرض مطلق بھی کہتے ہیں پھر بھی یہ حدیث آحاد غریب مطلق ہے۔ نیز یہ ان چار احادیث میں سے ہے جن پر پورے دین اسلام کا دارومدار ہے۔

دوسری صورت: ایک لفظ کا، یا جملے کا، یا حدیث کے زیادہ تر حصے کا اضافہ۔ اس کا ذکر ثقات کے اضافہ میں آرہا ہے۔

۲۔ **مُختلَط**: اختلاط یادداشت کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ جس میں راوی پر احادیث مشتبہ ہوجاتی ہیں اور اس کی روایت درست نہیں رہتی۔ ایسا راوی **مختلِط** کہلاتا ہے اور اس کی روایت کردہ حدیث **مختلَط**۔

هُوَالَّذِی فَسَدَ نِظَامُ عَقْلِهِ بِسَبَبِ مَرَضٍ أَو ضَرَرٍ، أَو كِبَرِ سِنٍّ وَنَحْوِهَا، أَو ضَاعَتْ كُتُبُهُ فَلَمْ يَقْدِرْ عَلَى أَدَاءِ مَا أَرَادَ رِوَايَتَهُ عَلَى وَجْهِ الصَّوَابِ۔ وہ راوی جس کی عقل کسی بیماری، تکلیف یا بڑھاپے کی وجہ سے خراب ہوگئی ہو۔ یا جس کی کتب ضائع ہوجائیں اور اپنی یادداشت سے حدیث رسول کو صائب طریقے سے سنانے پر قادر نہ ہو۔

راوی لاعلاج مرض یا دکھ کا شکار: اچانک مال کی چوری یا کوئی بیماری لاحق ہوتی کہ بصارت چلی جاتی۔ چنانچہ حافظے سے وہ حدیث روایت کرتے تو بھولتے اور غلطی کرتے۔ طلبہ انہیں اس بھول یا غلطی پر آگاہ کرتے تو اسے وہ قبول کرتے۔ جسے تلقین کہتے ہیں۔ ان بیماریوں اور حوادث کا شکار ہشام بن عمار، عبدالرزاق صنعانی اور علی بن مسہر جیسے ثقہ راوی ہوئے۔

راوی عمر رسیدہ ہوجائے۔ جیسے عطاء بن السائب اور حصین بن عبدالرحمٰن دونوں ثقہ راوی ہیں مگر بڑھاپے میں ان کی یادداشت جاتی رہی تھی۔ جوانی میں بھی یہ اختلاط ہوسکتا ہے۔ مگر اکثریت بڑھاپے میں ہی نسیان واختلاط کا شکار ہوتی ہے۔

کتب جلنے پر اختلاط: جیسے عبداللہ بن لہیعہ ایک مصری محدث تھے۔ احادیث مشائخ سے سن کر انہوں نے نہ صرف لکھیں بلکہ سنا کر ان کی اصلاح بھی کرائی۔ اچھے اساتذہ کی سند بھی ان کے پاس تھی۔ مرجع ومرکز علم تھے۔ یہ اپنی کتب کو سامنے رکھ کر بڑے اعتماد سے حدیث پڑھایا کرتے۔ اتفاق سے ان کی لائبریری جل گئی اور سب کچھ

راکھ ہوگیا۔ بعد میں جو کچھ پڑھانے کی کوشش کرتے تو معاملہ ان پر (Mixed up) ہو جاتا کیونکہ علم حافظے میں نہ رہا تھا۔

سرکاری ذمہ جاری قبول کرنے کے بعد اختلاط: روایت حدیث یکسوئی کا تقاضا کرتی ہے تاکہ یہ علم ازبر رہے ورنہ ذہن بٹ جائے تو یادداشت کمزور پڑ جاتی ہے۔اس لئے محدثین کی اکثریت آخر وقت تک سرکاری عہدوں اور منصب قضاء سے مجتنب رہی۔ حفص بن غیاث نخعی انتہائی ذہین وفطین ثقہ محدث تھے۔اپنے ہمسروں سے کہیں آگے۔عہدہ قضاء پیش کیا گیا تو قبول کرلیا۔ظاہر ہے مختلف النوع مقدمات ونزاع کو جاننے ،ان کی تہہ تک پہنچنے ، عدالتی کاروائی کو نمٹانے اور روزانہ کئی مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے مطالعہ چاہئے۔اس لئے ان کی توجہ جونہی اُدھر ہوئی حدیثی علم ان سے جاتا رہا پھر بتدریج معاملہ مختلط ہوتا گیا اور ہو بھی گیا۔

ایسے اختلاط کے دو اسباب ہیں۔

۱۔اختلاط لازم ۲۔ اختلاط طاری

اختلاط لازم: یہ ایسا ضعیف راوی ہے جو پہلے سے ہی مختلط ہے اس لئے اس کا اختلاط اس کے ساتھ لازمی اور چمٹا ہوا ہے۔ یہ سئ الحفظ ہوتا ہے تو ثقہ کی مخالفت کرتا ہے۔اس لئے اس کی روایت ضعیف ہوگی۔

اختلاط طاری: اچانک کسی حادثے کا شکار ہوکر مختلط ہو جانا اختلاط طاری کہلاتا ہے۔مثلاً: مرض، کتب خانہ جل جانا وغیرہ۔ایسا راوی گو حادثہ سے پہلے ثقہ ہوتا ہے مگر اپنا حافظہ کھوکر بہت کچھ بھول جاتا ہے اسے مختلط کہتے ہیں۔ ضبط نہ ہونے کی وجہ سے اس کی روایت قبول نہیں کی جاتی کیونکہ راوی اب ضعیف ہوگیا ہے۔

مختلط کی روایت قبول ورد کرنے کے ضابطے

معمولی وشدید اختلاط کی وجہ سے محدثین نے ایسے راوی کے چند ضابطے متعارف کرائے تاکہ رد وقبول حدیث میں احتیاط ہو:

ضابطہ نمبر ۱...... جس کا اختلاط شدید تھا اس کے لئے یہی ضابطہ بنا کہ اس کی حدیث قبول نہ کی جائے۔کیونکہ اس میں وہم اور خطا غالب نظر آتی ہے۔

ضابطہ نمبر ۲...... جس کا اختلاط معمولی تھا، اصول یہ بنا کہ اس کی روایت قبول کرلی جائے لیکن اختلاطاً اگر خطاً کی

صورت میں واضح ہوا سے ترک کر دیا جائے۔ صحیحین میں شیخین کا یہی طریقہ ہے۔ بالفرض یہ امتیاز کرنا مشکل ہو کہ آیا یہ حدیث اختلاط سے پہلے کی ہے یا بعد کی۔ تو مزید تشفی کے لئے تحقیق کر لی جائے۔

ضابطہ نمبر۳......اختلاط واضح ہو تو روایت حدیث سے روک دیا جائے۔ مثلاً سعید بن عبد العزیز تنوخی راوی کے بارے میں ابومسہر کہتے ہیں: سعید اپنی وفات سے قبل مختلط ہو گئے تھے۔ کوئی انہیں عرضاً اپنی احادیث پیش کرتا تو فرماتے: میں ان کی اجازت نہیں دے سکتا۔ (تاریخ ابن معین بروایت الدوری ۲/۲۰۴)

انہی میں جریر بن حازم بھی ہیں جن کی اولاد نے محسوس کیا کہ ابا جان کو اختلاط ہوتا ہے تو انہیں ان کے شاگردوں سے چھپا دیا۔ نیز روایت حدیث سے بھی روک دیے گئے۔ عبد الرحمنؒ بن مہدی فرماتے ہیں:

جَرِيرُ بْنُ حازِمٍ اخْتَلَطَ، وَكَانَ لَهُ أَوْلادٌ أَصْحابُ الحَدِيثِ، فَلَمَّا خَشُوا ذَلِكَ مِنْهُ حَجَبُوهُ، فَلَمْ يَسْمَعْ مِنْهُ أَحَدٌ فِي اخْتِلاطِهِ شَيْئاً۔ (الجرح والتعدیل از ابن ابی حاتم ۱/۱/۵۰۵)

ضابطہ نمبر۴......جو اپنی بعض روایات میں مختلط ہوا۔ تو انہیں چھوڑ کر باقی احادیث لے لی جائیں۔ ثقات محدثین میں کچھ مکثرین کو اپنی بعض روایات میں اختلاط ہوا مثلاً معمر بن راشد۔ امام ذہبیؒ سیر اعلام النبلاء (۷/۱۲) میں فرماتے ہیں:

وَمَعَ كَوْنِ مَعْمَرٍ ثِقَةً ثَبتاً، فَلَهُ أَوْهَامٌ، لَا سِيَّمَا لَمَّا قَدِمَ الْبَصْرَةَ لِزِيَارَةِ أُمِّهِ، فَإِنَّهُ لَمْ يَكُنْ مَعَهُ كُتُبُهُ، فَحَدَّثَ مِنْ حِفْظِهِ، فَوَقَعَ لِلْبَصْرِيِّيْنَ عَنْهُ أَغالِيطُ، وَحَدِيثُ هِشامٍ وَعبدِ الرزاق عَنْهُ أَصَحُّ، لِأَنَّهُم أَخذُوا عَنْهُ مِنْ كُتُبِهِ۔ باوجود ثقہ اور ثبت ہونے کے معمر کی احادیث میں چند اوہام بھی ہیں بالخصوص جب وہ بصرہ اپنی والدہ محترمہ کو ملنے آئے تو ان کے پاس اپنی کتب نہیں تھیں۔ صرف حافظے سے احادیث بیان کیں اس لئے اہل بصرہ کی ان سے جو احادیث ہیں ان میں کچھ غلطیاں ہیں جب کہ ہشام اور عبد الرزاق کی ان سے روایات زیادہ صحیح ہیں کیونکہ انہوں نے ان سے بذریعہ کتاب احادیث اخذ کی تھیں۔

چند اصول:

۱۔ قبل از اختلاط ثقہ کی شنیدہ حدیث قبول کی جائے گی۔ مثلاً امام نسائی اپنی السنن (۳/۵۴) میں بہ سند:

يَحْيَى بْنُ حَبِيبِ بْنِ عَرَبِيٍّ، قَالَ: حَدَّثَنَا حَمَّادٌ، قَالَ: حَدَّثَنَا عَطَاءُ بْنُ السائِبِ عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: صَلَّى بِنَا عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ صَلَاةً أَوْجَزَ فِيهَا، فَقَالَ لَهُ بَعْضُ القَوْمِ: لَقَدْ خَفَّفْتَ۔ أَوْ أَوْجَزْتَ الصَّلَاةَ۔ فَقَالَ:

أَمَا عَلَى ذٰلِكَ، فَقَدْ دَعَوتُ فِيهَا بِدَعَوَاتٍ سَمِعْتُهُنَّ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، فَلَمَّا قَامَ تَبِعَهُ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ۔۔۔الحدیث۔السائب کہتے ہیں ہمیں عمار بن یاسر نے نماز پڑھائی اور مختصری پڑھائی۔ کچھ لوگوں نے کہا: آپ نے آج بہت ہلکی یا مختصر نماز پڑھائی ہے؟ فرمانے لگے: میں نے یہ اس لئے کیا کہ میں نے نماز میں کچھ دعائیں کیں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی تھیں۔ پھر جب وہ کھڑے ہوئے تو ایک شخص ان کے پیچھے ہولیا۔

اس حدیث کی سند میں عطاء بن السائب ثقہ راوی ہیں آخری عمر میں مختلط ہو گئے تھے۔ مگر ان کی روایت ترک نہیں ہوگی کیونکہ ان کے شاگرد حماد بن زید نے یہ روایت ان سے قبل از اختلاط سنی تھی۔ یحیی بن سعید القطانؒ کہتے ہیں: سَمِعَ حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ مِنْ عَطَاءٍ قَبْلَ اخْتِلَاطِهِ۔ یہی بات ابوحاتم رازیؒ نے کہی ہے۔

۲۔ **بعد از اختلاط ثقہ کی شنیدہ روایت قبول نہیں ہوگی۔** مثلاً: امام ابوداودؒ: (۲۶۰۲)، ترمذیؒ: (۳۴۴۶)، اور دیگر نے یہ سند:

عَنْ أَبِي إِسْحٰقَ السَّبِيْعِيِّ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ رَبِيعَةَ الْوَالِبِيِّ، عَنْ عَلِيِّ بنِ أَبِي طَالِبٍ۔۔رضی اللّٰهُ عَنْهُ۔۔ مَرفوعاً: إِنَّ رَبَّكَ يُعْجِبُ مِنْ عَبْدِهِ إِذَا قَالَ: اغْفِرْ لِي ذُنُوبِيْ، يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ غَيْرِيْ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ تمہارا رب اپنے بندے سے اس وقت خوش ہوتا ہے جب وہ یہ کہتا ہے: میرے اللہ! میرے گناہ معاف کردے۔ بندہ جانتا ہے کہ گناہوں کو میرے علاوہ کوئی نہیں بخش سکتا۔

اس روایت میں ابواسحق السبیعی مدلس ہیں کیونکہ انہوں نے یہ حدیث علی الوالبی سے سنی ہی نہیں۔ امام مزیؒ تحفۃ الأشراف (۷/۴۳۶) میں یہ سند:

عَنْ عَبدِ الرحمٰنِ بْنِ مَهْدِيٍّ، عَنْ شُعبةَ، قَالَ: قُلْتُ لأبي إسحٰقَ: مِمَّنْ سَمِعْتَهُ؟ قَالَ: مِنْ يُونُسَ بْنِ خَبابٍ، فَلَقِيْتُ يُونُسَ بْنَ خبابٍ، قُلتُ: مِمَّنْ سَمِعْتَهُ؟ قَالَ: مِنْ رَجُلٍ سَمِعَهُ مِنْ عَلِيِّ بْنِ رَبِيْعَةَ۔

مگر اسی روایت کو احمد بن منصور رمادیؒ نے:

عَن عبدِ الرزاقِ الصَّنْعانِيِّ، فَقَالَ: أَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ، عَنْ أَبِي إِسحٰقَ، أَخْبَرَنِي عَلِيُّ بْنُ رَبِيعَةَ سے روایت کیا ہے۔ (المحاملی فی الدعاء: ۱۵، بیہقی السنن الکبری)۔

یہ روایت معلول بھی ہے وہ اس طرح: عبدالرزاق ثقہ ہیں حافظ ہیں مگر مختلط ہیں، انہیں تلقین کی جاتی جسے وہ مانتے۔ رمادی کا ان سے سماع بعد از اختلاط کا ہے اس لئے اس روایت میں سماع کی صراحت پر یقین نہ کیا جائے۔

۳۔ ابتداء سے ہی مختلط ،ضعیف ہو تو اس کی روایت رد ہوگی۔ اس لئے کہ اس میں ایک اختلاط ہے اور دوسرا ضعف۔ مثلاً: لیث بن ابی سلیم ضعیف ومضطرب الحدیث راوی ہے آخری عمر میں مختلط بھی ہو گئے تھے۔ ابن حبانؒ کہتے ہیں:

اخْتَلَطَ فِي آخِرِ عُمْرِهِ، فَكَانَ يُقَلِّبُ الأَسَانِيْدَ، وَيَرْفَعُ الْمَرَاسِيلَ، وَيَأْتِي عَنِ الثِّقَاتِ بِمَا لَيْسَ مِنْ حَدِيْثِهِمْ۔ آخری عمر میں انہیں اختلاط ہو گیا تھا، اسانید بدل دیا کرتے تھے مراسیل کو مرفوع کر دیتے اور ثقات سے ایسی احادیث روایت کرتے جو ان کی نہ ہوتیں۔

۷۔ منکر:

هُوَ الْحَدِيثُ الَّذِيْ يَتَفَرَّدُ بِرِوَايَتِهِ الرَّاوِيُّ الضَّعِيفُ، أَو مَا يُخَالِفُ بِهِ مَنْ هُوَ أَقْوَى مِنْهُ۔ وہ حدیث جسے ضعیف راوی روایت کرنے میں منفرد ہو یا ایسی حدیث روایت کرے جس میں وہ اپنے سے قوی تر راوی کی مخالفت کر رہا ہو۔ ضبط کی یہ مخالفت خواہ متن میں ہو یا سند میں منکر کہلاتی ہے۔

مثال:

النَّضْرُ بْنُ شَيْبَانَ، قَالَ: قُلْتُ لِأَبِي سَلَمَةَ، حَدِّثْنِي بِشَيْءٍ سَمِعْتَهُ مِنْ أَبِيكَ يُحَدِّثُ بِهِ عَنْ رَسولِ اللّٰهِ ﷺ، قَالَ: حَدَّثَنِي أَبِي فِي شَهْرِ رَمَضَانَ، قَالَ: قال رسولُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوجَلَّ فَرَضَ عَلَيْكُم صِيامَ شَهْرِ رَمَضَانَ، وَسَنَنْتُ لَكُم قِيَامَهُ، فَمَنْ صَامَهُ وَقَامَهُ إِيْمَانًا وَاحْتِسابًا خَرَجَ مِنَ الذُّنُوبِ كَيَومٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ۔

اس سند میں نضر بن شیبان نے اس حدیث کی روایت میں غلطی کی ہے۔ کہ ابوسلمہ نے اپنے والد سے سنا ہے حالانکہ انہوں نے اپنے والد سے کچھ سنا ہی نہیں۔ نکارت کی یہ ایک صورت ہے اور دوسری یہ ہے کہ ایسی حدیث نضر کے علاوہ بہت سے ثقہ، حفاظ راوی جیسے یحیی بن سعید، امام زہری، یحیی بن ابی کثیر وغیرہ نے ابوسلمہ عن ابی ہریرۃ مرفوعا بایں الفاظ روایت کی ہے:

مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، وَمَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيْمَانًا وَاحْتِسابًا، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ۔

نضر بن شیبان نے اس حدیث کی سند اور متن دونوں میں اپنے سے اوثق اور احفظ رواۃ کی مخالفت کی ہے۔ اس

لئے وہ خود ضعیف ٹھہرے اور سنداً یہ حدیث منکر بنی۔

اصول حدیث: محدثین کے ہاں منکر کا استعمال تین طرح کا ہے:

۱۔ جس حدیث کا راوی ثقات کی مخالفت کرے۔

۲۔ جس کا راوی عادل وضابط نہ ہو اگرچہ وہ مخالفت نہ کرے پھر بھی وہ منکر کہلاتا ہے۔

۳۔ عادل ضابط راوی روایت حدیث میں اکیلا ہو اسے بھی متقدمین منکر کہتے۔ جیسے امام احمد بن حنبل، صحیح بخاری کے راوی، امام محمد بن ابراہیم تیمی کے بارے میں فرماتے ہیں: هُوَ مُنْكَرُ الْحَدِيثِ۔ یعنی وہ حدیث کی روایت میں منفرد ہیں۔ متقدمین میں سوائے امام احمدؒ اور بردیجیؒ کے دیگر ائمہ، غریب کو منکر کے معنی میں لیا کرتے۔ بعض محدثین قیس بن ابی حازم کی احادیث کو مناکیر کہتے ہیں۔ اور دوسرے مناکیر نہیں بلکہ غرائب کہتے ہیں

۴۔ ہر مقبول راوی کی منکر روایت کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ راوی ضعیف ہے۔ (المیزان ۱/۱۸۸)

تنبیہ: یہاں چند اہم باتیں قابل ملاحظہ ہیں۔

۱۔ منکر کی روایت میں ضعیف الحفظ راوی اکیلا ہوتا ہے۔ اغلب بات یہی ہے مگر کچھ علماء حدیث کا کہنا ہے جس منفرد راوی کی عدالت میں (نہ کہ حفظ میں) **قدح** ہو وہ منکر کہلاتا ہے۔ اسی لئے اکثر ائمہ متقدمین نے منکر، کی اصطلاح موضوع حدیث کے لئے استعمال کی ہے اور متاخرین یہ تعریف کرتے ہیں۔

۲۔ نکارت صرف سند میں نہیں بلکہ متن میں بھی ہوا کرتی ہے مثلاً ثقات کی جماعت ایک حدیث کو لفظاً روایت کرتی ہے اور ضعیف راوی اسی حدیث کو مختلف الفاظ سے روایت کرتا ہے۔ جیسے نضر بن شیبان کی مثال گذر چکی ہے۔ یا ایک حدیث کو ثقات کی جماعت روایت کرتی ہے مگر ضعیف راوی اسی حدیث کو چند زائد الفاظ سمیت روایت کر دیتا ہے جو ثقات نے بیان نہیں کئے ہوتے۔ مثلاً: مسند احمد (۳/۹۹، ۱۰۱، ۲۸۲)، صحیح بخاری (۱/۴۰) صحیح مسلم (۱/۲۸۳) ابوداود: ۴، ۵، الترمذی: ۵، ۶، نسائی (الیوم واللیلۃ: ۷۴)، میں بہ سند:

عَبْدُ العزيزِ بْنُ صُهَيْبٍ عَنْ أَنسِ بنِ مَالِكٍؓ قَالَ: كَانَ النبيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءِ قَالَ: اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔

مگر ابن ابی شیبہ نے مصنف (۱/۱۱) میں یہی حدیث بہ سند:

اَبو مَعْشَرٍ نَجِیح بْنِ عَبدِ الرَّحمٰنِ السِّنْدِیُّ عَنْ عَبدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِی طَلْحَۃَ، عَنْ اَنسٍ ؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ إِذَا دَخَلَ الْکَنِیْفَ، قَالَ: بِسْمِ اللّٰہِ، اللّٰھُمَّ إِنِّی اَعُوذُ بِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔

ابومعشر راوی (ضعیف)، ثقات کے ساتھ حدیث کے الفاظ میں موافقت کررہے ہیں سوائے تسمیہ کے جو مخالفت ہے۔یہ اضافہ منکرہ ہے۔

۳۔ایک ثقہ راوی۔۔صحیح حدیث کا۔۔کبھی اس کی روایت بھی منکر ہوسکتی ہے جب وہ اکیلا ہو اور اس ثقہ سے روایت کرے جس سے روایت کرنے میں ضعیف قرار دیا جا چکا ہو۔جیسے معمر کی روایت قتادہ سے۔معمر بن راشد خود حافظ حدیث ہیں اور ثقہ رواۃ میں سے ہیں مگر ان کی قتادہ سے روایت ضعیف ہے اس لئے کہ انہوں نے قتادہ سے بچپن میں سنا تھا مگر ان کی اسانید کو وہ یاد نہ رکھ سکے تھے لہذا جب وہ قتادہ سے منفرد ہوں اور کسی ثقہ نے ان کی متابعت نہ کی ہو یا کسی اضافہ میں وہ منفرد ہوں تو ان کا یہ تفرد بھی منکر کہلائے گا۔

۴۔ایک صدوق راوی۔۔جو ضبط میں ثقہ سے کم تر مگر حسن حدیث کا راوی ہوتا ہے۔اس کی حدیث دو صورتوں میں منکر ہو جاتی ہے۔صحیحین میں مرفوعاً روایت ہے:

کُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰی یُؤَذِّنَ ابْنُ أُمِّ مَکتُومٍ، فَإِنَّہُ لَا یُؤَذِّنُ حَتّٰی یَطْلُعَ الْفَجْرُ۔کھاؤ پیو حتی کہ ابن ام مکتوم اذان دے دیں کیونکہ وہ اذان طلوع فجر پر ہی دیا کرتے ہیں۔

اس لئے آپ ﷺ کا یہ ارشاد: حَتّٰی یُؤَذِّنَ یہی فائدہ دے رہا ہے کہ کھانا پینا دوسری اذان کے شروع ہوتے ہی ختم۔مگر ابو ہریرہؓ کی حدیث میں اذان کے بعد تک بھی ڈھیل ہے وہاں فائدہ یہ نظر آتا ہے کہ جو اپنی ضرورت کی حد تک کھا پی سکتا ہے تو کھا پی لے۔

اس طرح یہ حدیث۔۔باوجود اس کے کہ اس کا راوی صدوق حسن الحدیث ہے۔۔منکر ہوئی۔

ب۔صدوق یا ثقہ راوی اپنی بعض روایات میں اس وقت غلطی کھا جاتے ہیں جب وہ کسی ایسے مشہور حافظ سے روایت کریں جس کے دیگر شاگرد بھی ہوں مگر یہ صدوق اس مشہور حافظ سے روایت کرنے میں منفرد ہو۔کوئی شاگرد بھی اس روایت میں شریک نہیں ہوتا۔یوں یہ حدیث منکر ہو جاتی ہے۔مقدمہ صحیح مسلم میں امام مسلمؒ فرماتے ہیں:۔

حُکْمُ أَھْلِ الْعِلْمِ ، وَالَّذِیْ نَعْرِفُ مِنْ مَذْھَبِھِمْ فِی قَبُولِ مَا یَنْفَرِدُ بِہِ الْمُحَدِّثُ مِنَ الْحَدِیثِ،

أَنْ يَكُونَ قَدْ شَارَكَ الثِّقَاتِ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ وَالْحِفْظِ فِي بَعْضِ مَا رَوَوْا، وَأَمْعَنَ فِي ذَلِكَ عَلَى الْمُوَافَقَةِ لَهُمْ، فَإِذَا وُجِدَ كَذَلِكَ، ثُمَّ زَادَ بَعْدَ ذَلِكَ شَيْئًا لَيْسَ عِنْدَ أَصْحَابِهِ، قُبِلَتْ زِيَادَتُهُ۔فَأَمَّا مَنْ تَرَاهُ يَعْمِدُ لِمِثْلِ الزُّهْرِيِّ فِي جَلَالَتِهِ وَكَثْرَةِ أَصْحَابِهِ الْحُفَّاظِ الْمُتْقِنِينَ لِحَدِيثِهِ وَحَدِيثِ غَيْرِهِ، أَوْ لِمِثْلِ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، وَحَدِيثُهُمَا عِنْدَ أَهْلِ الْعِلْمِ مَبْسُوطٌ مُشْتَرَكٌ، قَدْ نَقَلَ أَصْحَابُهُمَا عَنْهُمَا حَدِيثَهُمَا عَلَى الِاتِّفَاقِ مِنْهُمْ فِي أَكْثَرِهِ، فَيَرْوِي عَنْهُمَا أَوْ عَنْ أَحَدِهِمَا الْعَدَدَ مِنَ الْحَدِيثِ مِمَّا لَا يَعْرِفُهُ أَحَدُ أَصْحَابِهِمَا، وَلَيْسَ مِمَّنْ شَارَكَهُمْ فِي الصَّحِيحِ مِمَّا عِنْدَهُمْ، فَغَيْرُ جَائِزٍ قَبُولُ حَدِيثِ هَذَا الضَّرْبِ مِنَ النَّاسِ۔

اہل علم کا فیصلہ ہے کہ محدث، حدیث کی روایت میں جب منفرد ہو تو اس کی روایت کو تب قبول کیا جائے جب یہ محدث دیگر ثقات حفاظ کے ساتھ بعض روایات میں شریک ہو اور اس نے خود بھی سمجھا ہو کہ وہ ان سے موافقت کر رہا ہے۔اس موافقت کے بعد اگر اس کی روایت میں کچھ ایسا اضافہ مل جائے جو اس کے دیگر اصحاب نے نہیں کیا تو اس کا یہ اضافہ قبول کیا جائے گا۔

رہا وہ راوی جو اپنے آپ کو امام زہریؒ جیسے جلیل القدر محدث ۔۔ جن کے ساتھ حدیث کی روایت میں بہت سے متقن حفاظ شریک ہیں ۔۔ کے ساتھ روایت میں شریک ٹھہراتا ہے یا ہشامؒ بن عروہ جیسے عالم کبیر کے ساتھ تو ۔۔ ان دونوں کی روایت اہل علم کے ہاں موجود و مشترک ہے ان کے اصحاب نے ان دونوں کی احادیث کو متفقہ طور پر روایت بھی کیا ہے۔ یہ راوی ان دونوں سے یا ایک سے چند ایسی احادیث روایت کرتا ہے جن سے ان کے اصحاب لاعلم ہیں اور نہ ہی ان میں سے کوئی اس کے ساتھ ان کی صحیح روایت میں شریک ہوا ہے تو ایسے راوی کی احادیث کو قبول کرنا ناجائز ہوگا۔

اس کی مثال: امام بیہقیؒ نے السنن الکبری (۴/۳۱۶) میں اور امام ذہبیؒ نے سیر أعلام النبلاء (۱۵/۱۸) میں یہ سند:

مَحْمُودُ بْنُ آدَمَ الْمَرْوَزِيُّ، حَدَّثَنَا سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ، عَنْ جَامِعِ بْنِ أَبِي رَاشِدٍ، عَنْ أَبِي وَائِلٍ قَالَ: قَالَ حُذَيْفَةُ لِعَبْدِ اللّٰهِ يَعْنِي ابْنَ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: عُكُوفاً بَيْنَ دَارِكَ وَدَارِ أَبِي مُوسٰى، وَقَدْ عَلِمْتَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا اِعْتِكَافَ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، أَوْ قَالَ: إِلَّا فِي الْمَسَاجِدِ الثَّلَاثَةِ۔ فَقَالَ: عَبْدُ اللّٰهِ: لَعَلَّكَ نَسِيتَ وَقَدْ حَفِظُوا۔

نوٹ: اس حدیث کے راوی محمود بن آدم صدوق راوی ہیں جو اس روایت میں ابن عیینہ سے منفرد ہیں۔ کیونکہ ابن عیینہ کے بہت سے دیگر اصحاب (شاگرد و علماء) بھی ہیں جو محمود کی اس روایت میں ابن عیینہ سے روایت کرنے میں شریک

نہیں ہوئے۔ یہ مت خیال آئے کہ ابن عیینہ نے اپنے ساتھیوں کو یہ حدیث سنانے میں بخل سے کام لیا ہوگا یا ان کی اپنی ہمتیں پست ہوگئی ہوں گی اور محمود بن آدم کی ہمت زور پکڑ گئی اس نے سن لیا مگر ابن عیینہ کے شاگرد ان سے نہ سن سکے۔ بالخصوص وہ چیز جو محمود کے متن میں نکارت کی صورت میں ہے بلکہ اس کی سند بھی جو مرفوع تھی وہ تک نہ سن سکے۔

۵۔ امام بخاری رحمہ اللہ عبد اللہ بن معاویۃ الزبیری کو مُنْکَرُ الْحَدِیثِ یا الضعفاء الکبیر میں بَعْضُ أَحَادِیْثِهِ مَنَاکِیْرُ کہتے ہیں۔ ان کا کیا مطلب ہے؟ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں: دونوں عبارتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ کیونکہ جس کی کچھ احادیث منکر ہیں تو وہ خود بھی منکر ہوا۔ کیونکہ منکر الحدیث سے مراد کوئی بھی یہ نہیں لیتا کہ اس کی تمام احادیث منکر ہیں۔ اگر خاصی احادیث میں کچھ احادیث منکر ہوں تو وہ مُنْکَرُ الْحَدِیثِ ہوتا ہے۔ اور اس کی کچھ احادیث کے لئے بَعْضُ أَحَادِیْثِهِ مَنَاکِیْرُ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (تاریخ الإسلام ۱۲/۲۵۱)

حکم: منکر کی روایت سے بچنا بھی چاہیے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ، وَدَعُوا مَا يُنْكِرُونَ، أَتُحِبُّونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ؟ لوگوں کو وہ احادیث بیان کرو جو وہ جانتے ہوں اور غیر مانوس احادیث کی روایت چھوڑ دو۔ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ اللہ اور اس کا رسول جھٹلا دئے جائیں؟

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے تو منکر روایت سے خوب ڈانٹا ہے اور حدیث مشہور کی روایت پر ابھارا بھی ہے۔ یہی اہم اصول ہے کہ واہی چیزوں کو پھیلانے اور منکر احادیث سے فضائل وعقائد اور رقائق سنانے سے پرہیز کیا جائے۔ ان منکر باتوں کی معرفت تبھی حاصل ہوگی جب انسان رواۃ حدیث کی خوب معرفت رکھتا ہو۔

۸۔ معلل یا معلول

هُوَ الْحَدِيثُ الَّذِي اطُّلِعَ عَلَى عِلَّةٍ تَقْدَحُ فِي صِحَّتِهِ، مَعَ أَنَّ ظَاهِرَهُ السَّلَامَةُ مِنْهَا۔ وہ حدیث جو بظاہر سلامت ہو مگر اس میں ایسی علت ہو جو اس حدیث کی صحت میں قدح کی وجہ سے رخنہ ڈال دے۔

مثلاً کبھی رواۃ الأَسْوَدُ عَنْ عَائِشَةَ سے روایت کرتے ہیں مگر یہ راوی ان دونوں کے درمیان ایک اور راوی کو رکھ دیتا ہے۔ ایسی حدیث معلل یا معلول کہلاتی ہے۔ کیونکہ اس میں موجود علت قادحہ پر محقق مطلع ہوتا ہے۔ ایسی علت حدیث کی صحت کے لئے انتہائی معیوب ہے۔ بظاہر وہ حدیث اس عیب سے محفوظ نظر آتی ہے۔

معلل، شاذ یا منکر کی مانند نہیں ہوتی کیونکہ منکر اور شاذ میں مخالفت ظاہر ہوتی ہے مگر اس میں مخالفت مخفی ہوتی ہے جو محقق کو اس کی علت معلوم کرنے میں تھکا مارتی ہے۔

علت کی معرفت کے بغیر کتنے لوگ ہیں جنہوں نے ثقہ کو ضعیف اور ضعیف کو ثقہ قرار دے دیا۔ ہوتا یہی ہے کہ ایک عام آدمی جب کسی روایت میں ثقہ راوی کو پاتا ہے تو اسے دیکھتے ہی وہ کہہ اٹھتا ہے: یہ روایت صحیح ہے۔ مگر اسے کیا معلوم کہ اس راوی کی روایت شامی محدثین سے ضعیف ہے اور مکی علماء سے قوی۔ وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس پر حدیث کا یہ عیب مخفی ہوتا ہے۔ بہت کم علماء اس میدان میں ماہر ہیں جن میں امام علی بن المدینی، امام احمد بن حنبل، امام بخاریؒ، ابوحاتم، ابوزرعۃ اور امام دارقطنی رحمہم اللہ ہیں۔ یہی علت خفیہ ہی تو تھی جو امام مسلم کو کئی روز پریشان کرتی رہی باوجودیکہ بیشتر مشائخ سے بھی پوچھ چکے تھے مگر امام بخاری رحمہ اللہ سے اس علت کا جواب پا کر امام مسلمؒ کی حیرت اور، خوشی، عقیدت میں بدل گئی۔ امام حاکمؒ لکھتے ہیں۔ یہ حدیث:

مَنْ جَلَسَ مَجْلِساً كَثُرَ فِيهِ لَغَطُهُ فَقَالَ قَبْلَ أَنْ يَقُومَ: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا إِلٰهَ إِلا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ، إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا كَانَ فِي مَجْلِسِهِ ذٰلِكَ۔ جو کسی ایسی مجلس میں بیٹھے جس میں فضولیات سرزد ہو جائیں تو وہ اٹھنے سے پہلے یہ پڑھے: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ لَا إِلٰهَ إِلا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ، تو مجلس کی ایسی فضولیات بخش دی جاتی ہیں۔

امام مسلمؒ امام بخاریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہا:

حَدَّثَكَ مُحمدُ بْنُ سَلَامٍ، قَالَ: ثَنَا مَخْلَدُ بْنُ يَزِيدَ الْحَرَّانِيُّ، قَالَ: أَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ، عَنْ مُوسَى بْنُ عُقْبَةَ، عَنْ سُهَيلٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أبي هريرةَ عَنِ النبيِّ ﷺ فِي كَفَّارَةِ الْمَجْلِسِ فَمَا عِلَّتُهُ؟۔ آپ کو محمد بن سلام نے یہ حدیث بیان کی۔۔۔ جو محمد بن یزید حرانی، ابن جریج، موسیٰ بن عقبہ، سہیل، ان کے والد اور ابوہریرہ اور نبی ﷺ سے کفارہ مجلس کے بارے میں ہے اس کی علت کیا ہے؟

یعنی آپ کو یہ حدیث اس سند سے ملی تو اس میں علت کیا ہے؟

قَالَ مُحمدُ بْنُ إسماعيلَ: هَذَا حَدِيثٌ مَلِيحٌ، وَلَا أَعْلَمُ فِي الدُّنْيَا فِي هَذَا الْبَابِ غَيرَ هَذَا الْحَدِيثِ إِلَّا هُوَ مَعلولٌ، حَدَّثَنَا بِهِ مُوسَى بْنُ إِسماعيلَ، قَالَ: حَدَّثَنا وُهَيبٌ۔ قَالَ: ثَنَا سُهَيلٌ عَنْ عَونِ بْنِ عَبدِ اللّٰهِ قَولَهُ۔ قَالَ محمدُ بْنُ إسماعيلَ: هَذَا أَولَى، فَإِنَّهُ لَا يُذْكَرُ لِمُوسَى بْنِ عُقْبَةَ سَمَاعاً مِنْ سُهَيْلٍ۔ بخاری نے فرمایا: یہ حدیث ملاحت والی ہے۔ اور دنیا میں اس موضوع سے متعلق کوئی دوسری حدیث

میں نہیں جانتا کہ ہو۔ مگر یہ معلول ہے۔ ہمیں یہ حدیث موسیٰ بن اسماعیل نے، انہوں نے وہیب سے اور انہیں سہیل نے عون بن عبداللہ سے آپ ﷺ کا ارشاد سنایا۔ امام بخاری فرمانے لگے: یہ سند اولی (سب سے بہتر) ہے کیونکہ پہلی حدیث کی سند میں موسیٰ بن عقبہ کا سماع سہیل سے مذکور ہی نہیں۔

یہ وضاحت سنتے ہی امام مسلمؒ فرط مسرت وحیرت میں فرمانے لگے:

دَعْنِيْ حَتّٰى أُقَبِّلَ رِجْلَيْكَ يَا أُستاذَ الأُستاذِيْنَ، وَسَيِّدَ الْمُحدثينَ، وَطَبِيبَ الْحَدِيثِ فِي عِلَلِهِ۔ مجھے اجازت دیجئے میں آپ کے قدم مبارک کو بوسہ دوں۔ اے استاذوں کے استاذ، محدثین کے سردار، اور حدیث کی بیماریوں کے ڈاکٹر۔ (معرفۃ علوم الحدیث از امام حاکم: ۱۱۳)

علت، زیادہ تر سند میں ہوتی ہے اور کبھی کبھار متن میں۔ یہ علت قادحہ ہوتی ہے اور غیر قادحہ بھی۔ مثلاً:

☆ ...... سند میں علت قادحہ جیسے وقف وارسال کی ہے۔ اور غیر قادحہ جیسے سند میں ثقہ کو ثقہ سے بدل دینا۔

☆ ...... متن میں علت قادحہ جیسے متن ایسا ہو جو احادیث مشہورہ اور صحیحہ کے مخالف ہو۔ اور غیر قادحہ یہ ہے کہ اس میں کچھ کم یا کچھ زیادہ ایسی عبارت ہو کہ ان کا آپس میں جمع کرنا بغیر کسی ترجیح یا اضطراب کے ممکن ہو۔ اسی لئے بعض علماء نے علت اس مخالفت کو بھی کہا ہے جو قادح نہیں جیسے ایسی حدیث کا ارسال کرنا جسے ایک ثقہ وضابط راوی نے موصول کیا تھا۔ اس کی مزید تفاصیل تدریب الراوی (۲۵۸/۱) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

مثال: سنن ترمذی: ۱۴ میں یہ روایت:

قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ، حَدَّثَنَا عَبْدُ السَّلَامِ بْنِ حَرْبٍ الْمُلَائِيُّ، عَنِ الأَعْمَشِ، عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: كَانَ النبيُّ ﷺ إِذَا أَرَادَ الْحَاجَةَ لَمْ يَرْفَعْ ثَوْبَهُ حَتّٰى يَدْنُوَ مِنَ الأَرضِ۔ ۔ ۔ ۔ آپ ﷺ جب قضائے حاجت کے لئے بیٹھتے تو زمین کے قریب ہونے سے پہلے اپنا کپڑا نہیں اٹھاتے تھے۔

اس حدیث کی سند بظاہر صحیح لگتی ہے اور اس کے رواۃ بھی ثقات ہیں مگر جو عیب ہے وہ یہ کہ امام اعمشؒ کا سماع سیدنا انسؓ سے ثابت ہی نہیں۔ امام ابن المدینیؒ فرماتے ہیں:

الأَعْمَشُ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، إِنَّمَا رَآهُ بِمَكَّةَ، يُصَلِّي خَلْفَ الْمَقَامِ۔ اعمش نے انس بن مالک سے حدیث نہیں سنی بلکہ انہیں مکہ میں مقام ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

اس کی پہچان: امام خطیبؒ بغدادی فرماتے ہیں:

وَالسَّبِيْلُ إِلَى مَعْرِفَةِ عِلَّةِ الْحَدِيثِ أَنْ يُجْمَعَ بَيْنَ طُرُقِهِ، وَيُنْظَرَ فِي اخْتِلَافِ رُوَاتِهِ، وَيُعْتَبَرَ بِمَكَانِهِم

مِنَ الْحِفْظِ، وَمَنْزِلَتِهِمْ فِي الإِتْقَانِ وَالضَّبْطِ۔ علت حدیث جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ حدیث کے تمام طرق کو جمع کیا جائے، ان میں اختلاف رواۃ پر غور کیا جائے، ان رواۃ کے فرق مراتب کو ملحوظ رکھا جائے کہ حفظ، اتقان اور ضبط میں کیسے ہیں۔

یہ تمام طرق یا اسانید کسی معین کتاب سے یا مسانید وسنن کی کتب سے جمع کئے جائیں۔ جن سے اگر یہ معلوم ہو کہ اس راوی نے حدیث میں فلاں ثقہ کی مخالفت محض وہم کی بنا پر کی ہے۔ تو ایسی حدیث غیر مقبول ہوگی۔ امام علیؒ بن المدینی فرماتے ہیں:

الْبَابُ إِذَا لَمْ تُجْمَعْ طُرُقُهُ لَمْ يَتَبَيَّنْ خَطَؤُهُ۔ یہ موضوع ہی ایسا ہے کہ جب تک حدیث کے تمام طرق کو جمع نہ کیا جائے اس کی خطأ کا علم ہی نہیں ہوتا۔

☆......**ضعیف حدیث کا ثبوت کیا ہے؟** جواب یہ ہے کہ محدثین نے مبالغہ سے کام لئے بغیر صحیح کی اہم شروط رکھی ہیں۔ مگر ساقط وموضوع روایات کے بارے میں ان کی یہ شرط نہیں۔ اس لئے کہ وہ ناقابل عمل ہیں۔

☆......**ضعیف مرویات کی کیا ہمیں ضرورت ہے؟** ابنؒ المبارک کہا کرتے: فِي صَحِيحِ الْحَدِيثِ شُغْلٌ عَنْ سَقِيْمِهِ۔ صحیح حدیث میں مصروفیت بندے کو سقیم حدیث سے بچائے رکھتی ہے۔ (سیر اعلام النبلاء ۸/۴۰۳)

☆......**پھر ائمہ اربعہ نے اپنی سنن میں ضعیف رواۃ کی احادیث کیوں ذکر کیں؟** مثلاً: عطاء بن السائب، لیث، یزید بن ابی زیاد، ابان بن صمعہ، محمد بن اسحاق، محمد بن عمرو بن علقمہ کی روایات، مسند احمد، سنن ابوداؤد، ترمذی اور نسائی وغیرہ میں بکثرت ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل صحاح وحسن کے بعد ائمہ محدثین کا چوتھے طبقہ کے ان ضعیف رواۃ کا انتخاب ان کا ذاتی اجتہاد ہے۔ جس میں شاید یہ باور کرانا ہے کہ طالب علم اتنا جان لے کہ یہ روایت ہماری تحقیق کے مطابق اس وجہ سے ضعیف تھی جو ہم نے اپنی کتاب میں درج کر دی۔ اس لئے اس آگاہی کے بعد کوئی معذرت پیش نہ کرے۔ جیسے امام ابوعیسی ترمذی ان رواۃ کی احادیث کو بیان کرتے ہیں اور اپنے اجتہاد سے ان کی وضاحت بھی کرتے ہیں مگر یہ بہت ہی تھوڑی ہیں۔ امام ابن ماجہ بھی ان کی چند احادیث بغیر بیان کئے ذکر کر جاتے ہیں۔ امام ابوداؤد بھی ان سے بہت کم روایت کرتے ہیں اور اگر کرتے بھی ہیں تو اکثر وبیشتر اس راوی کے بارے میں وضاحت کر دیتے ہیں۔

☆......رہی وہ روایات جو پانچویں طبقہ کے رواۃ کی ہیں تو محدثین جس راوی کی روایات کو رد کرنے یا اسے ترک کرنے پر متفق ہیں وہ راوی کے عدم فہم اور عدم ضبط کی وجہ سے ہے یا پھر راوی متہم ہے۔ مگر ایسے حضرات کی احادیث نادر ہی ہیں۔اس طبقہ کے راوی غالی رافضی، اور جہمی دعاۃ ہیں یا کذاب و وضاع لوگ یا متروک و تباہ شدہ لوگ جیسے عمر بن صبح، محمد مصلوب، نوح بن ابی مریم، احمد جو یباری، اور ابو حذیفہ بخاری ان کی کوئی روایت بھی ان کتب میں نہیں۔صرف عمر کی ایک روایت ابن ماجہ ذکر کرتے ہیں جو صحیح نہیں۔اسی طرح ابن ماجہ نے واقدی کی بھی ایک حدیث روایت کی ہے اور اس کا نام تدلیس کر کے مبہم انداز میں پیش کیا ہے۔(سیر اعلام النبلاء ۱۲/۵۷۵)

۲۔سند میں سقوط کی وجہ سے

یہ سقوط یا انقطاع سند کے شروع، آخر یا درمیان میں کہیں بھی ہوسکتا ہے۔مثلاً:

حَدَّثَنِیْ ۱ ، حَدَّثَنِیْ ۲ ، حَدَّثَنِیْ ۳، حَدَّثَنِیْ ۴۔اگر سند کو نمبر۲ یا اس سے اوپر کسی کی طرف منسوب کیا جائے تو یہ سند کے شروع میں سقط ہو گیا۔اور اگر سند میں نمبر۲، ۳ راوی غائب ہوں تو یہ سقط درمیان میں ہو گیا۔اور اگر نمبر۴ راوی سند میں غائب ہو تو یہ سقط سند کے آخر میں ہوا۔یعنی صحابی سند میں غائب۔اس وجہ سے حدیث ضعیف ہو جاتی ہے۔اس کی دو اقسام ہیں:

۱۔سقط جلی　　　　۲۔ سقط خفی

۱۔سقط جلی: اس کی درج ذیل چار اقسام ہیں:

۱۔منقطع، ۲۔معضل، ۳۔مرسل ۴۔معلق،

۲۔سقط خفی کی درج ذیل دو اقسام ہیں:

۵۔مدلس　　　　۶۔مرسل خفی

اولاً: سقط جلی کی اقسام بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ **منقطع:** یہ سقوط جلی کی پہلی قسم ہے۔جس کی تعریف یہ ہے:

مَا کَانَ فِي إِسنَادِهِ انْقِطَاعُ رَاوٍ فَأَکْثَرَ لَا عَلَی التَّوالِي فِیْمَا دُونَ طَبَقَةِ الصَّحابِيِّ۔ جس حدیث کی سند میں انقطاع۔۔صحابی کو چھوڑ کر۔۔ایک یا دو جگہ پر۔۔تسلسل سے نہیں۔۔کہیں بھی ہو تو اسے منقطع کہتے ہیں۔

مثال:

مُوسَی بْنُ عُقْبَةَ، عَنْ عَبدِ اللهِ بْنِ عَلِيٍّ، عَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ، قَالَ: عَلَّمَنِی رسولُ اللهِ ﷺ هٰؤُلَاءِ الْکَلِمَاتِ فِي الْوِتْرِ۔ فَذَکَرَ حَدِیثَ دُعاءِ القُنوتِ۔

یہ سند منقطع ہے۔امام ابن حجرؒ التَّلْخِیصُ الْحَبِیْرُ میں (۲۶۴۱) میں لکھتے ہیں: عبدُ اللهِ بنُ علي وَهُو ابْنُ الْحُسَینِ بْنِ عَلِيٍّ لَمْ یَلْحَقِ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ۔ مگر دوسری سند کے ساتھ یہی حدیث بقول امام ترمذی (ح:۴۶۴)حسن ہے اور امام ابن خزیمہ(ح ۱۰۹۵) اسے صحیح کہتے ہیں۔اسی طرح منقطع کی دوسری مثال: عَبدُ الرزاقِ عَنِ الثَّورِيِّ، عَن أبي إسْحٰقَ۔شریکؒ نے اپنی سند میں ثوریؒ کو ساقط کر دیا۔(معرفۃ علوم الحدیث:۳۶)

اقسام منقطع: اس کی دو قسمیں ہیں: انقطاع واضح اور انقطاع مخفی۔

۱۔ **انقطاع واضح:** جس حدیث کی سند میں ایک،دو یا زیادہ مگر بغیر تسلسل کے راوی ساقط ہوں، یا سند میں مبہم آدمی کا ذکر ہو۔جیسے مالك عن ابن عمر۔یہ واضح انقطاع ہے کیونکہ بظاہر یہ روایت متصل اور صحیح لگتی ہے مگر ہے نہیں۔اکثر محدثین تبع تابعی کی صحابی سے روایت کو منقطع کہتے ہیں۔اسے بذریعہ تاریخ یا عدم ملاقات بھی پہچانا جاتا ہے۔مثلاً: راوی جس شیخ سے روایت کر رہا ہے اس کا اس نے زمانہ ہی نہیں پایا وہ اس کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا تو یہ ثبوت ہے کہ راوی کی منسوب الیہ سے ملاقات ہوئی ہی نہیں۔یا زمانہ پایا ہے مگر شیخ سے سننا محال ہے۔وہ اس طرح کہ جب شیخ فوت ہوئے تو راوی تین سال کے تھے۔دونوں اس عرصہ میں کبھی اپنے شہر سے نکلے ہی نہیں۔نہ ہی ان کی ملاقات ہوئی۔اب راوی کی ان سے روایت منقطع ہی ہوگی۔محدثین کو اس لئے راویوں کی تاریخ پیدائش ووفات،طلب حدیث کا زمانہ اور رحلہ کو جاننے کے لئے علم رجال کو متعارف کرانا پڑا۔تاکہ روایات کے نودو لیتیے اس علم کے ذریعے جھوٹے ثابت ہوں۔عدم ملاقات زمان اور مکان دونوں کو شامل ہے۔امام

دارقطنی اور امام بیہقی منقطع کی پہچان میں کمال رکھتے تھے۔

☆...... کیا بہرے اور اندھے کی روایت بواسطہ کتابت متصل ہوگی یا منقطع؟ امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

كَتَبَ إِلَيَّ قَتَادَةُ۔۔مِنَ الْبَصرةِ۔۔إِنْ كَانَتِ الدَّارُ فَرَّقَتْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ فَإِنَّ أُلْفَةَ الإِسْلامِ بَيْنَ أَهْلِهَا جَامِعَةٌ۔ امام قتادہ نے مجھے لکھا: اگر چہ شہر نے ہمارے درمیان جدائی ڈال دی ہے مگر اسلام کی الفت ومحبت مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت کو جمع کرنے والی ہے۔

امام ذہبیؒ فرماتے ہیں: امام اوزاعیؒ کا یہ کہنا: مجھے لکھا۔اور ایک حدیث میں ۔۔ مجھے قتادہ نے لکھا۔ ہے۔ یہ مجازی اتصال ہے کیونکہ قتادہ پیدائشی نابینا تھے۔ انہوں نے کسی کو کہا جو اوزاعیؒ کے لئے ان کا یہ خط لکھے۔ ایک فروعی مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ نابینا کی یہ روایت بواسطہ کاتب ہوئی جس کا نام حدیث میں نہیں۔ جو واضح سا انقطاع ہے۔(سیر ۱۳۱/۷)

حکم: ضعیف حدیث کی اقسام میں سے ہے۔ کیونکہ اس میں محذوف راوی کے بارے میں لاعلمی ہے۔

☆...... بیشتر محدثین نے معضل و منقطع کو بمعنی مرسل لیا ہے جو ایک حدیثی اصطلاح ہے۔(جَامعِ التَّحصِیلِ از علائی:۹۶)

☆...... ہر معضل سند منقطع ہے اور ہر منقطع سند معضل نہیں۔(تَوضِیحُ الأَفکَارِ: ۲۹۳)

☆...... مرسل اور منقطع ہونا علت نہیں ہے۔(بَیانُ الْوَھْمِ وَالإِیْھَامِ ۳۸۶/۵)

۲۔انقطاع مخفی: تدلیس اس میں شامل ہے جو تدلیس کے باب میں ہم تفصیل سے پڑھیں گے۔

۲۔معضل:

هُوَ مَا سَقَطَ مِنْ إِسْنَادِهِ رَاوِيَانِ مُتَتَالِيَانِ أَوْ أَكْثَرُ۔ اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند میں دو یا دو سے زیادہ راوی یکے بعد دیگرے ساقط ہوں۔

یہ حدیث کثرت سقوط کی وجہ سے مرسل اور منقطع سے بھی کم درجے کی ہوا کرتی ہے کیونکہ ان دونوں میں سقط ایک

راوی کا ہوتا ہے۔ اور اس حدیث میں دو کا۔ امام علیؒ بن المدینی نے معضل کی تعریف یہ کی ہے:

اَلْمُعْضَلُ مِنَ الرِّوَایَاتِ أَنْ یَکُوْنَ سَقَطَ بَیْنَ الْمُرْسِلِ إِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ أَکْثَرَ مِنْ رَجُلٍ۔ معضل وہ روایت ہے کہ مرسل اور رسول اکرم ﷺ کے درمیان ایک سے زائد راویوں کا سقوط ہو۔

ابنؒ الصلاح فرماتے ہیں:

ھُوَلَقَبٌ لِنَوْعٍ خَاصٍ مِنَ الْمُنْقَطِعِ، فَکُلُّ مُعْضَلٍ مُنْقَطِعٌ وَلَیْسَ کُلُّ مُنْقَطِعٍ مُعْضَلاً۔ یہ تو منقطع کی ایک خاص نوع کا نام ہے۔ ہر معضل، منقطع ہوا کرتی ہے اور ہر منقطع معضل نہیں ہوا کرتی۔

مثال: ابن ابی شیبہؒ نے مصنف (۲۸۶/۵) میں اور ابن ابی الدنیا نے ذَمُّ الْمَلَاھِیْ (۸۰) میں قتادۃ بن دعامہ کی سند سے یہ روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں:

ذُکِرَ لَنَا أن نَبِیَّ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: اَلْکَعْبَتَانِ مِنْ مَیْسِرِ الْعَجَمِ۔ ہمیں بیان کیا گیا کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: چوسر کے دونوں پانسے عجمی حضرات کا جوا ہیں۔

اس سند میں قتادہ بن دعامۃ جو صغار تابعین میں سے ہیں جن کی زیادہ تر روایات کبار تابعین سے ہیں۔ مگر وہ رسول اللہ ﷺ سے صیغہ تمریض کے ساتھ روایت کر رہے ہیں اس لئے اس سند میں تابعی اور صحابی دو راویوں کا سقوط ہے جو معضل ہوگی۔

مثال۔ اَلْقَعْنَبِیُّ عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ أَبَاھُرَیْرَۃَ، کی سند میں امام مالکؒ اور سیدنا ابو ہریرہؓ کے درمیان دو راوی کم از کم ساقط ہیں جو کہ دوسری سند سے یہ معلوم ہوتے ہیں: عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَجْلَانَ عَنْ أَبِیهِ عَنْ أَبِی ھُرَیْرَۃَ۔

۳۔ مرسل:

لغت میں: اسم مفعول ہے۔ جس کا مطلب ہے: بھیجی ہوئی۔ چھوڑی ہوئی۔ جب کسی چیز کو چھوڑ دیں نہ روکیں تو اسے ارسال کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿إنا أرسلنا الشیطن علی الکفرین تؤزھم أزا﴾ اسی طرح

عرب کہا کرتے ہیں: جَاءَ الْقَومُ أَرْسَالاً۔ لوگ گروہ گروہ آئے۔ رَسْلٌ: چیز سے کٹی ہوئی شے کو کہتے ہیں۔اس کی جمع أَرْسَال ہے۔أَرْسَلُوا أِبِلَهُمْ إِلَى الْمَاءِ إِرسَالاً۔ انہوں نے اپنے اونٹ پانی کی طرف گروہ گروہ بنا کر بھیجے۔ و جَاؤُوا رَسلةً رَسْلَةً: وہ جماعت در جماعت آئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مرسل استرسال سے لیا گیا ہو۔ جو اپنی گفتگو میں اطمینان اور خود اعتمادی رکھتا ہو۔ گویا کہ مرسل، اسناد کو چھوڑ دیتا ہے اور اسے کسی معروف راوی سے مقید نہیں کرتا۔

اصطلاح میں: اس کی تعریف یہ ہے:

مَا رَفَعَهُ أَو نَسَبَهُ التَّابِعِيُّ ۔۔صَغِيراً أَو كَبِيراً۔۔ إِلَى الرَّسولِ ﷺ مِنْ قَولٍ أَو فِعْلٍ أَو تَقْرِيرٍ أَو صِفَةٍ۔ وَ لَمْ يَسْمَعْ مِنْهُ ۔ وہ حدیث جسے تابعی خواہ وہ کبیر ہو صغیر، رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دے جو اس نے آپ ﷺ سے سنی ہی نہیں۔ مرسل کہلاتی ہے (مقدمہ ابن الصلاح:۱۳۰)

مثلاً تابعی یوں کہے: قَالَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ أَو فَعَلَ أَو كَانَ كَذَا و كَذَا۔ امام عبدالرزاق اپنی (مصنف:۵۲۸۱) میں ابن جریج سے اور وہ عطاء سے روایت کرتے ہیں:

أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا صَعِدَ الْمِنْبَرَ أَقْبَلَ بِوَجْهِهِ عَلَى النَّاسِ، فَقَالَ: السَّلامُ عَلَيْكُمْ۔ بے شک نبی کریم ﷺ جب منبر پر چڑھتے تو اپنا چہرہ مبارک لوگوں کی طرف کر لیا کرتے تو فرماتے: السلام علیکم۔

اس روایت میں عطاء بن ابی رباح کبیر تابعی ہیں، جماعت صحابہ سے انہوں نے احادیث سنیں مگر ان کی یہ روایت مرسل ہے۔ وہ ثقہ ہیں مگر ان کے درمیان جو واسطہ ساقط ہے وہ یا تو ثقہ تابعی کا ہے یا صحابی کا۔ ضعیف تابعی کا نہیں۔

☆......محدثین مرسل کو تابعین کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں مگر اصولی اسے تابعی اور غیر تابعی تک لے جاتے ہیں۔ یعنی سند کہیں بھی راوی اور مروی عنہ کے مابین منقطع ہو وہ مرسل ہوگی خواہ وہ تابعی سے ہو یا کہیں اور نیچے سے۔ اس لئے ان اصولیوں کے نزدیک معضل، منقطع اور مرسل ایک ہی شے کے مختلف نام ہیں۔

اصول: ا...... جمہور محدثین کے نزدیک مرسل روایت نا قابل احتجاج ہے کیونکہ جو راوی ساقط ہے وہ مجہول

ہے۔ نیز اس سقط کے متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں کہ وہ صحابی ہوں، یا تابعی ہو۔ اگر تابعی ہے تو یہ بھی احتمال ہے کہ وہ ضعیف ہو یا ثقہ بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال ان کے حالات سے آگاہی نہیں ہو پاتی اس لئے مرسل مردود ہے۔

۲..... نقاد حفاظ اور ائمہ حدیث مرسل حدیث کو نا قابل احتجاج سمجھتے ہیں۔ امام مسلم اپنی صحیح کے مقدمہ (۳۰/۱) میں لکھتے ہیں: اَلْمُرْسَلُ مِنَ الرِّوَايَاتِ فِي أَصْلِ قَوْلِنَا وَقَوْلِ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالأَخْبَارِ، لَيْسَ بِحُجَّةٍ۔ مرسل روایات ہمارے اصل قول یا ان علماء کے قول کے مطابق جو اخبار کو جانتے ہیں: حجت نہیں ہے۔ جب کہ علماء احناف کا یہ مسلک ہے: فَأَمَّا مَرَاسِيلُ الْقَرْنِ الثَّانِي وَالثَّالِثِ حُجَّةٌ فِي قَوْلِ عُلَمَائِنَا رَحِمَهُمُ اللّٰهُ۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری کی مراسیل بھی ہمارے علماء کے بقول حجت ہیں۔ (اصول السرخسی ۳۶۰/۱) اس لئے مرسل امام ابوحنیفہؒ ان کے اصحاب، امام مالکؒ اور ان کے اتباع اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ کے نزدیک حجت ہے۔ (اصول الجصاص ۱۴۵/۳، کشف الأسرار ۲/۳، إحکام الفصول: ۳۴۹، العدۃ لأبی یعلی ۹۱۰/۳، شرح الکوکب ۵۷۶/۲)

۳..... محدثین کا کہنا ہے کہ اتصال سند اور اس کا سماع ہی روایت حدیث کی شان ہے۔ یہ دونوں حالتیں طرق تحمل ہی نہیں بلکہ اداء حدیث بھی بتا رہی ہیں نیز یہ بھی کہ روایت مثلی ہو۔ یہ اشارہ بھی ان دونوں میں ہے کہ راوی اپنے شیخ سے وہی روایت کرے جو اس کے شیخ نے اپنے شیخ سے تا آخر سند سنا ہے۔ (جامع التحصیل: ۵۲)۔

متصل و مرسل میں تعارض اور اصول: جب ایک حدیث کو ایک راوی مرسل پیش کرے اور دوسرا متصل۔ تو کون سی حدیث قبول کرنی چاہیے؟ علماء کے اس بارے میں چار نکتہ ہائے نظر ہیں۔

۱۔ متصل کو مرسل پر ہر حال میں ترجیح دینی چاہیے۔

۲۔ مرسل کو متصل پر ترجیح ہوگی۔

۳۔ فیصلہ کثرت روایات کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ اگر مرسل کرنے والے متصل سے زیادہ ہیں تو مرسل ورنہ متصل لے لی جائے گی۔

۴۔ رواۃ میں جس طرف احفظ ہے اسی کی روایت قابل اعتبار ہے۔ اگر احفظ نے روایت مرسل کی ہے تو وہ لی جائے گی اسی طرح بالعکس۔

اب جمہور محدثین اور اصحاب اصول کی آراء کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ان کے مطابق وواقوال زیادہ معتبر ہیں۔

آراء: ......ابن حبان لکھتے ہیں: اگر ایک عادل روایت کو مرسل بیان کرے اور دوسرا متصل۔تو متصل کی خبر قبول ہوگی کیونکہ اس راوی کے پاس ایک اضافی شے ہے جسے اس نے یاد رکھا اور سند متصل پیش کی۔جبکہ دوسرا اتقان میں اس جیسا نہ تھا کہ وہ مکمل سند کو یاد رکھ سکتا۔کثرت عدد اور قلت عدد کا یہی حکم اور شرط دیگر روایات پر بھی لاگو ہوگا۔(الإحسان فی تقریب صحیح ابن حبان ۱/۱۵۷)

......ابوالحسن ابن القطان کا یہی خیال ہے کہ اس راوی کو لیا جائے جو ثقہ ہو اور سند متصل بیان کرتا ہو۔(النکت ۲/۶۰۴)۔مستدرک (۱/۸۶) میں امام حاکم کا کہنا ہے اگر حدیث کو ایک راوی متصل بیان کرتا ہے اور دوسرا مرسل: إِنَّا عَلَى الْأَصْلِ الَّذِيْ أَصَّلْتُهُ فِي قَبُولِ الزِّيَادَةِ مِنَ الثِّقَةِ فِي الْأَسَانِيدِ وَالْمُتُونِ۔تو ہم اسی اصول پر چلیں گے جو میں نے بیان کر دیا ہے کہ ثقہ راوی کا اضافہ اسانید ومتون میں قبول کیا جائے گا۔ابن الصلاح (مقدمہ:۱۶۳) اور نووی (مقدمہ صحیح مسلم ۱/۳۲) نے محقق محدثین کا یہی قول لکھا ہے۔امام عراقی (التبصرة والتذکرة ۱/۱۷۵) اور ابن جماعہ (المنھل الروی:۶۲) بھی اسی کے قائل ہیں۔

......جمہور اصولی علماء مرسل کی طرف التفات کئے بغیر متصل کو ہی وقت احتجاج لیتے ہیں۔دیکھئے: (اَلْمَدْخَلُ فِي أُصولِ الْحدیث:۵۷، مقدمہ ابن الصلاح:۱۶۳) امام مالکؒ کا بھی یہی قول ہے۔(شرح تنقیح الفصول:۳۸۲)۔امام الحرمین لکھتے ہیں: امام شافعیؒ ثقہ کا اضافہ مطلق طور پر قبول کرتے ہیں۔(البرہان ۱/۶۶۲)۔ابوالخطاب نے یہ لکھا ہے (التمہید از کلوذانی ۳/۱۴۴) کہ امام احمدؒ بھی دو روایات کے مطابق وصل کو قبول کرتے ہیں۔زیدیہ اور اکثر متکلمین بھی وصل ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔فخر الدین رازی بھی لکھتے ہیں کہ متصل روایت کو ترجیح دینے پر اصولی اور فقہاء سب کا اتفاق ہے۔ترجیح کی وجوہات وہ (المحصول ۲/۱/۶۶۲) یہ لکھتے ہیں:

وصل میں ثقہ کا اضافہ ہو تو مقبول ہے۔اگر عادل ہونے کی وجہ سے اس کا ارسال قبول ہے تو اس کا وصل بھی بطریق اولیٰ قبول ہونا چاہئے۔وصل میں علم کا بھی اضافہ ہے جو مرسل کے حفظ وعلم میں نہیں۔حفظ تو غیر حافظ پر حجت ہوتا ہے۔
مرسِل، راوی کے حال کے بارے میں ساکت ہوتا ہے اور واصل ناطق۔ساکت کس طرح ناطق کا معارض ہو سکتا ہے۔
نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرسِل نے حدیث ہی مرسل سنی ہو اور واصل نے متصل۔اس لئے مثبت، نافی پر مقدم ہوتا ہے۔

پہلا قول:: یہ محدثین اصولاً حدیث متصل اور مرسل میں تعارض کی صورت کو تسلیم ہی نہیں کرتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مرسل اور متصل کے مابین مقابلہ کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک متصل ہے اور دوسری مرسل۔ اس میں تعارض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ متصل حدیث کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اس کے مقابلے میں مرسل ایک ہو یا پوری جماعت یا مرسل راوی خواہ حفظ میں واصل راوی کے برابر کا درجہ رکھتا ہو یا اس سے بھی زیادہ احفظ ہو۔ وہ مرسل میں صحیح کی شروط مفقود پا کر اسے ضعیف قرار دیتے ہیں۔ یہ جمہور محدثین اور اصولیین کا قول ہے۔ خطیب بغدادی اسی کے قائل ہیں۔

دوسرا قول: ان محدثین کے نزدیک۔۔ تعارض کی ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کچھ رواۃ نے اسے متصل روایت کیا ہو اور کچھ نے مرسل۔ اور ترجیح کا کوئی حتمی فیصلہ بھی نہ ہو پائے تو روایات کے مراتب اور درجات دیکھے جائیں اور ان میں جو اعلیٰ درجہ و مرتبہ کی روایت ہے اسے ترجیح دی جائے۔

امام ابن حجرؒ فرماتے ہیں: متقدمین ائمہ حدیث۔۔ جیسے عبدالرحمٰن بن مہدی، یحیی القطان، احمد بن حنبل، یحیی بن معین، علی بن المدینی، امام بخاری، ابوزرعۃ، ابوحاتم، امام نسائی، دارقطنی وغیرہم اس ترجیحی فیصلہ کو معتبر مانتے ہیں جس کا تعلق اضافہ سے ہو نہ کہ صرف قبول اضافہ سے۔ یہ اضافہ متن میں بھی ہو سکتا ہے اور سند میں بھی۔ ان کے راجح و مرجوح کے ترجیحی فیصلے یوں ہوتے ہیں:

ترجیح باعتبار حفظ: جب احفظ راوی اپنی حدیث متصل بیان کرے تو اس کی روایت ترجیح پا جائے گی۔ اور اگر احفظ راوی حدیث کو مرسل بیان کرے تو اس کی روایت راجح ہوگی۔

ترجیح تعداد کے اعتبار سے: روایت کے راوی اگر بکثرت ہوں تو محدثین کے ہاں کثرت تعداد بھی ترجیح دینے کا ایک قرینہ ہے۔ اس لئے جب کسی حدیث کو مرسل بیان کرنے والے بکثرت ہوں اور متصل بیان کرنے والے تھوڑے ہوں تو ترجیح مرسل روایت ہی کو ہوگی۔ اور اگر بالعکس معاملہ ہو تو راجح متصل ہوگی۔

ترجیح بکثرت ساتھ رہنے کی وجہ سے: مراد یہ کہ راوی، مروی عنہ (شیخ) کے ساتھ بکثرت رہا ہو اور اس سے روایت و علم حاصل کرنے میں معروف و مشہور ہو۔ جیسے عروہ بن الزبیر رحمہ اللہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرنے اور ان سے علم حاصل کرنے میں جانے پہچانے ہیں۔ جب ایسا راوی حدیث متصل بیان کرے

اور ان کی مخالفت دوسرا ایسا راوی کرے جو ام المؤمنین سے حدیث لینے اور روایت کرنے میں معروف ہی نہیں تو ظاہر ہے عروہ کی متصل حدیث ہی ترجیح پا جائے گی اور مرسل کی نہیں۔

مختلف اوقات میں سنی ہوئی حدیث کی ترجیح: جب دو روایات میں ایک روایت کے راوی احفظ ہوں اور ان کا سماع حدیث، شیخ کی صرف ایک ہی مجلس میں جب کہ دوسرے رواۃ حدیث کا سماع، شیخ کی متعدد مجالس سے ثابت ہو تو ان کی روایت اس امتیاز کی بناء پر راجح ہوگی اس لئے کہ احفظ کی روایت صرف ایک ہی مجلس میں ہوئی۔

متابعت کی بناء پر ترجیح: مثلاً ایک روایت کی سند نافع عن ابن عمر ہے۔ نافع سے پانچ عادل راوی یہی حدیث متصل بیان کرتے ہیں۔ اور دو اور عادل ان کی مخالفت کرتے ہوئے اسے مرسل بیان کرتے ہیں تو یہاں اعتبار نافع کے اوپر والے کا ہوگا کہ کیا نافع کے علاوہ کسی اور ثقہ نے یہی روایت ابن عمر سے کی؟ اگر ایسی متصل روایت مل جائے جسے متابعت کہتے ہیں تو یہی ترجیح پا کر قبول کر لی جائے گی۔ علماء حدیث ایسی ترجیح میں قرائن ہی کو اہمیت دیتے ہیں۔ مثلاً: امام بخاری وامام ترمذی رحمہما اللہ حدیث لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ وَشَاهِدَي عَدْلٍ کی مرسل اور متصل اسانید کے تتبع کے بعد متصل کو مرسل پر ترجیح دیتے ہیں۔ مگر ایک اور حدیث جو مرسل ہے اسے کسی ترجیحی قرینہ کی وجہ سے متصل کے مقابلے میں راجح قرار دیتے ہیں مثلاً: حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا: آپ ﷺ نے انہیں فرمایا: إِنْ شِئْتِ سَبَّعْتُ لَكِ۔ (صحیح مسلم: ۱۴۶۰) یہ حدیث سفیان ثوری، محمد بن ابی بکر بن حزم سے اور وہ عبد الملک بن ابی بکر سے، وہ اپنے والد سے اور وہ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے متصلاً روایت کرتے ہیں۔ مگر امام مالکؒ اسی حدیث کو عبد اللہ بن ابی بکر بن الحارث سے مرسل روایت کرتے ہیں: کہ رسول اللہ ﷺ نے ام سلمہؓ سے فرمایا۔ باوجود مرسل ہونے کے امام بخاریؒ فرماتے ہیں: الصَّوَابُ قَوْلُ مَالِكٍ۔ صحیح قول امام مالکؒ کا ہے۔ اس حدیث میں ایک قرینہ کے ظاہر ہونے پر انہوں نے مرسل کی تصویب کی اور پہلی حدیث میں اتصال کا قرینہ مل جانے سے متصل کو ترجیح دی۔ اس لئے ائمہ محدثین کا کوئی لگا بندھا قاعدہ نہیں جس پر وہ عمل کرتے ہوں بلکہ قرائن کو دیکھ کر وہ تصویب وخطا کا فیصلہ کرتے ہیں۔

یہی حال امام ترمذیؒ کا اور دیگر ائمہ حدیث امام ابن خزیمہ، دارقطنی اور ابن عبد البر رحمہم اللہ کا ہے کہ وہ ارسال ووصل میں کسی قاعدہ کے پابند نہیں بلکہ حسب حال وحسب ضرورت جو ترجیح اس موقع پر انہیں سوجھتی وہ کر دیتے۔

اس لئے تعارض کی صورت میں اصولی وفقہاء حضرات کی طرح محقق محدثین اتصال کی ترجیح کے قائل نہیں رہے بلکہ حسب حال وقرائن ترجیح دیتے۔امام ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

يَتَبَيَّنُ عَظِيمُ مَوقِعِ كَلامِ الأئِمةِ الْمُتَقَدِّمينَ، وَشِدَّةِ فَحْصِهِمْ، وَقُوَّةِ بَحْثِهِمْ وَصِحَّةِ نَظَرِهِمْ، وَتَقَدُّمِهِمْ بِمَا يُوجِبُ الْمَصِيرَ إِلَى تَقْلِيدِهِمْ فِي ذَلِكَ وَالتَّسْلِيمِ لَهُم فِيهِ۔ ائمہ متقدمین کا بر موقع کلام اس عظمت کی نشاندہی کرتا ہے کہ انہوں نے بشدت سے حدیث کی چھان پھٹک کی اور اس کی بحث میں خود کو جان جوکھوں میں ڈالا اور صحیح علمی نظر دوڑائی، اس معاملہ میں وہ جتنا بھی آگے جا سکتے تھے گئے۔ یہی تحقیق دوسروں کو مجبور کرتی ہے کہ ان کے منہج کو ہی اپنائیں اور اس کے آگے اپنے اصولوں کو زیر کردیں۔(النکت ۲/۶۰۵)

اسی اصولی فرق کی بنا پر فقہی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔حدیث لا نکاح إلا بولی ائمہ ثلاثہ کے بقول عقد نکاح کے وقت چونکہ ولی نکاح کے معاملہ کا ذمہ دار نہیں بنا تو ایسا نکاح باطل ہے۔مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ایسا نکاح صحیح ہے کیونکہ عورت اگر بالغ ہو اور اس کا صحیح کفوا سے مل جائے تو بغیر ولی کے نکاح درست ہے۔رہی یہ متصل حدیث تو وہ فقیہ طحاوی رحمہ اللہ کے نزدیک (شرح معانی الآ ثار ۳/۸) منقطع وضعیف ہے۔چونکہ وہ مرسل کو قابل احتجاج سمجھتے ہیں اس لئے وہ اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ورنہ بقول ابن الہمام یہ تضعیف محض الزامی ہے۔(شرح فتح القدیر ۳/۲۵۹)

نوٹ: امام ابن حجر رحمہ اللہ نے سات ایسے تابعی گنوائے ہیں جو ایک دوسرے سے روایت کرتے ہیں۔

مرسل صحابی: ایسے صحابی رسول، حدیث بیان کریں جو متاخر الاسلام ہوں۔ یا واقعہ کے وقت وہ موجود نہ تھے۔ یا دوسرے صحابی کی نسبت یہ صغیر السن تھے مگر انہوں نے حدیث کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کردی۔ جیسے حدیث ابو ہریرہؓ: مَنْ أَصْبَحَ جُنُباً فَلاَ صَومَ لَهُ۔ جب اس کی تردید کی گئی تو فرمانے لگے: مجھے اس کے بارے میں الفضل بن عباسؓ نے حدیث سنائی تھی۔(صحیح بخاری:۱۹۲۶)۔امام نسائی نے ابو ہریرہؓ کی بجائے اسامہؓ کا نام لکھا ہے۔جب کہ موطأ میں مخبر کا نام ہی مذکور نہیں۔کیا یہ حدیث مرسل نہیں؟

جمہور اہل علم کے نزدیک یہ حدیث مرسل صحابی کہلائے گی۔جس کا مطلب ہے کہ یا تو انہوں نے کسی دوسرے

صحابی سے یہ حدیث سنی ہے یا پھر خود رسول اکرم ﷺ سے بعد میں سنا ہے۔ ایسی تمام احادیث دوسری صحیح متصل مرفوع روایات کی مانند حجت ہیں۔ مثلاً: سیدنا ابن عباسؓ اور ابن الزبیرؓ کی احادیث۔ ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ ابن عباسؓ نے فتح مکہ کے بعد صحبت رسول کو اختیار کیا اور ابن الزبیرؓ ہجرت کے اگلے سال مدینہ میں پیدا ہوئے۔ حیات نبوی کے صرف ۸ سال ۴ مہینے انہوں نے پائے۔ مگر ان کی احادیث کا شمار متصل مسند میں ہوتا ہے۔

جمہور اہل علم ایسے صحابی کی روایت کو قابل احتجاج سمجھتے ہیں اس لئے کہ صحابی کی جہالت، حدیث کی صحت کے لئے مضر نہیں۔ کیونکہ صحابہ عادل ہیں۔ ایک اور ضعیف احتمال یہ بھی ہے کہ صحابی کسی تابعی سے روایت کردیں تو؟ مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ صحابی جب کسی تابعی سے روایت کرتے ہیں تو اس کا نام لیتے ہیں۔

یہ سوال کہ مراسیل صحابہ کو قبول کرنا چاہئے یا نہیں؟ ابن الترکمانیؒ نے کتاب اَلْجَوْهَرُ النَّقِيُّ میں متعدد مقامات پر اس سوال کے جواب دئے ہیں جن سے باور یہ ہوتا ہے کہ یہ سوال سب سے پہلے امام بیہقیؒ نے اٹھایا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ امام بیہقیؒ عدالت صحابہ کے نظریہ میں دوسرے محدثین سے مختلف نہیں۔ انہوں نے بے شمار مقامات پر لکھا ہے: جہالت صحابی حدیث کے لئے مضر نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ امام بیہقیؒ نے سند میں راوی کا نام مذکور نہ ہونے کی بناء پر اسے مرسل کہا جیسے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کسی بھی قسم کی حدیث یا ایسا قصہ آپ ﷺ سے روایت کرتے ہیں جو انہوں نے آپ ﷺ سے سنا ہی نہیں یا وہ قصہ ان کی ولادت سے قبل کا تھا کیونکہ جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے تو عمر مبارک ۴۰ برس کی تھی اور جب آپ ﷺ اڑتالیس سال کے ہوئے تب سیدنا ابن عباسؓ پیدا ہوئے۔ ایسی حدیث یا واقعہ جو سیدنا ابن عباسؓ کی ولادت سے پہلے کا ہو اور پھر اسے وہ خود بیان کریں اس بارے میں یقینی بات تو یہی کہی جاسکتی ہے یہ حدیث مرسل ہے اور انہوں نے آپ ﷺ سے سنا ہی نہیں۔ اسی طرح دیگر صغار صحابہ کی احادیث بھی مرسل ہوں گی کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ سے سنا ہی نہیں۔ یا آپ ﷺ سے سنا مگر اسے ایسے واقعے یا بات کے ساتھ جوڑا جب وہ خود اہل السماع میں سے نہیں تھے۔

اصل حدیث تو وہی ہے جسے صحابی نے خود آپ ﷺ سے سنا ہو۔ لیکن اگر صحابی یہ کہے: حَدَّثَنِي فُلَانٌ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ تو مرسل نہیں ہوگی کیونکہ اس نے راوی کا ذکر کردیا۔ اسی طرح سیدنا ابو ہریرہ یا ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہما نے ایسی حدیث روایت کی جب وہ مدینہ میں نہیں تھے یا ام المومنین پیدا نہیں ہوئی تھیں مگر جب وہ کسی

اور صحابی کا نام لیں یا وہ معلوم ہو جائے تو یہ حدیث بھی مرسل نہیں ہوگی۔ السُّنَنُ الْكُبْرٰی ہو یا الْمَعْرِفَةُ دونوں میں بہت سی مراسیل صحابہ ہیں۔ جنہیں باوجود مرسل کہنے کے دونوں کو قابل حجت سمجھا گیا ہے۔

۴۔ معلق: ابن حجرؒ اس کی تعریف یوں لکھتے ہیں:

هُوَ مَا حُذِفَ مِنْ مُبْتَدَأِ إِسْنَادِهِ رَاوٍ أَكْثَرَ وَلَو إِلَى آخِرِ الإِسْنَادِ۔ (ہدی الساری:۱۴) وہ حدیث جس کی ابتداء سند ہی میں ایک یا چند راوی محذوف ہوں خواہ یہ حذف آخر سند تک ہی کیوں نہ چلا جائے۔

اور راوی یہ کہہ دے کہ قَالَ ابْنُ عُمَرؓ یا قَالَ رسولُ اللّٰہِ ﷺ۔ مثلاً: **صحیح بخاری** کی کتابُ الایمانِ بَابُ حُسْنِ إسلامِ الْمَرْءِ میں (۱/۱۷) امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں:

قَالَ مَالِكٌ، أَخْبَرَنِي زَيْدُ بْنُ أَسْلَمَ، أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَسَارٍ أَخْبَرَهُ، أَنَّ أَبَاسَعِيدِ الْخُدرِي أَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَمِعَ رَسولَ اللّٰهِ ﷺ يَقولُ: إِذَا أَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ إِسْلاَمُهُ يُكَفِّرُ اللّٰهُ عَنهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ كَانَ زَلَفَهَا، وَكَانَ بعدَ ذلكَ القِصاصُ، اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أمثالِهَا إِلَى سَبعِ مِائَةِ ضَعْفٍ وَالسَّيئَةُ بِمِثْلِهَا، إِلَّا أن يَتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهَا۔

اس حدیث کی روایت میں امام بخاریؒ نے اپنے شیخ محترم کا نام ساقط کر دیا ہے۔ جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ، امام مالکؒ سے بالواسطہ نہیں بلکہ ایک واسطہ سے روایت کرتے ہیں۔

ایک اور مثال: كِتَابُ الطَّهارةِ/ بابُ: مَا جَاءَ فِي غَسْلِ الْبَولِ (۱/۵۱) میں ہے کہ آپ ﷺ نے صاحب قبر کے بارے میں فرمایا: وكَانَ لاَ يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ۔ اس حدیث کی ساری سند کو حذف کر کے صرف آپ ﷺ کا نام لیا۔

اصول:

......معلق کی اصطلاح سب سے پہلے امام دارقطنی رحمہ اللہ نے استعمال کی اور امام حمیدیؒ نے بھی الجَمْعُ بَينَ الصَّحِيحَينِ میں اس کا استعمال کیا ہے۔ (مقدمہ علوم الحدیث:۶۱)۔

......محذوف راوی کی لاعلمی کے سبب حدیث معلق نا قابل قبول ہوتی ہے۔ایسی حدیث محدثین کے ہاں ضعیف ہے جس کی وجہ سند میں ایک یا ایک سے زیادہ راوی کا سقوط ہے۔معلقات کا حکم بھی روایت کی صحت، حسن اور ضعف کے مطابق ہوگا۔

......صحیحین کے علاوہ دیگر کتب میں بھی معلقات موجود ہیں جنہیں تعلیقات کہہ دیا جاتا ہے۔

......بعض مصنفین بغیر سند کے حدیث بیان کر کے اسے اصل کتاب کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اسے تعلیق کہہ دیتے ہیں جو درست نہیں۔

......تعلیق کی اس تعریف سے اصول یہ بنتا ہے کہ جب حدیث محض راویوں کے سقوط سے ضعیف ہو سکتی ہے تو بزرگوں کے اقوال یا فتوے جو سقوط یا بغیر سند کے ان کی طرف منسوب ہوں تو وہ بدرجہ اولی ضعیف ہوں گے۔

☆......حافظ ابن حجرؒ (النکت:۹۳) میں لکھتے ہیں: امام بخاریؒ نے اپنے شیوخ سے جو تعلیق کی ہے شرف الدین دمیاطی اسے حوالہ نام دیتے ہیں۔

☆......امام احمدؒ فرماتے ہیں: محمدؒ بن اسحٰق کو حدیث کی بڑی خواہش تھی۔علماء حدیث کی کتب لے کر ان سے احادیث اپنی کتب میں لکھ لیتے۔امام ذہبیؒ فرماتے ہیں: یہ عمل محدثین میں عام ہے۔صحیح بخاری میں بیشتر تعلیقات ایسی ہی ہیں۔مثلاً: خارجہ بن زید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں یہود کی خط و کتابت سیکھ لوں۔آدھا مہینہ گذر نہ پایا تھا کہ میں نے یہ سب کچھ سیکھ لیا۔آپ ﷺ نے فرمایا: وَاللّٰهِ لَا آمَنُ الْيَهُودَ عَلَى كِتَابِي۔میں اپنے خط کے لکھنے یا پڑھنے میں یہودیوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔زیدؓ کہتے ہیں: جب میں نے یہ سب کچھ سیکھ لیا تو آپ ﷺ کے لئے یہود کے ساتھ خط و کتابت کیا کرتا اور جب وہ آپ ﷺ کی طرف کچھ لکھتے تو میں اسی خط کو پڑھتا تھا۔امام بخاریؒ نے اسے تعلیقاً یوں بیان کیا: وَقَالَ خَارِجَةُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ أَبِيهِ۔خارجہ نے اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے کہا۔کیونکہ اس روایت میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن ابی الزناد امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط پر پورا نہیں اترتے مگر اس کے باوجود انہوں نے اس روایت کو تعلیقات میں صیغہ جزم کے ساتھ پیش کیا ہے۔وجہ یہ ہے کہ اس روایت میں عبدالرحمٰن متفرد ہیں اور صادق بھی ہیں اور اپنے والد کے علم کی

معرفت بھی رکھتے ہیں۔ (سیر ۷/ ۴۶)

☆......امام دارقطنیؒ نے الإلزاماتُ وَالتَّتَبُّعُ میں بخاری ومسلم کی تعلیقات پر تنقید کی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تعلیقات، شیخین کی شروط کے مطابق نہیں۔

صحیحین کی معلقات: صحیحین میں وارد ایسی معلقات کیا ضعیف ہوں گی؟ یا ان کا کوئی خاص حکم ہے؟ صحیح بخاری میں معلقات کی کثرت کی کئی وجوہات علماء نے لکھی ہیں۔ مثلاً: فقہی واصولی ضرورت تھی۔ استشہاد مقصود تھا۔ صلب کتاب میں نہیں بلکہ بطور متابعت کے یہ تعلیقات لائے ہیں۔ اختصار چاہا۔ تکرار سے گریز کیا۔ دوسرے عالم کے نزدیک یہ حدیث صحیح تھی مگر ان کی نزدیک ضعیف۔ وغیرہ۔

ابوعلی الجیانی نے تقیید المهمل میں صحیح مسلم میں چودہ یا پندرہ معلقات کا ذکر کر کے ان کی تفصیلات دی ہیں۔ جن میں کچھ کو امام مسلم نے خود ہی موصول بتایا ہے، کچھ ان کے شاگردوں نے موصول ثابت کی ہیں اور کچھ کو امام مسلم صلب کتاب میں نہیں بلکہ بطور متابعت یا استشہاد کے لائے ہیں۔ اس طرح صحیح بخاری کی نسبت صحیح مسلم میں تعلیقات بہت کم ہیں۔

اصول: صحیح بخاری میں حدیث کا مواد دو قسم کا ہے ایک وہ جو ام الکتاب ہے جسے صلب کتاب کہہ سکتے ہیں یہی صحیح اور قابل اعتماد مواد ہے جبکہ دوسرا مواد بطور استشہاد کے ہے جس کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس میں تعلیقات بھی شامل ہیں۔ علماء حدیث نے ان تعلیقات کو پڑھنے کے بعد چند اصولی باتیں بیان کی ہیں تا کہ ہر قسم کی غلط فہمی سے بچا جا سکے۔

......اصل کتاب جہاں صحیح مسند متصل روایت ہوتی ہے وہاں امام بخاری تعلیق بیان نہیں کرتے۔ اسی لئے وہ اپنے استنباط کو دو طریقوں سے ثابت کرتے ہیں۔

......میں جو کہہ رہا ہوں اس کی صحیح دلیل یہ متصل، مسند، مرفوع حدیث ہے۔

...... چونکہ پہلے اس حدیث کا ذکر سند سمیت کتاب میں آ چکا ہے اس لئے یہ تعلیق پیش کر رہا ہوں۔ عاقل را اشارہ

کافی است۔ اختصار مقصود ہے اور تکرار سے اجتناب ہے ضخامت کتاب اس کے حسن کو گہنا دے گی جو بے فائدہ ہے۔

...... صیغہ جزم کے ساتھ معلق روایت کو، ثابت شدہ متصل اسناد کی حیثیت دیتے ہیں۔ حذف رواۃ کسی خاص غرض کی وجہ سے کرتے ہیں۔ مثلاً: قال فلان، یاذکر فلان، یاحَکَی فُلانٌ یا رَوَی فُلانٌ یہ سب الفاظ بخاریؒ محترم کے اعتماد کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ حدیث ثابت شدہ ہے۔ مثلاً اوپر کی حدیث جو امام مالکؒ سے تعلیق شدہ ہے اس حدیث کو امام بخاریؒ نے صیغہ جزم کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور یہ حدیث امام مالکؒ کی روایت سے صحیح ہے۔ اسی طرح دوسری حدیث وَکَانَ لَا یَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ کی تعلیق میں بھی امام بخاریؒ صیغہ جزم استعمال کرتے ہیں اور تکرار سے بھی بچنا چاہتے ہیں اس لئے اپنی صحیح میں اسے مختلف مقامات پر متصل روایت کیا ہے۔

...... صیغہ تمریض کے ساتھ جو تعلیقات بیان ہوئی ہیں جیسے رُوِی عَنْ فُلان، یُذْکَرُ عَنْ فُلانٍ یا قِیلَ: ان کے بارے میں دوسرا اصول یہ ہے کہ امام بخاری کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے:

وَ یُذْکَرُ عَن سلمة بْنِ الأَکْوَعِ أن النبیَّ ﷺ قال: یَزِرُّهُ وَلَو بِشَوکَةٍ۔ فی إسناده نَظَرٌ۔ (۷۴/۱_۷۵) کتابُ الصَّلاۃِ/بابُ : وُجُوبِ الصَّلاۃِ فِی الثِّیابِ)۔

اس تعلیق پر امام بخاریؒ کا تبصرہ آپ نے دیکھا جو ہمارے نقطہ نظر کی تائید ہے۔

اہم نوٹ: امام بخاریؒ کبھی اپنے شیخ محترم سے حدیث بیان کرتے وقت صیغہ جزم کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ ان کی تعلیق تو ہے مگر اس سے یہ مت سمجھا جائے کہ امام محترم نے اپنے اور شیخ کے درمیان کوئی راوی ساقط کر دیا ہے۔ بلکہ اہل علم یہی سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ایک انداز اتصال ہے جو بخاری محترم نے اپنایا ہے۔ مگر ابن حزمؒ اسے انقطاع کہتے ہیں۔

مثلاً: امام بخاری کا یہ قول جو صحیح میں الأَشْرِبَۃ/بَابُ مَا جَاءَ فِیمَنْ یَسْتَحِلُّ الْخَمْرَ وَیُسَمِّیهِ بِغَیرِ اسْمِهِ (۳۲۲/۳) میں ہے:

وَقَالَ هِشَامُ بْنُ عَمَّارٍ، حَدَّثَنَا صَدَقَةُ عَبدِ الرَّحمٰنِ بْنِ یَزِیْدَ بْنِ جَابِرٍ، حَدَّثَنَا عَطِیَّةُ بْنُ قَیسٍ الکلابِیُّ، حَدَّثَنَاعَبدُ الرحمنِ بنُ غَنْمٍ الأَشْعَرِیُّ، قَالَ: حَدثنی أبو عامرٍ۔أو أبو مالِكٍ۔

الأشعريُّ، وَاللهِ مَا كَذَبَنِي، سَمِعَ النبيَّ ﷺ يقولُ: لَيَكُونَنَّ مِن أُمَّتِي أقوامٌ يَستَحِلُّونَ الْحِرَ وَالحَرِيرَ، وَالخَمرَ والمَعَازِف، ولَيَنْزِلَنَّ أقوامٌ إلى جَنْبِ عَلَمٍ، يَرُوحُ عَلَيهِمْ بِسَارِحَةٍ لَهُم، يَأتِيهِم يَعنِي الْفَقِيرَ لِحاجَةٍ، فيقولوا: ارْجِعْ إلَينا غداً، فَيُبَيِّتُهُمُ اللّٰهُ، وَيَضَعُ العَلَمَ، وَيَمْسَخُ آخرِيْنَ قِرَدَةً وَخَنَازِيْرَ إلى يومِ القِيَامَةِ۔(ح: ۵۵۹۰) ہشام بن عبد الملک کہتے ہیں ہمیں صدقہ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر نے حدیث بیان کی، ہمیں عطیہ بن قیس الکلابی نے حدیث بیان کی، وہ کہتے ہیں ہمیں عبدالرحمٰن بن غنم نے حدیث بیان کی وہ کہتے ہیں ہمیں ابو عامر یا ابو مالک اشعری نے حدیث بیان کی۔ واللہ! انہوں نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا، انہوں نے رسول اکرم ﷺ سے سنا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت میں کچھ لوگ ایسے ہوں جو قتل وریشم کو حلال سمجھیں گے۔ اور شراب وموسیقی کو بھی۔ اور کچھ لوگ ایک پہاڑ کے دامن میں اتریں گے۔ ان کے پاس یعنی ایک فقیر اپنی ضرورت کے لئے آئے گا وہ اس سے کہیں گے: تم کل ہمارے پاس آنا۔ اللہ تعالیٰ انہیں راتوں رات ہلاک کردے گا۔ پہاڑ بیٹھ جائے گا اور دوسرے قیامت تک کے لئے بندروں اور خنزیر کی صورت میں مسخ کردیے جائیں گے۔

اس روایت میں ہشام بن عمار، امام بخاری کے شیوخ میں سے ہیں۔ جن سے وہ خود ملے اور احادیث سنیں۔ اس لئے یہ تعلیق متصل ہے نہ کہ منقطع۔ واللہ اعلم۔

ایک مشترک مثال: جس حدیث کی سند متصل نہ ہو اس کی چار اقسام: منقطع، مرسل، معضل اور معلق کی ایک مشترک مثال:

حَدَّثَنَا الْحُمَيدِيُّ عَبدُ اللهِ بْنُ الزُبيرِ، قَالَ حَدَّثنا سُفيانُ، قَالَ: حَدَّثَنا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الأنصاريُّ قَالَ أَخبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ إبْرَاهِيْمَ التَّيْمِيُّ أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ أبي وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ يَقولُ سَمِعتُ عُمَرَ بنَ الخَطاب رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ قَال: سَمِعتُ رسولَ اللّٰهِ ﷺ يقُول: إنَّما الأعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ... الخ۔

......اس حدیث کی سند سے اگر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو حذف کردیا جائے تو ایسی سند کو مرسل کہیں گے۔

......اور اگر حمیدی رحمہ اللہ کا نام سند میں نہ ہو تو اسے معلق۔

......اسی طرح جب اسی سند میں سفیان اور یحییٰ بن سعید الانصاری رحمہما اللہ کا نام محو ہو تو وہ معضل کہلائے گی۔

......اور اگر صرف سفیان رحمہ اللہ کا نام حذف ہو یا ان کے ساتھ تیمی رحمہ اللہ کا بھی تو یہ منقطع ہوگی۔

۲۔ سقط خفی اور اس کی دو قسمیں

ا۔ مدلس: اس مصدر کا مادہ د ل س ہے۔ دَلَس لغت میں: ایسی ظلمت کو کہتے ہیں جو روشنی کے ساتھ ملی جلی ہو یعنی وہ تاریک ہو اور نہ ہی روشن۔ یا کسی چیز کو خوبصورت بنا کر پیش کرنا لیکن وہ نکلے اس کے برعکس۔ یا چیز کا عیب چھپا کر اسے پیش کرنا۔ کو کہتے ہیں۔ تدلیس نام اس لئے ہے کہ خفا (چھپانے) کے مفہوم میں یہ دونوں (انقطاع خفی اور تدلیس) مشترک ہیں۔ مزید یہ کہ محتمل لفظ سے اپنے سماع حدیث کو بھی وہ موہوم بنالیتا ہے۔

اصطلاحاً: علماء حدیث نے تدلیس کی تعریف یہ کی ہے:

سِيَاقُ الْحَدِيثِ بِسَنَدٍ يُوهِمُ أَنَّهُ أَعْلَى مِمَّا كَانَ عَلَيْهِ فِي الْوَاقِعِ۔ حدیث کو ایک ایسی سند کے ساتھ پیش کرنا کہ یہی سند وہم ڈال دے کہ بڑی شان کی حدیث ہے جیسے واقع میں یہ نظر آرہی ہے۔

یعنی راوی، حدیث کی سند میں کسی عیب کو چھپا دیتا ہے ظاہر نہیں کرتا۔ ایک ماہر حدیث ہی اس عیب کو نکال باہر کرتا ہے۔ جس کی وجہ اس کا محتمل لفظ ہوتا ہے جس کی بنا پر ابہام ہوتا ہے۔ مثلاً: قَالَ فُلَانٌ: فلاں نے یہ کہا۔ سننے والے کے لئے اب قَالَ کے لفظ میں احتمال ہے کہ یہ اس نے فلاں سے سنا بھی ہے یا نہیں۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ یہ معلوم شدہ بات ہے کہ ہم انہیں نہیں ملے۔ اور جسے ہم آج ملے اس کے بارے میں ہم کہتے ہیں: فلاں نے یہ کہا۔ اس محتمل لفظ میں یہ چیز نہیں۔

تدلیس کیوں کی جاتی ہے؟ ایسا محتمل لفظ وہ صرف اس لئے کہتا ہے تا کہ سامع باور کرلے کہ راوی نے یہ روایت شاید اپنے شیخ سے سنی ہے اور اسے مل چکا ہے۔ مگر وہ اسے ملا نہیں ہوتا۔ اس لئے سند کو سن کر یا دیکھ کر ماہر حدیث کو یہ شک ہوتا ہے کہ سند متصل ہے مگر وہ قَالَ یا عَنْ کیوں کہہ رہا ہے وہ صریح لفظ کیوں نہیں کہتا۔ ماہر حدیث تحقیق کے بعد اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ راوی نے یہ حرکت اس لئے کی تا کہ صریح الفاظ سے کہیں اسے جھوٹا نہ قرار

دیا جائے۔ اس وجہ سے مدلس کبھی حدثنی نہیں کہتا بلکہ محتمل لفظ استعمال کرتا ہے۔ ورنہ وہ کاذب کہلائے گا اور کذب راوی میں ایک بہت بری خصلت وعلت ہے۔

ایسی حرکت کے پیچھے یہ بھی فکر لاحق ہوتی ہے کہ کہیں میں شیخ کا نام لے کر اپنے آپ کو بدعتی شیخ کا شاگرد نہ باور کرادوں۔ یا پھر سلطان وقت اور دیگر علماء حق کا اسے خوف لاحق ہوتا ہے۔ اور سزا سے بچنے کے لئے یہ حرکت کرتا ہے۔ وغیرہ۔ غرض تدلیس کی متعدد وجوہات ہوسکتی ہیں اس لئے محدثین اس کے مخفی پہلو کو جانچنے کے لئے جب ٹوہ لگاتے ہیں تو پھر راوی کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں کہ یہ مدلس راوی کس قسم کا ہے؟ اور آیا اس کی حدیث قبول کی جائے یا رد کردی جائے۔

تدلیس کے الفاظ اور انداز: جس روایت میں یہ محتمل لفظ: قَال، عَن ، أنَّ، وغیرہ استعمال ہوں۔ امام اعمشؒ کہتے ہیں میں نے اپنے شیخ ابراہیمؒ سے کہا: جب آپ مجھے عن عبدِ اللّٰہِ کہہ کر حدیث بیان کریں تو مجھے پوری سند بیان کیا کیجئے۔ انہوں نے کہا: جب میں قال عبدُ اللّٰہِ کہوں تو اس کا مطلب ہے میں نے دیگر صحابہ سے بھی یہ حدیث سنی ہے اور جب میں حَدَّثَنِی فلان کہوں تو اس کا مطلب وہی ہے کہ مجھے فلان نے حدیث بیان کی ہے۔ (سیر اعلام ۴/۵۲۲)

امام احمدؒ فرماتے ہیں: جب ابن جریج یوں کہیں: قَال فَلانٌ وَقَال فُلانٌ یا اُخبِرْتُ تو پھر مناکیر ہی روایت کرتے ہیں اور جب وہ أخبَرَنِی یا سَمِعْتُ کہیں تو پھر تجھے کافی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے جب وہ قال کہیں تو ان سے بچو اور جب سَمِعْتُ یا سَألْتُ کہیں تو پھر وہ ایسی روایت لے آتے ہیں جس سے دل میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ وہ خود علم کا ایک بہت بڑا ظرف تھے۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں: ہشیم بن بشیر نے یزید بن ابی زیاد سے کچھ نہیں سنا۔ اور نہ ہی عاصم بن کلیب سے۔ نہ الحسن بن عبداللہ سے اور ابن ابی خلدۃ، سیار، اور علی بن زید سے اور اسی طرح انہوں نے چند نام اور بھی لئے۔ انہوں نے کہا: مگر ان سب سے ہشیم نے حدیث روایت کی ہے۔ امام ذہبیؒ فرماتے ہیں: وہ عَنْ سے روایت حدیث کرنا جائز سمجھتے۔ جبکہ ابوالحسن القطان فرماتے ہیں: ہشیم تدلیس میں بڑی محتاط سی روش اختیار کرتے ہیں۔

عبداللہ بن میسرۃ ایک راوی ہیں۔ان کی چار کنیتیں ہیں۔ ہشیم ان سے واقف تھے۔اس لئے وہ ان سے روایت کرتے وقت کبھی ابولیلی، یا ابواسحق،، ابوجریر یا ابوعبدالجلیل سے تدلیس کرتے۔

امام عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں: حجاج بن ارطاۃ تدلیس کیا کرتے۔ہمیں جب عمرو بن شعیب کی حدیث بیان کرتے تو محمد بن عبیداللہ عرزمی سے کرتے اور عرزمی متروک راوی ہیں۔ابن خیثمہ کہتے ہیں: میں نے امام ابن معین سے سنا: حجاج بن ارطاۃ صدوق ہیں مگر قوی نہیں۔ وہ محمد العرزمی سے تدلیس عن عمرو بن شعیب کہہ کر کیا کرتے۔یعنی محمد کا نام سند سے گرا دیتے۔

صحابہ میں تدلیس: صحابہ کرام بھی قال یا عن سے روایت کرتے ہیں مگر یہ تدلیس نہیں اور نہ ہی معیوب بات ہے کیونکہ ان کی روایت اپنے اس ساتھی سے ہوتی ہے جو ان سے بڑا ہے۔اور صحابہ سب کے سب عادل ہیں۔

تدلیس ومدلس کی صفات: خلف البزار کہتے ہیں: اَلْمُدَلِّسُ مُتَشَبِّعٌ بِمَا لَمْ يُعْطَ۔مدلس جس چیز سے محروم ہوتا ہے اس کا بھوکا ہوتا ہے۔امام ذہبیؒ فرماتے ہیں: مدلس اس آیت کا مصداق ہوتا ہے: ﴿ويحبون أن يحمدوا بما لم يفعلوا﴾ اس میں دھوکہ (غش) جیسی بیماری ہوتی ہے۔وہ امت کی خیرخواہی نہیں چاہتا۔بطور خاص جب وہ ایک واہی خبر میں تدلیس کرے یہ بہت ہی بڑا دھوکہ ہے اس لئے کہ وہ یہ باور کراتا ہے کہ میں صحیح بات کر رہا ہوں۔تدلیس کی باقی اقسام چھوڑ کر یہ صورت تو بہر حال حرام ہے۔عبدالوارثؒ بن سعید نے کیا خوب کہا ہے: اَلتَّدْلِيسُ ذُلٌّ: تدلیس ذلت ہے۔(معرفۃ از امام حاکم:۱۶۴)

......امام ابنؒ المبارک کی مجلس میں تدلیس کا ذکر چھڑا تو بڑا سخت جملہ انہوں نے کہا پھر یہ شعر پڑھا:

دَلَّسَ لِلنَّاسِ أَحَادِيثَهُ وَاللّٰهُ لَا يَقْبَلُ تَدْلِيساً

اس نے لوگوں کو احادیث رسول تدلیس کرکے بیان کیں یہ تو ایسا عمل ہے جو اللہ بھی قبول نہیں کرتا

......یزیدؒ بن زریع نے تدلیس کے سوال پر یہ جواب دیا: اَلتَّدْلِيسُ كِذْبٌ۔تدلیس سراسر جھوٹ ہے۔

......جریرؒ بن حازم نے تدلیس کی یوں مذمت کی اور اسے معیوب قرار دیتے ہوئے کہا: يُرِى أَنَّه سَمِعَ مَا لَمْ

يَسْمَعْ۔ جو حدیث اس نے نہیں سنی وہ اس کے سننے کا دکھاوا کرتا ہے۔ (التذکرۃ ۱/۲۰۰)

علماء حدیث کی تدلیس سے نفرت: امام شعبہ فرمایا کرتے:

لَأَنْ أَخِرَّ مِنَ السَّمَاءِ أَوْ مِنْ فَوقِ هٰذَا الْقَصْرِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَقُولَ: قَالَ الْحَكَمُ، لِشَيْءٍ لَمْ أَسْمَعْهُ مِنهُ۔ میں آسمان سے گر جاؤں یا اس محل کی چھت پر سے نیچے آ پڑوں، یہ مجھے زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اس کے کہ میں کہوں: حکم نے کہا۔ اور یہ دعوی ایسی شئ کے لئے ہو جو میں نے اس سے سنا ہی نہیں۔

یہ صحیح معنوں میں تورع وخدا خوفی ہے۔ امام اللیثؒ کہتے ہیں: میں مکہ مکرمہ آیا اور ابو الزبیر کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھے دو کتابیں دیں جو میں لے کر چلا گیا۔ پھر میں نے جی میں کہا: کیوں نہ میں دوبارہ ان کے پاس جاؤں اور ان سے پوچھوں کہ کیا یہ سب احادیث آپ نے جابرؓ بن عبد اللہؓ سے سنی ہیں؟ چنانچہ میں ان کے پاس آیا۔ مجھے کہنے لگے: اس میں سے کچھ تو ایسی احادیث ہیں جو میں نے خود ان سے سنی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو مجھے بیان کی گئی ہیں۔ میں نے عرض کی: مجھے وہ احادیث بتایئے جو آپ نے خود سنیں۔ اس طرح انہوں نے مجھے وہ احادیث یاد کرائیں جو اس وقت میرے پاس ہیں۔ وہ تدلیس کو قطعاً جائز نہ سمجھتے۔ (التاریخ الاسلامی از امام ذہبیؒ ۱۱/۳۱۲)

امام ابنؒ عیینہ فرمایا کرتے:

لَا تَسْمَعُوا مِنْ بَقِيَّةَ مَا كَانَ مِنْ سُنَّةٍ، وَاسْمَعُوا مِنهُ مَا كَانَ مِنْ ثَوَابٍ وَغَيرِهِ۔ بقیہ سے کوئی ایسی حدیث مت سنو جس کا تعلق سنت یا احکام نبوی سے ہو ہاں اس سے وہ روایات سن لو جن کا تعلق ثواب وغیرہ سے ہو۔

امام ذہبیؒ فرماتے ہیں:

اسی لئے امت احادیث احکام کو لینے میں بڑی تشدد واقع ہوئی ہے۔ بہت ہی کم احادیث میں نرمی نظر آتی ہے۔ علماء نے پھر بھی یہ اجازت نہیں دی کہ فضائل ورقائق میں جو چاہیں لوگ بیان کرتے رہیں۔ ان فضائل میں محدثین صرف ان احادیث کو لیتے ہیں جن کی اسناد میں ضعف ہو، نہ کہ وہ جن کی اسانید میں متہم راوی ہوں کیونکہ موضوع اور انتہائی ضعیف احادیث کو محدثین خاطر میں نہیں لاتے بلکہ دوسروں کو ان سے بچانا فرض سمجھتے ہیں۔ ان کی صحت وثقاہت کو خوب

چھانتے ہیں۔اور جو بھی تدلیس کا مرتکب ہوا اس نے اس کی وضاحت پر پردہ ڈالا ہو تو وہ سنت رسول پر بڑی زیادتی ڈھاتا ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول کا خائن بنتا ہے خواہ وہ اس سے ناواقف ہی کیوں نہ ہو۔ جہالت کی بنا پر گو وہ معذور ہوسکتا ہے مگر یہ آیت کب قابل عمل ہوگی: ﴿فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون﴾ اگر تم علم نہیں رکھتے تو اہل علم سے پوچھ لیا کرو۔ (سیر اعلام النبلاء ۸/۵۲۰)

امام ابنؒ الجوزی فرماتے ہیں:

مَنْ دَلَّسَ كَذَّاباً، فَالإِثْمُ لَهُ لَازِمٌ، لأَنَّهُ آثَرَ أَنْ يُؤْخَذَ فِي الشَّرِيْعَةِ بِقَوْلٍ بَاطِلٍ۔ جو کسی کذاب کو مدلس قرار دیتا ہے وہ لازماً گناہ گار ہو جاتا ہے کیونکہ اس نے شریعت کو لینے میں اس بات کو ترجیح دی جو باطل تھی۔ (المیزان ۳/۵۶۳)

نوٹ: ثقہ غیر مدلس جب حدیث بیان کرے تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر روایت میں حَدَّثَنَا کا لفظ ہی وہ بولے۔ بلکہ حَدَّثَنَا، عَنْ، قَالَ وغیرہ کہہ سکتا ہے۔

بعض ثقہ راویوں پر تدلیس کا الزام اور اصول: کتب اصول میں ثقہ راوی کو مدلس کہنے کے لئے جو مثالیں دی گئی ہیں وہ ناقابل تشفی ہیں اور نہ ہی وہ صحیح معنوں میں تدلیس کے مفہوم کو اجاگر کرتی ہیں۔ بظاہر تدلیس نام بہت برا ہے مگر بعض ثقہ محدثین کے اس عمل کو تدلیس کا نام دینا اور ہی برا ہے۔ جب کہ وہ ایک تکنیکی عمل تھا جو انہیں طلبہ شناسی میں کام آیا۔ وجوہات یہ تھیں:

۱۔ استاذ اپنے طلبہ کی ذہنی استعداد معلوم کرنے کے لئے بطور امتحان ایسا کرتے۔ جیسے امام بخاریؒ کے حفظ کا امتحان لیتے وقت دس طلبہ نے احادیث کی سند کو آگے پیچھے کر دیا تھا۔ اسی طرح ایک ثقہ محدث بھی اپنے شاگردوں کو پرکھنے کے لئے کہ وہ رواۃ حدیث یا تحمل حدیث کے باوقار انداز سے واقف ہیں یا لاپروا؟ وہ ایسا کر لیتے۔ جسے کسی بھی صورت میں تدلیس نہیں کہا جا سکتا۔ نیز یہ اصول بھی بڑا نامناسب ہے کہ ثقہ راوی اگر تدلیس کرے تو وہ قبول اور اگر غیر ثقہ کرے تو مردود۔ تدلیس تو بہر حال تدلیس ہے۔

۲۔ ثقہ محدث بعض اوقات سند کا تکرار نہیں چاہتے تھے بلکہ مختصر سند بیان کر دیتے۔ ایک شاگرد جس کا مقام

بہر حال استاذ سے کم ہے وہ پس منظر بھی بیان کر دے تو بعد والوں کے لئے یہ مستنبط کرنا کہ یہ تدلیس ہے!! عجیب بات ہوگی۔اس مثال کو دیکھئے جسے امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث (۱۳۱) میں لکھا ہے:

أَنَّ جَمَاعَةً مِنْ أَصْحَابِ هُشَيْمٍ۔۔وَهُوَ مِنَ الْمَوْصُوفِينَ بِالتَّدْلِيسِ۔۔ اجْتَمَعُوا يَوماً على أَنْ لَا يَأْخُذُوا مِنْهُ التَّدْلِيسَ، فَفَطِنَ لِذَلِكَ، فَكَانَ يَقُولُ فِي كُلِّ حَدِيثٍ يَذْكُرُهُ: حَدَّثَنا حُصَيْنٌ وَمُغِيرَةُ، عَنْ إبراهيمَ۔ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ لَهُمْ: هَلْ دَلَّسْتُ لَكُمُ الْيَومَ؟ فَقَالُوا: لَا، قَالَ: لَمْ أَسْمَعْ مِنْ مُغِيرَةَ حَرْفاً مِمَّا ذَكَرْتُهُ، إِنَّمَا قُلْتُ: حَدَّثَنِي حُصَيْنٌ، وَمُغِيْرَةُ غَيْرُ مَسْمُوعٍ لِيْ!!! ہشیم تدلیس سے موصوف ہیں۔۔ان کے چند ساتھی ایک روز اتفاق کر بیٹھے کہ آئندہ ہشیم سے تدلیس والی حدیث بالکل نہیں لیں گے۔ ہشیم اس انداز کو بھانپ گئے۔ چنانچہ وہ جو حدیث بیان کرتے کہتے: حدثنا حصين ومغيرة عن إبراهيم۔ جب روایت حدیث سے فارغ ہوئے تو طلبہ سے دریافت کیا: کیا آج میں نے کوئی تدلیس کی؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ فرمانے لگے: جو کچھ میں نے تمہیں ذکر کیا ہے اس میں سے ایک حرف بھی میں نے مغیرہ سے نہیں سنا۔ میں نے تو کہا تھا: حَدَّثَنِيْ حُصَيْنٌ، وَمُغِيْرَةُ غَيْرُ مَسْمُوعٍ لِيْ۔ مجھے حصین نے حدیث بیان کی اور مغیرہ سے میں نے نہیں سنا۔

پہلے تو یہ بات قابل غور ہے کہ راوی کہہ رہا ہے: ہر حدیث کو ذکر کرتے وقت وہ کہتے: حَدَّثَنَا۔ مگر جب سوال کیا تو اس میں جمع کو واحد میں بدل دیا۔ پھر حصین کے بعد مغیرہ کا نام ذکر کیا اور پھر یہ کہہ دیا میں نے مغیرہ سے اس حدیث کا ایک حرف بھی نہیں سنا۔ (ہوسکتا ہے اس موقع پر انہوں نے اپنا سر نفی میں ہلایا ہو)۔ بلکہ میں نے کہا تھا: حَدَّثَنِي حُصَينٌ۔ باقی مغیرہ سے میں نے یہ حدیث نہیں سنی۔ یوں تدلیس کی۔ جسے تدلیس عطف کہتے ہیں۔یعنی میں نے نام تو ان کا ڈالا ہے مگر ان سے سنا نہیں ہاں ان سے یہ روایت کسی اور ذریعے سے بیان کی جاتی ہے۔

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ روایت میں ہشیم نے یہ جملہ کہا ہی نہیں۔ تسلیم بھی کر لیں کہ یہ جملہ انہوں نے کہا تو شاگرد کیسے تھے جو بول ہی نہ سکے کہ آپ نے یہ جملہ کہا ہی نہیں تو پھر تدلیس کیسی؟ یا پھر اس کی ایک توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ میں نے تو تمہیں شروع سے ہی بتایا ہوا ہے کہ مغیرہ سے میں نے حدیث سنی ہی نہیں۔ اس طرح یہ طلبہ کا امتحان ہوا۔ یا تو ہشیم گئے گذرے ہیں یا پھر یہ راوی۔ تدلیس کے لئے ایسی مثالیں بالکل غیر واضح ہیں اور غیر مناسب بھی۔

۳۔ یہی حال سفیان ثوری رحمہ اللہ کا تھا۔ جو طلبہ کا اکثر و بیشتر امتحان لیا کرتے۔

۴۔ تدلیس کی مثال میں ایک ہی حدیث کی سند کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ جب کہ اصول یہ ہے کہ اس راوی کی ایسی تمام احادیث کو جمع کیا جائے اور پھر ڈانڈے ملا کر فیصلہ کیا جائے کہ غلطی کہاں ہے۔ تدلیس کا الزام دینے کے معاملے میں یہ خیال نہیں رکھا گیا۔ وہ اس طرح کہ دوسری سند میں یہی راوی ضعیف راوی سے سماعت کی صراحت کرتا ہے۔ یا سوال کرنے پر وہ خود واضح کر دیتا ہے۔ تو کیا تدلیس اور سماع کی صراحت دونوں برابر ہیں؟ پھر راوی کو مدلس جیسا لقب دینے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

۴۔ بعض اوقات محدثین ایک ہی راوی کے مختلف ناموں کو استعمال کرتے ہیں۔ تا کہ یہ جان سکیں کہ ایک ہی راوی کے ان مختلف ناموں سے ہمارے طلبہ آگاہ بھی ہیں؟ اسے بھی تدلیس الاسناد یا تدلیس الشیوخ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ جب کہ یہ سب کچھ بطور امتحان کے ہوتا تھا۔ جیسے خطیب بغدادیؒ اپنی تاریخ بغداد میں ایک ہی شخص کے بیس سے زائد نام مختلف مقامات پر ذکر کرتے ہیں۔ اسے تدلیس کہنا معلوم نہیں کہاں تک درست ہے؟

تدلیس کی اقسام: تدلیس کی کتنی اقسام ہیں؟ امام حاکم رحمہ اللہ نے المَعْرِفَة (۱۰۳:) میں چھ قسمیں لکھتے ہیں۔ شیخ سراج البلقینی مَحَاسِنُ الاِصْطِلاحِ (۱۶۸) میں ان اقسام کو پہلی دو قسموں کے تحت ہی رکھتے ہیں۔ مگر امام ابنؒ الصلاح، النوویؒ، ابن کثیرؒ، الطیبیؒ، السخاویؒ وغیرہ نے تدلیس کی دو اقسام تَدلِيسُ الإسْنادِ اور تدليسُ الشُّيُوخِ لکھی ہیں۔ امام عراقیؒ نے اپنی الفیہ (۱۷۹/۱) میں ایک اور نوع تدليسُ التَّسْوِيَة کا اضافہ کرتے ہوئے کہا ہے: حافظ ابوالحسن بن القطان الفاسیؒ نے یہ اصطلاح متعارف کرائی ہے۔ تدلیس کی ان اقسام میں ہر ایک کی مختصر تعریف دیکھئے:

ا۔ تدلیس الإسناد:

هُوَ: أَنْ يَرْوِيَ الرَّاوِيْ عَمَّنْ لَقِيَهُ مَالَمْ يَسْمَعْهُ مِنْ قَوْلِهِ أَوْ يَرُدُّهُ مِنْ فِعْلِهِ بِلَفْظٍ يُوهِمُ أَنَّهُ سَمِعَهُ أَو رَآهُ مِثْلَ: قَالَ فُلَانٌ أَوْ عَنْ فُلَانٍ أَو فَعَلَ فُلَانٌ وَنَحْوِ ذَلِكَ۔ راوی اپنے اس شیخ سے ملا ہو اور اس سے وہ روایت کرے جسے اس نے خود نہ سنا ہو۔ ایسے لفظ کا استعمال کرے جس سے یہ وہم ہو کہ اس

نے خود اپنے شیخ سے سنا ہے یا اسے خود دیکھا ہے۔ جیسے قال فلان و عن فلان یا فَعَلَ فُلان۔ وغیرہ۔

مثال: امام ترمذیؒ نے اپنی سنن (۱۵۴) میں یہ سند:

مُحمدُ بْنُ إسحٰقَ بْنِ يَسارٍ، عَن عاصمِ بنِ عُمرَ بْنِ قَتَادَةَ، عَن مَحمودِ بْنِ لَبِيدٍ، عَن رَافِعِ بْنِ خَدِيجٍ قَالَ: سَمِعتُ رسولَ اللّٰهِ ﷺ يقولُ: أَسْفِرُوا بِالْفَجْرِ فَإِنَّهُ أَعْظَمُ لِلْأَجْرِ۔

اس حدیث کی سند میں محمد بن اسحٰق بن یسار کو محدثین نے صدوق کہا ہے۔ مگر اس اسناد میں انہوں نے تدلیس یوں کی ہے کہ ان کے اصل شیخ محمد بن عجلان جن سے حدیث سنی تھی ان کا نام ہی ذکر نہیں کیا۔ مگر جن معاصرین سے ملاقات ہی نہیں ہوئی یا جن سے یہ حدیث ہی نہیں سنی ان کا نام انہوں نے لے لیا ہے۔ اس تدلیس کا علم محدثین کو یوں ہوا کہ امام احمد نے مسند (۴۶۵/۳) میں ایک اور سند کے ساتھ یہی حدیث یوں روایت کی ہے:

حَدَّثَنا يَزِيدُ، قَالَ: أَخبَرَنا محمدُ بنُ إسحٰقَ ، قالَ: أَنْبَأنا ابْنُ عَجْلانَ۔۔۔

پھر انہوں نے یہی متن ذکر کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ابن اسحٰق نے یہ حدیث ابن عجلان سے سنی تھی۔ اب یہ دوسری سند سماع کی صراحت کے ساتھ موجود ہے تو پھر تدلیس کیسی؟

نوٹ: عموماً کتب میں تدلیس اسناد کی مثال یہ دی گئی ہے: امام حاکمؒ اپنی سند سے علی بن خشرم سے روایت کرتے ہیں کہ:

قَالَ لَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنِ الزُّهْرِيِّ۔ فَقِيلَ لَهُ : سَمِعْتَهُ مِنَ الزُّهْرِيِّ؟ قَالَ: لَا، وَلَا مِمَّنْ سَمِعَهُ مِنَ الزُّهْرِيِّ، حَدَّثَنِي عَبدُ الرَّزَّاقِ عَن مَعْمَرٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ۔ ہمیں ابن عیینہ نے کہا: زہری سے روایت ہے۔ ان سے کہا گیا: کیا آپ نے زہری سے حدیث سنی ہے؟ فرمانے لگے: نہیں اور نہ ہی اس سے جس نے اسے زہری سے سنا ہے۔ مجھے تو یہ حدیث بیان کی عبدالرزاق نے انہوں نے معمر سے اور انہوں نے زہری سے۔

اس مثال میں ابن عیینہؒ نے اپنے اور امام زہریؒ کے درمیان دو راویوں کو ساقط کر دیا تھا جو ثقہ تھے، اس لئے یہ تدلیس ہے۔ جب کہ کچھ علماء کے نزدیک یہ تدلیس نہیں بلکہ تَشْحِيذُ الْأَذْهَانِ ہے یعنی طلبہ کی ذہنی بیداری کا امتحان ہے۔ یا اس حدیث کا اختصار ہے جو پہلے انہوں نے پوری سند کے ساتھ بیان کر دی اور دوبارہ اس سند کو لوٹانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سوال پر وہ معاملہ بھی واضح کر رہے ہیں تو آخر کس لئے؟ پھر تدلیس کا ہے کی؟

۲۔ تدلیس الشیوخ:

وَهُوَ أَنْ يُسَمِّيَ الرَّاوِيْ شَيْخَهُ أَوْ يُكَنِّيَهِ أَوْ يَنْسِبُهُ أَوْ يَصِفُهُ بِمَا لاَ يُعْرَفُ فِيْهِمْ أَنَّهُ غَيْرُهُ، إِمَّا لِكَوْنِهِ أَصْغَرُ مِنهُ فَلاَ يُحِبُّ أَنْ يُظْهِرَ رِوَايَتَهُ عَمَّنْ دُوْنَهُ وَإِمَّا لِيَظُنَّ النَّاسُ كَثْرَةَ شُيُوخِهِ وإِمَّا لِغَيْرِهِمَا مِنَ الْمَقَاصِدِ۔ اسے کہتے ہیں جس میں راوی حدیث روایت کرتے وقت اپنے شیخ کا ایسا نام، کنیت، نسبت یا صفت لے جس میں وہ مشہور نہ ہو۔ جو سامع کو وہم میں ڈال دے کہ یہ کوئی اور راوی یا شیخ ہے۔ وہ یہ اس لئے کرتا ہے کہ یا تو اس کا شیخ اس سے عمر میں چھوٹا ہے اور اسے یہ پسند نہیں کہ اپنی روایت اس سے بیان کرے جو عمر میں اس سے کم ہو۔ یا وہ اس لئے کرتا ہے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ اس کے شیوخ بکثرت ہیں یا ان کے علاوہ اور مقاصد بھی اس کے پیش نظر ہو سکتے ہیں۔

مثال: امام ابوداود نے سنن (۲۱۹۶) میں یہ سند:

ابْنُ جُرَيْجٍ أَخْبَرَنِي بَعْضُ بَنِي أَبِي رَافِعٍ مَوْلَى النَّبِيِّ ﷺ، عَنْ عِكْرِمَةَ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: طَلَّقَ عَبْدُ يَزِيْدَ۔۔۔أَبُورُكَانَةَ وَإِخْوَتُهُ۔۔۔أُمَّ رُكَانَةَ وَنَكَحَ امْرَأَةً مِنْ مُزَيْنَةَ۔۔۔ وَذَكَرَ حَدِيثاً فِي طَلَاقِ الثَّلَاثِ جُمْلَةً وَاحِدَةً۔

اس حدیث کے راوی ابن جریج کا نام عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج ہے جو ایک ثقہ راوی ہیں مگر تدلیس کے ساتھ بھی موصوف ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے شیخ کا نام بھی صراحتاً لیتے ہیں مگر ایک آدھ بار انہوں نے اپنے شیخ کے نام پر پردہ ڈالنے کے لئے ایسا کیا اور یوں کہا: أَخْبَرَنِي بَعْضُ بَنِي أَبِي رَافِعٍ۔ علماء کے ہاں اس راوی کی تعیین میں اختلاف ہے۔

اس شیخ کو امام حاکمؒ مستدرک (۲/۴۹۱) کی ایک روایت میں یوں ذکر کرتے ہیں: عَنْ مُحمدِ بْنِ عُبَيدِ اللهِ بنِ أَبِي رَافِعٍ، عَنْ عِكْرِمَةَ، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔۔۔ جب یہ سند موجود ہے اور وہ بھی صراحت کے ساتھ۔ تو پھر تدلیس کیسی؟

یہ محمد بن عبیداللہ متروک راوی ہیں۔ امام بخاریؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: مُنْكَرُ الْحَدِيثِ۔ ابن معینؒ کہتے ہیں: لَيْسَ بِشَيْءٍ۔ اور ابوحاتمؒ کہتے ہیں: مُنْكَرُ الْحَدِيثِ جِدًّا ذَاهِبٌ۔

نوٹ: رکانہؓ کی یہ حدیث امام احمد بن حنبل (۱/۲۶۵) بھی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں جسے امام ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں صحیح قرار دیا ہے۔ کہ رکانہؓ نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دی تھیں لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک قرار دے کر رجوع کا اختیار دے دیا تھا چنانچہ رکانہؓ نے رجوع کر لیا تھا۔

☆...... رواۃ کے نام یا کنی والقاب متشابہ ہوں تو راوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شیخ یا راوی کا مکمل نام ضرور واضح کرے ورنہ یہ تدلیس ہوگی۔ فقیہ مدینہ عبد اللہ بن نافع الصائغ کی بڑی عمدہ تقریظ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے ترتیب المدارک کے شروع میں لکھی اور کہا: سحنون نے محمد بن رزین کو کچھ لکھ بھیجا۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ سحنون، عبد اللہ بن نافع سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا: کیا تم نے عبد اللہ بن نافع سے سنا ہے؟ سحنون نے کہا: اللہ تعالی آپ کی اصلاح کرے میں نے جس نافع سے سنا ہے وہ الزبیری ہیں نہ کہ الصائغ۔ پھر وہ کہنے لگے: تم نے پھر تدلیس کیوں کی؟ سحنون نے کہا: مَاذَا يَخْرُجُ بَعْدِيْ مِنَ الْعَقَارِبِ؟ میرے بعد بچھوؤں سے پھر کیا نکلے گا؟ مراد یہ کہ میں نے تو تدلیس نہیں کی اگر کوئی الزام دیتا ہے تو میں اس الزام کا کیا جواب دے سکتا ہوں؟ اگرچہ دونوں ثقہ محدثین ہیں مگر سحنون نے ان دونوں کو واضح کرنا ضروری سمجھا۔ تاکہ ان دونوں کی روایت آپس میں خلط ملط نہ ہو۔ کیونکہ الصائغ قدیم بزرگ تھے اور امام مالکؒ کے اقدم واثبت شاگردوں میں سے تھے اور انہیں امام مالکؒ کی طویل صحبت حاصل تھی۔ یہ وہی ہیں جنہیں ابن کنانہ کے بعد امام مالکؒ نے اپنی مجلس کی جگہ دی۔ اور یہ وہی ہیں جن کا ذکر یحیی بن یحیی اور سحنون کرتے ہیں اور ان سے روایت بھی۔ مگر سحنون نے ان سے سماع نہیں کیا بلکہ اشہب سے انہوں نے سنا تھا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۰/۳۷۱)

تدلیس بلاد: یہ تدلیس کی ایک اور قسم ہے جس کی تعریف یہ ہے:

أَنْ يَقُولَ الْمُحَدِّثُ: حَدَّثَنَا البخاريُّ، وَيَقْصُدُ مَنْ يُبَخِّرُ النَّاسَ، أَوْ حَدَّثَنِي بِمَاوَرَاءَ النَّهْرِ، يُرِيدُ بِهِ نَهْرَ دَجْلَةَ، أَوْ يَقُولُ الْمِصْرِيُّ: حَدَّثَنِي بِالأَنْدَلُسِ، وَيُرِيْدُ بِهِ مَوضِعاً بِالقِرَافَةِ۔ جس کی یہ صورت ہے کہ راوی یوں کہے: حدثنی البخاری جس سے اس کی مراد وہ شخص ہو جو لوگوں کے لئے چقماق جلاتا ہے نہ کہ امام بخاری۔ یا حدثنی بماوراء النھر۔ مراد نہر دجلہ کے پار نہ کہ ماوراء النھر کا

علاقہ۔۔یا کوئی مصری یوں کہے: اس نے مجھے اندلس میں حدیث بیان کی۔اندلس سے اس کی مراد قرافہ کا علاقہ ہو۔

یہ تدلیس خطرناک بھی ہوسکتی ہے اور برائے امتحان بھی۔

تدلیس عطف:

وَهُوَ أَنْ يَقُولَ الْمُحدِّثُ: حَدَّثَنِي فُلَانٌ وَفُلَانٌ، وَيَكُونُ سَمِعَهُ مِنَ الْأَوَّلِ وَلَمْ يَسْمَعْهُ مِنَ الثَّانِي۔ راوی حدیث روایت کرتے وقت یوں کہے: حَدَّثَنِي فُلَانٌ وَفُلَانٌ جب کہ اس کا پہلے فلان سے تو سماع ثابت ہو اور دوسرے فلاں سے اس نے نہ سنا ہو۔

مثال: جسے امام حاکمؒ نے معرفۃ علوم الحدیث (۱۳۱) میں لکھا ہے۔اوپر ہشیم والی مثال دیکھیے۔

تدلیس سکوت: اس میں راوی کہتا ہے: حَدَّثَنا یا سَمِعْتُ اور پھر رک جاتا ہے اس کی نیت سند کو کاٹنے کی ہوتی ہے اس لئے وہ سکوت اختیار کرتا ہے پھر کہتا ہے: هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَائِشَةَ رضى الله عنها۔یعنی اپنا شیخ ہشام بن عروہ کو بناتا ہے جب کہ اس نے ان سے یہ حدیث سنی ہی نہیں۔دیکھئے الکامل از ابن عدی میں یہ مثال:

عَنْ عُمَرَ بْنِ عُبَيْدٍ الطَّنَافِسِيِّ، أَنَّهُ كَانَ يقولُ: حَدَّثَنا، ثُمَّ يَسْكُتُ يَنْوِي الْقَطْعَ، ثُم يقولُ: هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَن أبيهِ عَنْ عَائِشَةَ رضى اللَّهُ عَنْهَا۔عمر بن عبید طنافسی جب کہتے: حدثنا۔تو خاموش ہوجاتے۔مقصد سند میں Pause دینا ہوتا تاکہ وہ اسے توڑ سکیں۔اور پھر کہتے: ہشام بن عروۃ عن ابیہ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا۔

یہ انداز تدلیس بھی تسویہ سند والی بات ہے۔

تدلیس تسویۃ: جس کی صورت یہ ہے کہ راوی اپنے شیخ کا نام اس کے ضعف کی وجہ سے یا عمر میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے سند سے گرادیتا ہے اس طرح وہ اپنی حدیث کو شروع سے آخر تک برابر کرکے ثِقَةٌ عَنْ ثِقَةٍ کہہ کر ثابت

کر دیتا ہے۔ تدلیس کی یہ مذموم قسم ہے اور جو خیانت اور سند کے عیب کو چھپانے والی ہے۔ اس قسم کی تدلیس سے موصوف ولید بن مسلم اور بقیہ بن الولید تھے۔ ابن معینؒ نے ان کے بارے میں کہا تھا: أحادیثُ بَقِیَّةَ لَیْسَتْ نَقِیَّةً فَکُنْ مِنْها عَلَی تَقِیَّةٍ۔ (مزید تفصیل کے لئے ان چھ اقسام کو (الکفایة: ٥١٨، جامع التحصیل: ١١٤، شرح العراقی لألفیته ١/١٩٠) میں دیکھئے۔

نوٹ: تدلیس کی ان تمام اقسام میں جو واقعی تدلیس لگتی ہے اور جسے تدلیس قرار دینا چاہئے وہ یہی تدلیس ہے۔ باقی کا نام تدلیس رکھنا بظاہر تو درست لگتا ہے مگر مثالوں سے یہی واضح ہوتا ہے کہ انہیں تدلیس نہیں کہا جا سکتا۔

اصول:

ا۔ جو مدلس ہو اور بکثرت تدلیس کرتا ہو یعنی سَمِعْتُ کی بجائے عَنْعَنَة زیادہ کرتا ہو تو اس کی روایت رد کر دی جائے گی کیونکہ وہ سماع کی صراحت نہیں کر رہا۔ ورنہ سمعتُ یا حَدَّثَنِی جیسی صراحت سے اس کی روایت قبول کر لی جائے گی۔

۲۔ مدلس مقل اگر ثقہ سے عنعنہ کی تدلیس کرے تو اس کا عنعنہ سماع پر ہی محمول کیا جائے گا۔ ہاں اگر دیگر احادیث کے طرق یہ واضح کر دیں کہ اس نے اس حدیث میں تدلیس کی ہے تو پھر وہ روایت رد کر دی جائے گی۔

۳۔ ثقہ خواہ سماع کی صراحت کرے یا عنعنہ کرے اسے تدلیس نہیں کہیں گے۔ جیسے صحیحین میں صیغہ تدلیس کے ساتھ جو روایات آئی ہیں وہ ثقات سے ہیں۔ علماء نے انہیں قبول کیا ہے۔

مدلسین کے طبقات: تدلیس کرنا ضعیف راوی کا کام ہوتا ہے۔ ثقہ محض تشحیذ الأذہان کے لئے عنعنہ کرتا ہے ورنہ وہ مدلس نہیں ہوتا۔ ثقہ علماء حدیث حسن بصری، حمید الطّویل، الاعمش، محمد بن اسحٰق، عنعنہ کا استعمال کرتے جسے تدلیس کہا گیا۔ جن کے بارے میں اصول یہی ہے کہ ان کا عنعنہ، سماع پر محمول ہوتا ہے۔ مگر ضعیف جیسے الولید بن مسلم وغیرہ کا عنعنہ تدلیس ہوگا۔ اس لئے کثرت وقلت اور حفظ واتقان کی رو سے مدلسین کو علماء نے پانچ طبقات

میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ وہ محدثین جو تدلیس سے بالکل محفوظ ہیں۔ نادر ہی ان سے یہ کام ہوا ہو۔ جیسے امام یحیی بن سعید انصاری۔

۲۔ جنہوں نے تدلیس کی مگر ثقہ سے یا پھر اپنے طلبہ کی ذہنی استعداد اور بیدار مغزی کا امتحان لینے کے لئے۔ ان کی احادیث کو ان کی امامت کی وجہ سے صحیح تسلیم کیا گیا۔ جیسے سفیانؒ ثوری یا تدلیس ثقہ سے کرتے۔ جیسے سفیانؒ بن عیینہ۔

۳۔ اس طبقہ کی تدلیس پر علماء نے توقف کیا اور ان کے عنعنہ کو قبول نہیں کیا۔ ان کی اس روایت سے صرف احتجاج کیا جس میں انہوں نے صراحت کے ساتھ سماع کا ذکر کیا۔ ان میں سے کچھ کا عنعنہ وہاں بھی قبول کر لیا جہاں واقعی ان کی کوئی تدلیس ثابت نہیں ہو سکی۔ جیسے قتادۃ بن دعامۃ سدوسی اور ابو اسحق السبیعی۔

۴۔ اس طبقہ کے بارے میں اہل علم کا اتفاق ہے کہ غلبہ تدلیس یا بکثرت ضعفاء اور مجاہیل سے روایت کی بنا پر ان کی روایت نا قابل احتجاج ہوگی جب تک یہ حضرات صریح سماع ذکر نہ کریں۔ جیسے محمد بن اسحق، عبد الملک ابن جریج۔ یہ جب صیغہ عَنْ سے روایت کریں تو وہاں ضرور علت قادحہ ہوگی مگر جب حَدَّثَنِی کہیں تو وہ صحیح اور حجت ہوگی۔

۵۔ وہ رواۃ جن کے کچھ عیوب کی وجہ سے ان پر جرح ہوئی اور انہیں ضعیف قرار دیا گیا۔ تدلیس وجہ نہیں تھی۔ اس طبقہ کی احادیث ویسے ہی رد ہوں گی خواہ وہ صراحتاً سماع کا کہہ دیں جیسے ابو جناب کلبی اور ابو سعید بقال جیسے فضائلی۔ (تعریف اہل التقدیس لابن حجر: ۲۳)

مُعَنْعِن: علماء نے حَوقَلَۃ، حَیْعَلْ، یا سَبْحَلْ جیسی تعبیرات بنائی ہیں۔ یہ مصطلح بھی اسی طرز پر ہے۔ یہ وہ روایت ہوتی ہے جس میں راوی عَنْ فُلَانٍ عَنْ فُلَانٍ عَنْ فُلَانٍ جیسے الفاظ استعمال کرے۔ گویا یہ اصطلاح اسی کا

اختصار ہے۔ یہ لفظ اسناد کا حصہ ہے مگر اس کا مراد راوی ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر راوی اپنے شیخ سے ملا ہے اور اس سے سنا ہے خود بھی ثقہ ہے پھر وہ عن عن کا استعمال کرتا ہے تو اس کا یہ عن اتصال کے معنی میں ہی ہوگا ورنہ عدم اتصال ہی اس سے مراد ہوگا جسے وہ تدلیس نام دیتے ہیں۔ معنعن کی روایت کو تین شرطوں کے ساتھ علماء حدیث قبول کرتے ہیں: ا۔ محدث عادل ہو۔ ۲۔ محدث کی ملاقات اپنے شیخ سے ہو چکی ہو خواہ وہ مجلس میں ہوئی ہو یا براہ راست۔ ۳۔ راوی تدلیس سے اجتناب کرتا ہو۔

اسی بنا پر محدثین اس عن عن کو تدلیس نہیں کہتے جس میں اتصال ہو اور تدلیس سے راوی خود بچتا ہو۔ امام مسلم رحمہ اللہ کا کہنا ہے: جو لوگ معنعن روایت کو حجت تسلیم نہیں کرتے اور ملاقات کی شرط لگاتے ہیں خواہ ایک بار کی بھی ہو۔ غلط اور من گھڑت اصول ہے۔ اسلاف میں کسی نے ایسا نہیں کہا۔ الا یہ کہ اس روایت میں واضح دلیل یہ ہو کہ راوی اپنے شیخ سے نہیں ملا یا اس سے نہیں سنا۔ امام بخاریؒ، امام علیؒ بن المدینی وغیرہ نے معاصرین کے لئے ملاقات کی شرط اس لئے لگائی کہ انہیں ایسے شواہد مل گئے تھے کہ کچھ معاصرین نے اپنے شیوخ سے روایت کی مگر انہوں نے وہ احادیث ان سے نہیں سنی تھیں اور عن عن کا استعمال کیا۔ اس لئے ملاقات اور سماع کی شرط لگا دی تا کہ جو شیخ سے روایت کرے وہ عنعنہ کو سماع واتصال پر محمول کر کے ہی کرے۔ امام نوویؒ، خطیبؒ بغدادی امام ذہبیؒ اور دیگر نے تدلیس سے بچاؤ کی شرط امام بخاریؒ کو زیادہ مناسب اور قوی قرار دی ہے۔

مگر امام مسلمؒ کا نقطہ نظر بھی قوی ہے کہ ثقہ عادل غیر مدلس اگر اپنے اس معاصر شیخ سے روایت کرے خواہ اس کی ملاقات اس سے نہ ہوئی ہو تو اس کا عنعنہ سماع پر محمول کیا جائے۔ کیونکہ قبول نہ کرنے کی صورت میں احادیث کا خاصا ذخیرہ نظر انداز ہو جائے گا۔ اس لئے امام مسلم معنعن روایات لا کر ملاقات کے ثبوت کے لئے معاً بعد أخبرنا اور حدثنا سے تحمل حدیث ثابت کرتے ہیں جو ان کے نزدیک سماع پر محمول ہیں۔ مزید یہ کہ ہر ثقہ غیر مدلس راوی کے اپنے اس شیخ سے امکان لقاء کو ثابت کرنا بھی اتنا آسان نہیں جس سے وہ عنعنہ کے ساتھ روایت کر رہا ہے۔

مُؤَنَّن: جس روایت میں راوی أنّ فُلانًا قَالَ أنّ فُلانًا قَال جیسے الفاظ استعمال کرے۔ اس کے اصول مُعَنْعِن کے ہیں۔

۲۔مرسل خفی: میں راوی اپنے شیخ کا معاصر تو ہے لیکن کیا وہ اپنے شیخ سے مل چکا ہے؟ اس کے بارے میں سبھی لاعلم ہیں۔ اسے خفی اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی شیخ سے ملاقات کا علم مخفی رہتا ہے اور قاری اس کے صیغہ عن سے یہ سمجھتا ہے کہ حدیث متصل ہے اس لئے کہ یہ اس کا معاصر ہے مگر وہ غیر متصل ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ارسال خفی کہلاتی ہے۔

فرق مابین تدلیس وارسال خفی: ان دونوں میں بڑا باریک فرق ہے۔ امام ابن حجرؒ نے اس باریک فرق کو واضح کیا ہے کہ اگر راوی اپنے شیخ سے ملا ہو مگر اس سے وہ روایت کرے جو اس نے اس سے نہیں سنی یا محتمل لفظ استعمال کرے اسے تدلیس کہیں گے اور اگر معاصر ہے مگر ان کی ملاقات ثابت نہیں پھر وہ اس سے محتمل لفظ سے روایت کرے یہ ارسال خفی ہے۔ مثلاً: سلیمان بن مہران الاعمش کی سیدنا انس بن مالک سے روایت ہے انہوں نے صرف سیدنا انسؓ کو دیکھا تھا سنا نہیں تھا۔ امام علی بن المدینیؒ کہتے ہیں: اعمشؒ نے سیدنا انسؓ سے کوئی حدیث نہیں سنی بس انہیں دیکھا تھا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں۔ ہاں انہوں نے سیدنا انس کی احادیث یزید الرقاشی سے اور ابان بن عیاش سے بھی سنیں۔ اس لئے اعمش کی، سیدنا انس سے روایت مرسل خفی ہوگی نہ کہ تدلیس ہوگی۔ اگرچہ اعمشؒ جب اپنے شیوخ سے سنی ہوئی احادیث کو روایت کرتے تو اس وقت بھی تدلیس کیا کرتے۔ ایسی صورت میں انہیں تدلیس سے موصوف کیا گیا ہے۔ گو وہ یہ عمل بطور امتحان یا اختصار کرتے۔

اسی طرح حسن بصریؒ نے سیدنا عثمانؓ کو۔ جیسا کہ روایت کیا گیا ہے۔ دیکھا تھا اور ان کا کبوتر و کتوں کے قتل کے بارہ میں خطبہ بھی سنا تھا۔ مگر انہوں نے ان سے کوئی مسند حدیث نہیں سنی تھی۔ اس بناء پر ان کی سیدنا عثمانؓ سے روایت مرسل ہوگی۔

☆...... ابو حاتمؒ لکھتے ہیں: ابو قلابہ کی کوئی تدلیس معلوم نہیں ہوسکی۔ امام ذہبیؒ اس کا مفہوم یہ لکھتے ہیں: جب ابو قلابہ کوئی حدیث سیدنا عمر یا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مثلاً مرسل روایت کریں تو معلوم نہیں ہوتا کہ کس سے انہوں نے حدیث سنی ہے؟ بخلاف حسن بصری کی تدلیس کے کہ وہ ہر قسم کے افراد سے حدیث لے لیا کرتے پھر ان کا نام گرا دیتے۔ جیسے علی بن زید کا نام جو ان کا ہی شاگرد ہے۔ پہلی مثال ارسال خفی کی ہے اور دوسری تدلیس کی۔

☆...... رہے مخضرم (وہ جنہوں نے حیات رسول ہی میں زمانہ جاہلیت کو تو پایا۔ آپ ﷺ پر ایمان بھی لائے مگر آپ ﷺ سے مل نہ سکے) تابعین جیسے ابوعثمان نہدی، قیس بن ابی حازم جو نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ ان کی روایت مرسل کے زمرے میں آئے گی نہ کہ مرسل خفی یا تدلیس کے۔ کیونکہ محض معاصرت کی شرط تدلیس کے لئے کافی ہوتی تو پھر یہ سب مدلس ہوتے کیونکہ یہ بزرگ آپ ﷺ کے معاصر تو ہیں مگر ان کی ملاقات آپ ﷺ سے ثابت نہیں۔

☆......انقطاع کی اب تین اقسام ہوئیں:

ا۔ جس روایت میں انقطاع ظاہر و باہر ہو گیا۔ یہ راوی اپنے شیخ کا معاصر نہیں ہوتا۔

۲۔ جو اپنے شیخ کا معاصر تو تھا مگر اس سے ملاقات غیر معلوم سی ہے۔ مرسل خفی کہلائی۔

۳۔ معاصر راوی کی شیخ سے ملاقات بھی ہوئی۔ مگر روایت اس سے وہ کی جو شیخ سے سنی ہی نہیں۔ اسے تدلیس کہتے ہیں۔

مگر جو معاصر تھا اور اس نے اپنے شیخ سے احادیث سنیں۔ یہ متصل ہوگی۔

چونکہ یہ دونوں (مدلس اور مرسل خفی) اپنے شیخ سے عدم سماع میں باہم متشابہ ہیں اس لئے اکثر و بیشتر طالب علم ان کے درمیان فرق کو ملحوظ نہیں رکھ پاتے۔ یہ فرق جاننے کا فائدہ یہ ہے کہ:

قواعد: جو مدلس ہوگا اور عنعنہ بھی کرے تو اس کی روایت لامحالہ رد ہوگی خواہ وہ اپنے شیخ سے اپنی تمام روایات کا سماع ہی کیوں نہ ثابت کرے۔ طبقات مدلسین میں اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

......رہا وہ جو اپنے شیخ سے ان سنی احادیث روایت کرتا ہے یہ ارسال خفی ہے اس کا عنعنہ بھی رد کر دیا جائے گا جب تک کہ وہ اپنے اس شیخ سے سماع کو ثابت نہ کر دے خواہ ایک مرتبہ ہی اس نے کیوں نہ کیا ہو۔ مزید تفاصیل کے لئے مدلسین کے طبقات یا ان کی وضاحت پر مطبوعہ کتب دیکھی جاسکتی ہیں۔

ساقط و منقطع اسانید کا حکم:

منقطع روایت کی تمام اقسام ضعیف اور نا قابل احتجاج ہونگی کیونکہ راوی محذوف و مجہول ہے۔سوائے درج ذیل کے:

ا۔مرسل صحابی کی روایت۔قابل حجت ہوگی کیونکہ سب صحابہ عادل ہیں (الکفایۃ:۱۰۵،مقدمہ علوم الحدیث:۵۰)

۲۔کبار تابعین کی مرسل روایت بھی اکثر اہل علم کے ہاں اس وقت قابل حجت ہے بشرطیکہ اسے کوئی دوسری مرسل آکر مضبوط کردے یا کسی صحابی کا عمل یا کوئی قیاس تقویت پہنچادے۔جیسے مراسیل سعید بن المسیب ،عروۃ بن الزبیر یا مسروق الصنابحی کی مراسیل۔اس لئے کہ ان کی بیشتر روایات براہ راست صحابہ رسول سے منقول ہیں۔ (الموقظۃ:۱۶) رہے صغار اور متاخرین کی مرویات مثلاً امام مالک، امام شافعی اور امام اوزاعی وغیرہ کی مراسیل قبول کرنا ہوتیں تو پھر یہی اصول بنتا کہ دیگر کی مراسیل بھی سرآنکھوں پر رکھی جائیں۔امام ابن عبدالبرؒ التمہید(۳۸/۱) میں لکھتے ہیں:

وَصِغَارُ التابِعِينَ وَمَنْ بَعْدَهُم تُعَدُّ مَرَاسِيلُهُم كَهُبُوبِ الرِّيحِ أَو شِبْهِ رِيحٍ، وَهِيَ إِمَّا مُنْقَطِعاتٌ أَو مُعْضَلاتٌ لِمَا بَيْنَهُم وَبَينَ النبيِّ ﷺ مِنْ رَجُلَينِ فَأَكْثَرَ۔صغار تابعین اور ان کے بعد کے علماء کی مراسیل چلتی ہوا یا ہوا کی طرح سمجھی جاتی ہیں یہ یا تو منقطعات ہیں یا معضلات کیونکہ ان کے اور رسول اللہ کے درمیان کم از کم دو افراد کا سقوط ہے۔

ضعیف حدیث پر عمل:

علماء حدیث نے احکام وعقائد میں ضعیف حدیث کو قابل اعتناء نہیں سمجھا، ہاں فضائل اعمال میں اگر حدیث ضعیف ہو تو اس پر عمل ہوسکتا ہے؟ اس سوال کے تین جواب دیے ہیں۔

ا۔بالکل عمل نہیں کرنا چاہیے اس لئے کہ ضعیف حدیث مسلمان کا علم نہیں۔امام بخاریؒ امام مسلمؒ، امام یحییٰ بن معینؒ اور ابن حزمؒ کا یہ نقطہ نظر ہے۔امام بخاری رحمہ اللہ نے قبولیت حدیث کی جو شرائط رکھی ہیں ان کے مطابق سوائے صحیح حدیث کے کچھ اور قبول کیا ہی نہیں جاسکتا۔مثلاً:

۱۔ مُعَنعِن کی روایت کے لئے ان کی شرط صرف معاصرت کا ثبوت نہیں بلکہ ملاقات کا ہونا بھی ہے۔ یہ شرط حدیث کی صحت اور پختگی کے لئے اس دور میں انتہائی مفید ثابت ہوئی۔

۲۔ جو راوی متساہل ہو اس کی روایت متابعت کے بغیر معتبر نہیں یعنی جب تک دوسری سند اس متساہل کی روایت کو تقویت نہ دے وہ قابل اعتبار نہیں ہو سکتی۔ ایسے راویوں میں سے کسی کی روایت صحیح بخاری میں بالکل نہیں۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے مقدمہ صحیح مسلم میں ضعیف حدیث کو قبول نہ کرنے کے بارے میں یہ دلائل دیئے:

وَإِنَّما أَلْزَمُوا أَنْفُسَهُمْ، الْكَشْفَ عَنْ مَعَايِبِ رُوَاةِ الْحَدِيثِ وَنَاقِلِي الأخبارِ، وَأَفْتَوا بِذَلِكَ حِينَ سُئِلُوا، لِمَا فِيهِ مِنْ خَطَرٍ عَظِيمٍ، إِذِ الأَخْبارُ فِي أَمْرِ الدِّيْنِ إِنَّما تَأْتِي بِتَحْلِيلٍ أَو بِتَحْرِيمٍ أَو أَمْرٍ أَو نَهْيٍ أَو تَرْغِيبٍ أَو تَرْهِيبٍ، فَإِذا كَانَ الرَّاوِيْ لَهَا لَيْسَ بِمَعْدِنٍ لِلصِّدْقِ وَالأَمَانَةِ، ثُمَّ أَقْدَمَ عَلَى الرِّوايَةِ عَنْهُ مَنْ قَد عَرَفَهُ، وَلَمْ يُبَيِّنْ مَا فِيهِ لِغَيرِهِ مِمَّنْ جَهِلَ مَعْرِفَتَهُ، كَانَ آثِماً بِفِعْلِهِ ذَلِكَ، غَاشاً لِعَوَامِ الْمُسلمينَ، إِذْ لَا يُؤْمَنُ عَلى مَنْ سَمِعَ تِلْكَ الأَخْبارَ أَن يَسْتَعمِلَهَا أَو يَسْتَعْمِلَ بَعْضَهَا، وَلَعَلَّهَا أَو أَكْثَرُهَا أَكَاذِيْبُ لَا أَصْلَ لَهَا۔ محدثین نے اپنی یہ ذمہ داری سمجھی کہ وہ رواۃ حدیث اور اخبار کے ناقلین کے معائب کھول کر رکھیں گے۔ اس لئے جب بھی ان سے ان کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے واشگاف الفاظ میں جواب دئے۔ اس لئے کہ ان کا ضرر بڑا خطرناک تھا جب کہ احادیث کا معاملہ دین کا ہے جن میں حلال وحرام یا امر ونہی اور ترغیب وترہیب ہی ہے۔ لہذا اراوی حدیث جب خود مقام صدق وامانت سے کم تر ہو پھر اس سے وہ روایت کرے جو اس کی کم تری کو جانتا بھی ہو اور دوسرے ناواقف کو اس بارے میں آگاہ بھی نہ کرے تو ایسا راوی خود بھی گناہ گار ہوگا اور عام مسلمانوں کے ساتھ دغا کا مرتکب بھی۔ اسلئے کہ جو ایسی اخبار واحادیث سن لے وہ تو ان پر عمل کر بیٹھے گا یا کچھ پر بھی۔ جب کہ ایسی کچھ یا اکثر روایات جھوٹی ہوں گی جن کی کوئی اصل ہی نہیں۔

☆......امام ابنؒ رجب فرماتے ہیں: امام مسلم رحمہ اللہ کی اس گفتگو سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ احادیث ترغیب بھی صحت کے اسی معیار پر ہوں جن سے احکام مروی ہوتے ہیں۔ امام ابن العربی، خطابی، ابن حزم اور ابوشامہ وغیرہ رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں:

لَا يُعْمَلُ بِالحديثِ الضعيفِ فِي فَضَائِلِ الأَعْمالِ۔ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ بالکل اس پر عمل ہوسکتا ہے۔ جمہور علماء اس طرف گئے ہیں۔ جن میں امام احمدؒ بن حنبل کا ایک قول بھی ہے۔ نیز امام سفیانؒ الثوری، عبداللہؒ بن المبارک اور عبدالرحمٰنؒ بن مہدی کی طرف بھی یہ بات منسوب ہے۔ ابنؒ عبدالبر بھی یہی کہتے ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

اتَّفَقَ الْعُلَماءُ عَلَى جَوازِ الْعَمَلِ بِالْحَدِيثِ الضَّعِيفِ فِي فَضَائِلِ الأَعْمَالِ۔ (مقدمہ اربعین) علماء فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے جواز پر متفق ہیں۔

اتفاق کی بات قابل غور ہے اس لئے کہ اوپر ہم سخت موقف بھی پڑھ آئے ہیں۔

یاد رکھئے! جمہور علماء کے دور میں احادیث کی دو اقسام تھیں۔ **صحیح یا ضعیف**۔ حسن نام کی مصطلح نہیں تھی بلکہ یہ بعد میں متعارف ہوئی۔ اس لئے جس دور میں علماء نے یہ کہا: فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل ہوسکتا ہے۔ ان کی مراد وہ ضعیف حدیث ہے جو حسن درجے کی ہو۔ ورنہ ضعیف حدیث کی قبولیت کی شرائط علماء حدیث نے بیان کر دی ہیں۔ امام نوویؒ کے اس قول کی شاید وجہ یہ ہے کہ فضائل کی ضعیف حدیث میں کون سے تحلیل وتحریم کے مسائل ہوتے ہیں کہ وہ احکام میں خرابی پیدا کریں۔ جس چیز میں دوسرے کو تکلیف یا نقصان نہ ہو تو یہ خیر کا اضافہ ہی ہے جو نفس کو ثواب پر ابھارتا ہے۔

۳۔ یہ تیسرا قول ہے کہ فضائل کی احادیث پر عمل ہوسکتا ہے مگر چند شروط کے ساتھ:

پہلی شرط: پہلے فضائل کی صحیح احادیث پر عمل کر لیا جائے۔

دوسری شرط: حدیث شدید ضعیف نہ ہو۔ اس کا وہ راوی نہ ہو جو کذاب یا متہم بالکذب ہے یا جس میں روایت حدیث کی اندھا دھند غلطیاں ہیں۔ امام العلائی لکھتے ہیں کہ اس شرط پر محدثین متفق ہیں۔ یہ شرط پہلے قول کو مقید کر رہی ہے۔

تیسری شرط: یہ ضعیف حدیث اپنی اصل حدیث صحیح کے تحت آتی ہو اور جس پر پہلے سے عمل بھی ہو رہا ہو۔

چوتھی شرط: ضعیف حدیث پر عمل کے وقت یہ اعتقاد نہ ہو کہ یہ حدیث آپ ﷺ سے یہ ثابت ہے یا آپ ﷺ

نے فرمایا ہے اس لئے کہ جو آپ ﷺ نے کہا ہی نہیں وہ آپ کی طرف کیوں منسوب ہو اور نہ ہی اسے پھیلانے کی کوشش کی جائے۔ بقول امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (الفتاوی ۱۸/۶۷) ان شروط کا بھی خیال کرے:

فَإِذَا تَضَمَّنَتْ أَحادِيثُ الفَضَائِلِ الضَّعِيفَةِ تَقْدِيراً وتَحْدِيدًا، مِثْلَ صَلاةٍ فِي وَقْتٍ مُعَينٍ بِقِرَائَةٍ مُعَيَّنَةٍ أَوْ عَلَى صِفَةٍ مُعَيَّنَةٍ، لَمْ يَجُزْ ذَلِكَ۔ مگر جب فضائل کی ضعیف احادیث تقدیر وتحدید پر مشتمل ہوں جیسے: کوئی نماز وقت معین پر معین قرائت کے ساتھ پڑھنا یا معین طریقے اور صفت سے پڑھنا تو پھر ضعیف حدیث پر عمل ناجائز ہوگا۔

کون سی رائے راجح ہے؟ پہلی رائے ہی زیادہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ صحیح احادیث میں جو فضائل بتائے گئے ہیں حفظ مراتب کا تقاضا ہے کہ پہلے ان پر تو عمل کرلیا جائے۔ یہ نفس انسانی کی کمزوری ہے کہ نئی نئی عملیات کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے اور اصل سے بیگانہ۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

بعض علماء ضعیف حدیث پر عمل کرتے ہیں جس کا یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ وہ مستحب عمل کو ایسی حدیث سے ثابت کررہے ہیں جو ناقابل احتجاج ہے کیونکہ استحباب تو ایک شرعی حکم ہے جو صرف دلیل شرعی سے ہی ثابت ہوتا ہے۔ جو عالم بھی اللہ تعالی کی طرف سے کسی عمل کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ اللہ اس عمل کو پسند فرماتے ہیں مگر اس کی کوئی دلیل شرعی نہیں تو وہ واقعۃً اس دین میں شریعت سازی کررہا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔

وہ مزید فرماتے ہیں:

بلکہ ان علماء کی مراد ایسا عمل جو نص سے یا اجماع سے ثابت ہو تو اسے اللہ تعالی پسند یا ناپسند فرماتے ہیں۔ جیسے تلاوت قرآن، تسبیح و دعاء کرنا، صدقہ کرنا اور گردنوں کا آزاد کرانا وغیرہ۔ اس لئے جب کوئی حدیث بعض مستحب اعمال کے فضائل میں ہو جس کا ثواب بھی مروی ہو یا بعض اعمال کے ناپسند ہونے یا ان کی سزا کی مقدار کے بارے میں ہو اس سے بھی آگاہ کرے کہ کیا یہ ضعیف ہے یا حسن۔ مگر جس کے موضوع ہونے کے بارے میں ہم لاعلم ہوں تو ایسی حدیث کی روایت و عمل تب جائز ہوگا کہ دل میں ثواب کی کوئی امید نہ ہو بلکہ اس پر عمل سے سزا کا خوف ہو۔ (الفتاوی ۱۸/۶۵)

یہ یاد رکھئے! ضعیف حدیث کے راوی میں کمزوری اگر عدالت کی وجہ سے ہے تو یہ حدیث کسی بھی صورت میں قوی نہیں ہوسکتی خواہ اس کی متعدد اسانید ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اگر یہ ضعف حفظ وضبط کی وجہ سے ہے تو پھر یہ حدیث دیگر طرق کی وجہ سے تقویت پالے گی اور اس پر عمل بھی جائز ہوگا۔ (الرسالۃ: ۵٦١، فتح المغیث ۴۲/۱، ۱۲۰)

ضعیف حدیث کی روایت کیسے کی جائے؟ صیغہ جزم کی بجائے اسے صیغہ تمریض سے روایت کیا جائے تا کہ حدیث کی صحت شک ڈال دے جیسے: رُوِیَ، نُقِلَ، فِیمَا یُرْوٰی، جَاءَ وغیرہ سے۔ کیونکہ اس کے بارے میں اصول یہ ہے کہ ضعیف حدیث ظن کا فائدہ دیتی ہے نہ عمل کا۔ اسے دلیل بھی نہیں بنایا جاسکتا اور نہ ہی اسے بغیر ضعیف کہے بیان کیا جاسکتا ہے۔ ہاں ترغیب وترہیب پر عمل بقول بعض ہوسکتا ہے۔

تبصرہ: ضعیف حدیث پر عمل کے جواز کے یہ سب ایسے اصول ہیں جن سے کوئی حدیث قوی ہوتی ہے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کی طرف اس کی نسبت درست ہوسکتی ہے۔ نیز دیگر لا متناہی اصولوں اور فتنوں کے دروازے بھی کھلتے ہیں۔ جن سے نہ صرف اصول حدیث متأثر ہوتا ہے بلکہ قرآن کریم وعلوم القرآن اور فقہ واصول فقہ جیسے فنون بھی اس آوارگی کی زد میں آجاتے ہیں۔ اس لئے ضعیف حدیث کی یہ تمام اقسام اپنی ان تعریفات سمیت نا قابل قبول اور مردود ہیں۔

غیر محدثانہ اصول اور مہلک نتائج

بعض غیر محدث حضرات نے ایسے اصول وضع کرڈالے ہیں جن سے ضعیف حدیث پر عمل آسان وعام ہوجائے۔ امت میں عمل وعقیدہ کی خرابی کا باعث یہی اصول بنے ہیں۔ اور بھانت بھانت کی بولیاں لوگوں کو سننے میں ملی ہیں۔ ضعیف وموضوع فقہی مسائل اور فضائل کتب، وعظ اور دروس میں عام ہوگئے۔ کیا ایسے اصول دیگر علوم اسلامیہ کے لئے بھی ہیں؟

اصول ۱۔ جس ضعیف حدیث کو امت شرف قبولیت بخشے وہ صحیح ہوگی: اس اصول کو قبول عام حاصل ہے۔ جس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ امت کبھی ضلالت پر مجتمع نہیں ہوسکتی اس لئے جس حدیث کو امت شرف قبولیت سے نواز دے وہ صحیح ہوگی۔ مثلاً امام زرکشیؒ جو قرآنی علوم کے ماہر ہیں۔ کہتے ہیں:

ضعیف حدیث کو جب امت شرف قبولیت بخشے تو صحیح یہ ہے کہ اس پر عمل کرلیا جائے۔ یہ تو بمنزل متواتر ہو جاتی ہے اور مقطوع کو بھی منسوخ کردیتی ہے۔ اس لئے امام شافعی رحمہ اللہ نے حدیث: لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ کے بارے میں فرمایا ہے: اس حدیث کو محدثین ثابت نہیں کرتے مگر عوام نے اسے قبولیت کا شرف بخشا اور اس پر عمل بھی کیا حتی کہ انہوں نے اسے آیت ﴿ كتب عليكم إذا حضر أحدكم الموت .. ﴾ کا ناسخ بھی کہہ دیا۔ (النکت علی ابن الصلاح ۴۹۷/۲)

حدیث لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ۔ کتب سنن اور مسانید میں بروایت إسماعيلُ بْنُ عَيَّاشٍ عَنْ شُرَحْبِيْلَ بْنِ مُسْلِمٍ عَنْ أَبِي أُمَامَةَ رضی الله عنهُ مروی ہے اس کے راوی اسماعیل پر بعض محدثین کرام نے جرح کی ہے۔ مگر امام بخاریؒ، امام احمدؒ اور دیگر متأخر محدثین میں امام ذہبی اور امام البانی رحمہم اللہ نے اسماعیل کے بارے میں یہ قاعدہ بتایا ہے کہ اگر وہ حجازی رواۃ سے حدیث بیان کریں تو ان کی روایت ضعیف ہوگی اور شامی رواۃ سے روایت کریں تو ان کی روایت صحیح وثابت ہوگی۔ چنانچہ اس روایت میں وہ شرحبیل بن مسلم سے جو شامی اور ثقہ راوی ہیں روایت کررہے ہیں اس لئے ان کی یہ روایت صحیح ہے نہ کہ ضعیف۔ یہی وجہ ہے جو امام شافعیؒ کو مذکورہ بات کہنا پڑی کیونکہ ان کے دور میں حدیث صحیح یا ضعیف ہوا کرتی تھی۔ اور ضعیف حدیث کی ادنی قسم وہ مراد لیتے ہیں جسے بعد میں حسن کہا گیا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد لکھا ہے: وفِي الْبَابِ عَنْ عَمرِو بْنِ خَارِجَةَ وَأَنَسٍ، وَهُوَ حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ۔ اس لئے ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی سند حدیث حسن لذاتہ کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ ہے وہ اصل بات جو ماہرین علم کی ہے۔ (نصب الرایۃ ۴۰۳/۴، إرواء الغلیل ۸۸/۶، سیر اعلام النبلاء ۳۲۱/۸)۔

اس لئے جو حدیث حسن حدیث سے بھی کم درجہ کی ہو وہ ضعیف ہوگی۔ اور اپنی شاہد نہ ہونے کی وجہ سے کبھی تقویت نہیں پکڑ سکتی خواہ امت اسے شرف قبولیت ہی کیوں نہ بخشے۔ یہ حدیث تو آیت ﴿ وإن تطع أكثر من في الأرض يضلوك ﴾ کا آئینہ ہے۔ کیونکہ عوام تو کالأنعام ہوتے ہیں۔ ان کا علم سے کیا تعلق؟ کیا بداعمالی کی کثرت بھی امت کے لئے شرف قبولیت کی بات ہے؟ اسی اصول پر عمل کرکے کتنے علوم کو زخمی کردیا گیا ہے؟ کتنی موضوع احادیث ہیں جنہیں شرف قبولیت بخشا گیا ہے اور جن میں سوائے ضلالت کے کچھ نہیں۔ اس لئے جو حدیث صحت کی شرائط ہی پوری نہ کرتی ہو اس کے لئے یہ اصول ہی غلط ہے۔

۲۔ضعیف حدیث ظاہر قرآن کے موافق ہو تو صحیح ہوگی: یہ ایک اور اصول ہے جو بعض فقہاء کرام نے بیان کیا ہے۔اس اصول کے مطابق صحیح حدیث ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ ظاہر قرآن کے موافق ہو۔امام زرکشیؒ لکھتے ہیں: ابوالحسن بن الحصار نے (تَقْرِیْبُ الْمَدَارِكِ عَلَی مُوَطَّأِ مَالِكٍ) میں لکھا ہے:

> محدثین نے جو اصول بنائے ہیں ان کے بے شمار مقاصد ہیں جن میں وہ مبالغہ کی حد تک احتیاط برتتے ہیں۔فقہاء کے لئے ان اصولوں پر چلنا ضروری نہیں۔مثلاً وہ حدیث مرفوع کو اس وقت معلول قرار دیتے ہیں جب وہ موقوف یا مرسل مروی ہو۔یا راوی پر جرح کر دیتے ہیں جب وہ منفرد ہو یا اس نے اپنی روایت میں کچھ اضافہ کر دیا ہو۔یا اس نے اپنے سے بڑے عادل وحافظ کی مخالفت کی ہو۔

مزید یہ بھی لکھا:

> کبھی فقیہ کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث اصول فقہ کے موافق ہے لہذا یہ صحیح ہے۔یا کسی حدیث کے آیت قرآن کے موافق ہونے پر فقیہ اسے اعتقاداً صحیح قرار دیتا ہے اور قابل عمل سمجھتا ہے۔حدیث کی سند میں اگر کوئی کذاب راوی نہیں تو پھر وہ اگر کتاب اللہ کے موافق ہے اور اصول شریعت سے متصادم نہیں تو اسے صحیح قرار دینے میں کوئی حرج نہیں۔(النکت علی ابن الصلاح ۲/۱۲۸)

معلوم نہیں ان بعض فقہاء کو کب اور کیسے یہ باور ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کے موافق یہ ضعیف حدیث ہے۔ظاہر پرستی تو دین میں غور وفکر اور استدلال سے خالی چیز کا نام ہے۔پھر یہ اصول امت کو کیوں بخشا جا رہا ہے؟ کیا صرف محدود اور محبوب مسائل میں یہ اصول کام آئیں گے یا دیگر خرافات کا دروازہ بھی کھول دیں گے؟ ان اصولوں کا مطلب یہ بھی ہوا کہ متروک یا اسی درجہ کا راوی جسے انتہائی ضعیف قرار دیا جا چکا ہے اس کی روایات کو اس لئے صحیح قرار دیا جائے گا کہ وہ کتاب اللہ یا اصول شریعہ کے موافق ہیں اور جو صحیح روایات ہیں مگر بظاہر مخالف قرآن ہیں انہیں چھوڑ دیا جائے۔جیسا کہ ہو چکا ہے۔معتدل علماء وفقہاء نے ایسے فقہاء کو یہی مشورہ دیا ہے کہ ان محدود آراء کی بجائے اپنے اصولوں کو بدلا جائے تاکہ قرآن وحدیث کے مابین بعد کی بجائے قرب پیدا ہو۔

محدثین کرام ایسے اصولوں کے قائل نہیں۔اور ان ضعیف، متروک اور موضوع احادیث کو وہ ظاہر قرآن کیا دین اسلام کی روح کے منافی سمجھتے ہیں۔ان موضوع احادیث کو دیکھ کر کوئی طالب علم بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ظاہر قرآن

کے موافق ہیں۔ جیسے:

دعائے آدم: یَا رَبِّ أَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ، یا انہوں نے یہ کہا: اَللّٰهُمَّ إِنِّی أَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ عَلَیْكَ۔ یا ایک بدو نے آپ ﷺ کی قبر مبارک پر خود کو پھینکا اور سر پر مٹی ڈال دی اور کہنے لگا: اللہ تعالی نے آپ کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿ولو أنهم إذ ظلموا أنفسهم﴾ تو میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے اور آپ کے پاس آ گیا ہوں تاکہ آپ میرے لئے استغفار کریں تو قبر سے آواز آئی: جا تجھے معاف کیا۔ یا إِذَا أَعْیَتْكُمُ الْأُمُورُ فَعَلَیْكُمْ بِأَصْحَابِ الْقُبُورِ۔ کیا ان جیسی موضوع، من گھڑت وضاع اور کذاب لوگوں کی روایات کو بھی آیت ﴿وابتغوا إليه الوسيلة﴾ کے موافق پا کر صحیح سمجھا جائے گا اور صحیح حدیث لَا صَلَاةَ إِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ کو ظاہر قرآن ﴿فاقرؤوا ما تیسر منه﴾ کے خلاف سمجھ کر ترک کر دیا جائے گا؟ اصول بدلئے۔ دین نہیں بدل سکتا۔ دیکھئے: تذکرۃ الحفاظ، اقتضاء الصراط المستقیم، المدخل از امام حاکم اور تلخیص مستدرک۔

۳۔ مجتہد جب ضعیف حدیث سے استدلال لے تو وہ صحیح ہو جائے گی: یہ نرالا اصول ابن الہمامؒ نے اپنی التحریر میں لکھا ہے:

> اَلْمُجْتَهِدُ إِذَا اسْتَدَلَّ بِحَدِیثٍ كَانَ تَصْحِیحًا لَهُ كَمَا فِی التَّحْرِیرِ لِابْنِ الْهَمَّامِ وَغَیْرِهِ (إنهاء السكن من يطالع إعلاء السنن:۱۶)۔ جب کسی حدیث سے مجتہد استدلال لے تو وہ اس حدیث کا صحیح ہونا ہوتا ہے۔

کتب علوم الحدیث میں صاف لکھا ہے کہ عالم کا عمل یا حدیث کے مطابق اس کا فتوی یہ معنی قطعاً نہیں رکھتا کہ ایک ضعیف حدیث صحیح ہو گئی۔ اسی طرح مجتہد کی حدیث سے عملی مخالفت کا یہ معنی بھی نہیں کہ وہ صحیح حدیث کو یا اس کے راوی کو کمزور کر رہا ہے۔ (مقدمہ ابن الصلاح مع التقیید والایضاح: ۱۲۰، کتاب إرشاد طلاب الحقائق از امام نوویؒ ۱/۲۹۱)۔ یہی بات امام عراقیؒ اور زکریا انصاریؒ نے فتح الباقی میں اور سخاویؒ نے بھی لکھی ہے۔ امام ابن الجوزیؒ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے:

> أَنَّ جَمَاعَةً مِنَ الْفُقَهَاءِ یَبْنُونَ عَلَى الْعُلُومِ الْمَوْضُوعَةِ (الموضوعات ۱/۳) فقہاء کی ایک جماعت اپنے استنباط و مسائل کی بنیاد موضوع حدیث پر رکھتی ہے۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

رَأَیْتُ بِضَاعَةَ أَکْثَرِ الْفُقَهَاءِ فِي الْحَدِیثِ مُزْجَاةً، یَعُولُ أَکْثَرُهُمْ عَلَی الْأَحَادِیثِ لَا تَصِحُّ وَیَعْرِضُ عَلَی الصِّحَاحِ وَیُقَلِّدُ بَعْضُهُم بَعْضاً فِیمَا یَنْقُلُ۔ (التحقیق فی اختلاف الحدیث ۱/۳) میں نے اکثر فقہاء کو علم حدیث میں معمولی علم والا پایا ان کی اکثریت ایسی احادیث کو پیش کرتی ہے جو صحیح نہیں ہوتیں مگر انہیں صحیح بنا کر پیش کر دیتے ہیں پھر ان کے بعد بھی ہر ایک انہی کو ویسے ہی بے سوچے سمجھے نقل کر دیتا ہے۔

سچی بات بھی یہی ہے کہ فقہ کی بعض کتب میں وارد مسائل کا استنباط ایسی ہی احادیث سے کیا گیا ہے۔ یہی شکایت امام بدرالدین العینیؒ اور شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی کو بھی ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

بہر حال ائمہ حدیث، ضعفاء سے ایسی احادیث احکام روایت نہیں کرتے جس میں وہ منفرد ہوں۔ ائمہ حدیث میں کوئی بھی ایسی غلطی نہیں کرتا۔ اور نہ ہی غیر محدث محقق یہ پسند کرے گا۔ فقہاء کرام کی اکثریت ایسی احادیث پر اعتماد اگر کرتی بھی ہے تو اولاً یہ درست نہیں اور علمی اعتبار سے بہت ہی بری حرکت ہے۔ اس لئے کہ وہ فقیہ، حدیث کے ضعف کو جانتے تھے تو ان کے لئے اس سے استخراج واستنباط کرنا ہی ناجائز تھا کیونکہ فقہاء کرام بھی متفق ہیں کہ احکام میں ضعیف حدیث قابل حجت نہیں۔ پھر بھی فقیہ کو اہل علم سے اس کے بارے میں سوال کر لینا چاہئے تھا۔ (شرح صحیح مسلم ۱/۱۲۶)

اس لئے یہ اصول، ماہرین حدیث کا نہیں۔ حقائق شاہد ہیں کہ بے شمار ضعیف احادیث سے مجتہدین کرام نے استدلال لئے ہیں۔ تو کیا ضعیف احادیث کی بنیاد پر فقہ اسلامی کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ نیز ہر مجتہد کو اگر یہ چھوٹ دی جائے تو کیا سبھی کی یہ تصحیح قبول کر لی جائے گی؟ اگر ایسا ہے تو مالکی، حنفی، شافعی اور حنبلی مذاہب میں اختلافات کی ایک بنیاد کیا ضعیف حدیث کو قبول کر لینے پر نہیں؟

۴۔ **کیا ضعیف حدیث صحیح ہوگی جب کسی صوفی پر اس کا کشف ہو جائے؟** کشف، علم غیب کے جاننے کا ایک خدائی دعوی ہے جو قرآن اور رسول پر ایمان رکھنے کے بعد کسی کو بھی زیب نہیں دیتا۔ دین اسلام کے مختلف اہم پہلوؤں کو صوفیانہ کلام نے ایسا رنگ دیا ہے جس میں حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں رہی۔ ذو معنی لفظ اور نئی اصطلاحات متعارف کرانے میں تصوف کو کمال حاصل ہے۔ یہی نام ہیں جن کی بناء پر وہ احادیث کی تصحیح وتضعیف

کرتے ہیں۔ مثلاً: لفظ کشف کو ہی لیجئے اس کا معنی پردہ اٹھنے کا کرتے ہیں۔ یعنی ایک صوفی پر غیبی چیزوں اور حقیقی امور کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور وہ ان کی حقیقت سے مطلع ہو جاتا ہے۔ یہی تصوف کی وہ بنیاد ہے جس سے ہر صوفی آشنا ہے کہ ذرا گردن جھکائی تصویر دیکھ لی۔ گویا مراقبہ کر کے ہر غیبی شے سے مطلع ہوا جا سکتا ہے۔ اسے کیا ضرورت ہے کہ قرآن کریم پر غور کرے یا اسے سمجھے یا احادیث رسول اور ان کے اصولوں کو جانے جو محدثین کرام نے ایک حدیث کی تحقیق کے لئے بنائے ہیں۔ مثلاً یہ حدیث:

أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمْ اقْتَدَيْتُم اهْتَدَيْتُمْ۔ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا لوگے۔

شیخ شعرانی (المیزان الکبری ۱/۳۰) میں لکھتے ہیں: وَهٰذَا الْحَدِيثُ وَإِنْ كَانَ فِيهِ مَقَالٌ عِنْدَ الْمُحَدِّثِينَ فَهُوَ صَحِيحٌ عِنْدَ أَهْلِ الْكَشْفِ۔ اس حدیث میں اگرچہ محدثین کرام کو خاصا اعتراض ہے مگر اہل کشف کے ہاں یہ صحیح ہے۔ اس طرح تو بہت سی باطل وموضوع احادیث کو بھی جب اور جہاں چاہیں صحیح کیا جا سکتا ہے۔ اور حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دیا جا سکتا ہے۔ بالفرض یہ کشف اگر احسن حالات میں صحیح بھی ہو اور ہوائے نفس سے مبرا بھی، تو بھی اس کی حیثیت ایک رائے کی ہے اور رائے میں انسان خطا بھی کرتا ہے اور مصیب بھی ہوتا ہے۔ شیخ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: درجہ بالا حدیث کی مجموعی طور پر نو اسانید ہیں۔ جن میں پانچ اسانید تو ایسی ہیں جن میں یا تو کذاب راوی ہے یا وہ ہے جو جھوٹ سے متہم ہے۔ تین اور اسانید میں ایسے راوی ہیں جنہیں متروک کہا گیا ہے۔ اور نویں سند وہ ہے جس میں دو مجہول راوی ہیں جن کی وجہ سے یہ حدیث بہت ہی ضعیف ہے۔

کشف سے محبت رکھنے والے اَلْعِلْمُ حِجَابُ الأَكْبَرُ علم شریعت ہی دین طریقت یا مشاہدہ حق میں سب سے بڑا حجاب۔ رکاوٹ ہے۔ کہہ کر شرعی علوم کو کہاں ہضم کر سکتے ہیں۔ اور جو اَلْجَهْلُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الْعِلْمِ جہالت مجھے علم سے زیادہ عزیز ہے۔ جو تَرْوُوْنَ عَنْ عَبْدِ الرَّزَّاقِ وَنَحْنُ نَرْوِيْ مِنَ الرَّزَّاقِ کے قائل ہوں انہیں ضعیف حدیث کی تحقیق کی ضرورت ہی کیا ہے؟

۵۔ رسول اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھنے سے ضعیف حدیث کے صحیح ہونے کا دعوی: علی بن مسہر رحمہ اللہ کہتے

ہیں: میں اور حمزہ الزیات نے ابان سے تقریباً ایک ہزار احادیث سنیں۔علی کہتے ہیں کچھ عرصہ بعد میں حمزہ کو ملا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ خواب میں مجھے رسول اکرم ﷺ ملے تو میں نے انہیں ابان کی احادیث سنائیں تو آپ نے ان میں سے صرف پانچ یا چھ احادیث کو پہچانا۔امام نوویؒ لکھتے ہیں:

محدثین کے ہاں ایسے خواب کوئی حیثیت نہیں رکھتے جن کی بنیاد پر کسی بھی حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دیا جا سکے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ابان خود ضعیف ہے ورنہ حمزہ کا خواب ابان کو قطعی طور پر ضعیف قرار نہیں دے سکتا۔نہ اس خواب سے کوئی ثابت شدہ سنت باطل ہو سکتی ہے اور نہ ہی غیر ثابت شدہ سنت اس سے صحیح ہو سکتی ہے۔ اہل علم کا اس پر اجماع ہے۔(شرح صحیح مسلم ۱/۱۱۵)۔نیز اصول یہی ہے شرعاً جو کچھ طے ہو چکا ہے اسے خواب تبدیل نہیں کر سکتا۔

کچھ لوگوں نے حدیث کی تصحیح یا تضعیف کا ایسا دعوی بھی کیا ہے کہ ان کی خواب میں آپ ﷺ سے ملاقات ہوئی جس میں بعض احادیث کے بارے میں آپ ﷺ سے پوچھا۔مثلاً شعرانی نے ابوالمواہب الشاذلی کا یہ قول لکھا ہے: میں رسول اللہ ﷺ کو خواب میں ملا اور آپ ﷺ سے اس مشہور حدیث (أُذْكُرُوا اللّٰهَ حَتّٰى يَقُولُوا مَجْنُونٌ) اللہ کا ذکر اتنا کرو کہ لوگ کہہ اٹھیں کہ یہ پاگل ہو گیا ہے۔کے بارے میں سوال کیا۔اور صحیح ابن حبان میں ہے: (أَكْثِرُوا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ حَتّٰى يَقُولُوا مَجْنُونٌ) اللہ کا ذکر اتنا زیادہ کرو کہ لوگ پکار اٹھیں کہ یہ پاگل ہو گیا ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا: ابن حبان اپنی روایت میں بالکل سچے اور صادق ہیں اور راوی نے بھی جو أُذْكُرُوا اللّٰهَ کہا ہے وہ بھی سچ ہے۔اس لئے کہ میں نے ان دونوں کو بیک وقت کہا تھا۔ایک بار اذکروا اور دوسری بار أَكْثِرُوا۔ (الطبقات الکبری ۲/۶۸)۔کیا ایسے دعوے ادیان باطلہ میں نہیں پائے جاتے؟ یہ بھی ایک جھوٹ ہے جسے شاید ہی کوئی مسلمان سچ مان سکے۔جو بزرگ صوفی یہ کہیں: إِذَا رَأَيْتَ الصُّوفِيَّ يَشْتَغِلُ بِحَدَّثَنَا فَاغْسِلْ يَدَكَ مِنْهُ۔جب تم کسی صوفی کو دیکھو کہ وہ حَدَّثَنَا یا أَخْبَرَنَا کے چکر میں پڑ گیا ہے تو بس اس سے ہاتھ دھولو۔کیا وہ صحیح یا ضعیف وموضوع میں تمیز کریں گے یا کشف اور خواب پر چلیں گے؟۔

٦۔کسی حدیث کو جدید سائنسی نکتہ نظر سے صحیح یا ضعیف قرار دینا: ہمارے بعض معاصرین اکثر وبیشتر سائنس دان

کی تحقیقات کا موازنہ آیات قرآنیہ یا احادیث رسول ﷺ سے کرتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے اگر مادہ، پودہ، حیوان یا خلاء کے بارے میں کچھ کہہ دیا تو احادیث نبویہ کے بارے میں ان کا نقطہ نظر یہ ہو جاتا ہے کہ جو حدیث ان تحقیقات کے مطابق ہے وہ سر آنکھوں پر خواہ وہ ضعیف یا موضوع ہی کیوں نہ ہو اور جو نہیں وہ حدیث ہی نہیں ہوسکتی۔ یہ اصول درست نہیں کیونکہ سائنس جو کچھ بتاتی ہے وہ اس زمانے کی ایک امکانی کوشش ہوتی ہے نہ کہ حقیقتاً ایسا ہوتا ہے۔ ماضی میں سائنسدان یہ کہا کرتے کہ سورج ایک ثابت وساکن سیارہ ہے۔ اس دور میں یہ یقینی بات سمجھی گئی مگر کچھ عرصہ بعد انہی سائنسدانوں نے مزید تحقیق کی تو کہا کہ سورج بھی بہت تیزی کے ساتھ اپنے مدار میں گھوم رہا ہے۔ ہاں جو صحیح حدیث کے مطابق سائنسی تحقیق ہے اس کے انکار کی گنجائش نہیں بلکہ اس میں نبی امی کے رسول اللہ ﷺ ہونے کی شہادت ہے۔

۷۔ **عقلی تک بندیوں سے کسی حدیث کو ضعیف یا صحیح قرار دینا:** بعض لوگ کہتے ہیں اگرچہ روایات صحیح بھی ہوں مگر عقل میں نہیں آتیں! ان سے گزارش ہے کہ چند روایات تو یقیناً صحیح نہیں لیکن یہ اصول بھی کب صحیح ہے کہ جو واقعہ آپ کی عقل میں نہ آئے وہ یکسر غلط اور موضوع ہے؟ آپ بلا تأمل پوچھئے کہ یہ واقعات وروایات اصول فن روایت کی بنا پر کہاں تک صحیح اور قابل قبول ہیں؟ اتنا پوچھ لینا ہی کافی ہے لیکن یہ کہاں کا اصول تحقیق اور معیار تمیز حق وباطل ہے کہ واقعے یا روایت کی صحت کے لئے پہلی شرط آپ کی عقل کی تصدیق ہے؟ یہ جملہ تو خطرناک قسم کی سوفسطائیت ہے جو اس طرح واضح ہوتی ہے۔

تبصرہ: ہر واقعے وروایت کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے اہم شے ان پانچ شرائط کا ہونا یا نہ ہونا ہے۔ چند ضعیف وموضوع روایات اگر نا اہل لوگوں نے بیان کردی ہیں تو کیا اس بناء پر احادیث کا ذخیرہ ہی رد کردیا جائے؟ نیز یہ بھی کون سی دین داری ہے کہ ضعیف وموضوع روایات پر صحیح دین اور اس کے خالص جذبے کو قربان کیا جارہا ہے۔ کچھ لوگ اپنے عقلی معیار کو تدبر نام دینے پر مفتخر ہیں اور **تطبیق منقول ومعقول** کے مرعوب کن لفظ کا استعمال کرتے ہیں اور علانیہ تمسخر اڑاتے بھی نہیں شرماتے۔ یہ سب ایسی تیز قینچی ہے جسے اٹھایا اور اندھادھند قطع وبرید کردی۔ اسے اس علم وفن سے مس کا نام دیا جائے یا اصول وقواعد کے مطابق ماہرانہ رائے کہا جائے؟ کتابوں پر گہری نظر کا اعزاز دیا جائے یا عربی زبان کا حافظ وقت انہیں قرار دیا جائے۔ جب باوثوق ارباب علم وفن کی اس فن پر نقد موجود

ہے۔ جو اپنی درایت وشہادات کی بنا پر ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ روایات پایہ اعتبار سے گری ہوئی ہیں۔ اور فن اصول حدیث کے اعتبار سے لائق احتجاج نہیں تو پھر کیا ضرورت ہے اان تکلفات کی؟

انسانی عقل اکثر و بیشتر قلابازیاں بھی کھاتی ہے اور پلٹے بھی۔ عام دین دار اور کم پڑھا لکھا جوشیلا نوجوان اس قلاباز کی فصاحت وخطابت سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ وہ حرام ومنکر کو بھی بیک وقت ایک ہی شے بنا دیتا ہے اور گانے بجانے، رقص وسرود کی محفلوں کے لئے یہ دلیل بھی لاتا ہے کہ جاہلی دور کی یہ تفریحات تو عام تھیں اور بت پرستی بھی۔ اگر یہ تفریحات حرام ہوتیں تو قرآن میں جس طرح شرک وبت پرستی سے روکا گیا ہے اس سے بھی روکا جاتا جب کہ ایسا نہیں۔ یا الأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ حدیث نہیں بلکہ قریش کا شعار تھا اور قریشی سیاسی برتری کے لئے اسے محض دباؤ کے لئے اپنایا گیا تھا۔ یہی پسندیدہ معیار وہ احادیث رسول کے اسباب کا بنالیتا ہے۔ اکابرین وبزرگوں کے تجربات اور معقولات کو حدیث صحیح سے بڑھ کر ترجیح دینے کا رجحان، عام پبلک کو کیا رسول اللہ ﷺ سے جوڑ رہا ہے؟

☆......امام مسلمؒ مقدمہ میں فرماتے ہیں: وَاللّٰهِ مَا حَدَّثَنَا الْحَسَنُ عَنْ بَدْرِيٍّ مُشَافَهَةً وَلَا حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيَّبِ عَنْ بَدْرِيٍّ مُشَافَهَةً إِلَا عَنْ سَعْدِ بْنِ مَالِكٍ۔ بخدا ہمیں حسن بصری نے کسی بدری سے بالمشافہہ حدیث بیان کی ہے اور نہ ہی سعید بن المسیب نے کسی بدری سے بالمشافہہ حدیث بیان کی ہے ہاں اگر کی ہے تو صرف سعد بن مالک سے۔ یہ تردید امام محترم نے اس لئے کی ہے کہ حسن بصری سے صوفیہ نے اپنے سلسلہ ہائے طریقت کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ پھر بلا سند ایسے سلسلوں کا کیا جواز؟ صوفیاء کا شجرہ طریقت سیدنا ابوبکر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کے واسطے سے ہی آپ ﷺ تک پہنچتا ہے جو بلا سند ہے۔ ملا علی القاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: صوفیاء جو اپنی نسبت امام حسن بصری عن علیؓ سے ملاتے ہیں۔ محدثین کے نزدیک ان کی ملاقات ہی ثابت نہیں، تحصیل علم تو بڑی بات ہے۔ پھر بھی اگر کوئی یہ کہے کہ صوفیاء اپنے شجرہ نسب ملانے کے لئے ظاہری صحبت کے محتاج نہیں تو جواب یہی ہے کہ نسخہ اویسیہ ہی اگر آپ کی پہنچ ہے تو پھر ظاہری معلومات یا صحبت کا ثبوت تو واقعی تکلف ہے۔ دلائل السلوک از مولانا اللہ یار ص: ۲۰۳۔

ضعیف حدیث کن کتب میں ہوگی؟ امام شوکانیؒ نے تحفۃ الذاکرین (ص ۱۱) میں اس کی تفصیل دی ہے جو انہوں نے الجامع الکبیر کے مقدمہ میں امام سیوطی رحمہ اللہ سے منسوب کی ہے۔ وہ حدیث جسے تیسرے درجے کی

کتب روایت کریں یا جسے عقیلی، ابن عدی، خطیب بغدادی، اپنی کتب میں، ابن عساکر اپنی تاریخ میں، دیلمی اپنی مسند الفردوس میں، ترمذی الحکیم اپنی نوادر الأصول میں یا الحاکم اور ابن الجارود اپنی اپنی تاریخ میں روایت کرنے میں منفرد ہوں۔

مہلک نتائج: جب صحیح، حسن اور ضعیف کی روایت میں تساہل آیا تو نتیجتاً ضعیف وموضوع احادیث قبول عام ہوگئیں اور بدعات بھی خوب پھیل گئیں۔ شخصیت پرستی عام ہوگئی۔ ظاہر ہے رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے بلاتحقیق بات آپ ﷺ کی تعظیم کی کمی کی شہادت ہے۔ مقام نبوت کا انکار ہے۔ دین کی توہین ہے۔ اور اپنی شخصیات کو مقام نبوت پر بٹھانا ہے۔ شرائط روایت سے جان چھڑا کر محض یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ فلاں کتاب میں یہ حدیث لکھی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ حدیث کی شرائط صحت اور کتب کا مرتبہ بھی دیکھ لیا جائے۔ واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ مِنْ أَعْظَمِ الْفِرَى: أَنْ يَدَّعِيَ الرَّجُلُ إِلَى غَيرِ أَبِيهِ، أو يُرِي عَينَهُ مَا لَم تَرَ، أو يقولَ عَلَى رسولِ اللّٰهِ ﷺ مَا لَمْ يَقُلْ۔ (فتح الباری ۶/۵۴۰) ایک بڑا بہتان یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے باپ کی بجائے کسی اور کے باپ ہونے کا دعوی کرے۔ یا وہ اپنی آنکھ کو وہ دکھائے جو وہ نہ دیکھتی ہو یا وہ رسول اللہ ﷺ پر وہ کچھ کہے جو آپ ﷺ نے نہ کہا ہو۔

امام سیوطیؒ اسے کبیرہ گناہ کہتے ہیں جو انجانے میں غلط روایت ہو جائے۔ اور عمداً ایسا کرنے والا خارج از ملت ہے۔ وہ کہتے ہیں: علماء کا اتفاق ہے کہ موضوع وضعیف روایت کو بیان کرکے یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ یہ حدیث موضوع یا ضعیف ہے۔ امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں: آپ ﷺ کی یہ وعید اس ارشاد حَدِّثُوا عَنِّيْ وَلَا حَرَجَ کے متصل بعد تھی۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ آپ ﷺ کی طرف سے صحیح حدیث کی تبلیغ واشاعت کی جائے نہ کہ ضعیف کی۔ اور حق کی کی جائے نہ کہ باطل کی۔ بغیر تحقیق کے ہر سنی سنائی بات کی تبلیغ واشاعت کرنا یہی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے۔ (تحذیر الخواص من اکاذیب القصاص: ۱۲۵) انجانی سی غیر حدیثی کتب پڑھنا اور ان کی ضعیف وموضوع روایات کو پھیلانا گویا کذاب لوگوں کی صف میں شامل ہونا ہے۔

شاید انہی ضعیف احادیث کے بداثرات تھے جن پر بعض فقہاء نے بھرپور اعتماد کیا اور ان سے فقہی مسائل کشید کر کے نہ صرف کتب لکھیں بلکہ مسائل بھی اختلافی بنادئے۔ ذیل کے چند ایسے مشہور مسائل ہیں جن میں انتہائی ضعیف روایات پر اعتماد کیا گیا ہے۔اور خوب کھینچا تانی بھی کی گئی ہے۔ وجوہات غالباً یہی تھیں کہ ائمہ عراق کے ہاں یہ روایات قیاس کے خلاف تھیں۔ مثلاً:

قہقہہ سے وضو کا ٹوٹنا۔ جبکہ قیاس یہی چاہتا ہے کہ قہقہہ نواقض وضو سے نہیں۔ پھر بھی جس حدیث پر اعتماد کیا گیا ہے وہ انتہائی ضعیف ہے۔

کھجور کے شیرہ سے وضو کا جواز، یہ بھی قیاس کے خلاف ہے۔ اور جس حدیث سے مسئلہ کشید کیا گیا ہے وہ بے حد ضعیف ہے۔

دس درہم سے کم قیمت کی چیز چرانے پر ہاتھ نہیں کٹتا۔ یہ حدیث بالکل ضعیف ہے۔

اقامت جمعہ کے لئے شہر ہونے کی شرط ضروری ہے۔ ورنہ قصبہ اور ٹاؤن میں جمعہ کا ہونا صحیح نہیں۔ جس روایت سے اخذ کی گئی ہے وہ بے حد ضعیف ہے۔

پانی کی طہارت کے متعلق جن آثار پر اعتماد کیا گیا وہ نہ قیاس پر مبنی ہیں اور نہ ہی کسی صحیح حدیث پر۔

مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: جس ذخیرہ کا یہ حال ہو اسے آپ سرکاری سطح پر لا کر لوگوں کو اس کے قبول کرنے پر کیوں مجبور کرانے کی کوشش فرماتے ہیں؟ ائمہ عراق اور فقہائے حنفیہ کی علمی خدمات اور ان کے فقہی کارناموں سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن بہت سی خوبیوں کے باوجود یہ قطعی نامناسب ہے کہ اسے خوانخواہ لوگوں پر مسلط کیا جائے۔ (مجموعہ رسائل: ۶۱)

تضعیف وتصحیح حدیث میں اختلاف اور وجوہات

یہ سوال عام کیا جاتا ہے کہ احادیث کی تصحیح وتضعیف میں بھی تو اختلاف ہے۔ اگر اجتہاد کا اس میں دخل نہیں تو پھر احادیث کی تصحیح وتضعیف میں یا رواۃ کی توثیق وتضعیف میں محدثین کیوں مختلف ہیں؟ جواب یہ ہے کہ جب محدث کسی حدیث کو صحیح، ضعیف یا موضوع کہے تو یہ اجتہادی نہیں بلکہ تحقیقی اور تخریجی مسئلہ ہے۔ یہ اختلاف مجتہدین کے اختلاف کی نسبت اجتہادی نہیں بلکہ تحقیقی اور تخریجی ہے۔ مثلاً:

۱۔ ایک حدیث کی دو سندیں ہیں جن میں ایک صحیح ہے اور دوسری ضعیف۔ دو محدثین میں سے ایک کو یہی حدیث ضعیف سند کے ساتھ ملی اور دوسرے کو صحیح سند کے ساتھ۔ ایک نے اسے ضعیف کہہ دیا اور دوسرے نے صحیح۔

۲۔ دونوں کو حدیث، ضعیف سند سے ہی ملی۔ ایک محدث نے کوشش کر کے اس کے مزید شواہد اکٹھے کر لئے۔ اس لئے اس نے کہا: یہ حدیث صحیح ہے دوسرے کو یہ شواہد نہ مل سکے وہ اسے ضعیف کہنے پر ہی مصر رہا۔ محدثین کی اصطلاح میں حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ کے یہی معنی ہیں۔

۳۔ دونوں محدثین کو شواہد مل گئے لیکن تضعیف کرنے والے نے اس کی تضعیف ایک خاص سند یا خاص متن کے اعتبار سے کی جیسے سنن ترمذی میں متنی غرابت کا اظہار یوں کیا گیا ہے: غَرِیبٌ بِهٰذَا اللَّفْظِ۔ اس لفظ یعنی اس مخصوص متن کے ساتھ یہ حدیث غریب ہے۔

۴۔ کسی امام ناقد نے راوی پر جرح کی۔ دوسرے محدث نے اس جرح کو دیکھ کر اس حدیث کی تضعیف کر ڈالی جبکہ جارح امام نے تحقیق کے بعد اس جرح سے رجوع کر لیا تھا جس کی اطلاع تضعیف کرنے والے محدث کو نہ ہو سکی۔

۵۔ رواۃ پر جرح وتعدیل بھی اسی طرح ہوئی۔ مثلاً کسی امام نے کسی راوی کے حالات کا پتہ لگایا تو اسے کوئی قابل جرح چیز نظر نہ آئی۔ بعد میں راوی نے اپنی عادات وحالات بدل دئے۔ اسی امام نے اب اسے مجروح قرار دے دیا۔ تلامذہ میں کچھ نے اپنے امام کے دونوں قول سنے۔ کچھ نے تعدیل سنی اور اسے عادل قرار دیا اور کچھ تلامذہ نے اس کی جرح اپنے شیخ سے سنی انہوں نے اس پر تنقید کی حالانکہ تعدیل وجرح کے دو الگ الگ اوقات تھے۔

۶۔ کبھی کسی راوی کے مفصل حالات نہیں ملتے مگر جو معلوم ہوا اس کی بناء پر اسے ایک امام نے عادل قرار دے دیا۔ جبکہ دوسرے امام نے اس کے حالات کو بخوبی جانا اور اس میں وہ باتیں پائیں جو قابل جرح تھیں۔ اس نے اس پر جرح کر دی۔

۷۔ اسی طرح حدیث کے ناسخ ومنسوخ اصولوں میں دیگر وجوہات دیکھی جا سکتی ہیں مگر یہ خیال رہے کہ تضعیف وتوثیق کا میدان مجتہد کا نہیں محدث کا ہے اور مجتہد کی نظر ادلّہ تے مسائل کی تحقیق پر ہوتی ہے۔ فقہاء کرام کے مابین جائز وناجائز کے استنباطی مسائل سبھی اجتہادی ہیں جن میں اختلاف بھی ہے۔ (ملخص از سیرۃ البخاری ۲۷۷)

☆☆☆☆☆

باب ۶

روایت کی خصوصیات واوصاف کے لحاظ سے احادیث کی تقسیم

علماء نے اس کی پانچ اقسام بتائی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

۱۔ روایت اقران: قرین کی جمع ہے قریبی ساتھی کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں وہ دو ساتھی جو عمر اور اسناد میں ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ عمر میں قربت سے مراد یہ ہے دونوں کی تاریخ پیدائش ایک دوسرے کے قریب ہو۔ اور اسناد میں قربت سے مراد دونوں ایک دوسرے کے شیوخ سے روایت کریں۔ جیسے: سلیمان التیمی، مسعر بن کدام سے روایت کرتے ہیں۔ دونوں قرین ہیں۔ مگر مسعر کی کوئی روایت سلیمان سے نہیں ملتی۔ امام ابن حجرؒ نے اس موضوع پر الأفنان فی روایة الأقران نامی کتاب لکھی۔

۲. مُدَبَّج: لغت میں یہ بمعنی تزیین ہے جو دِیْبَاجَتَيِ الْوَجْهِ سے مأخوذ ہے۔ چہرے کے گال کو کہتے ہیں۔ اصطلاح میں مدبَّج اسے کہتے ہیں کہ دو قرین ایک دوسرے سے روایت کریں۔ جیسے ام المؤمنین سیدہ عائشہ اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما دونوں ایک دوسرے سے روایت کرتے ہیں۔ یا امام احمد، امام علی بن المدینی ایک دوسرے سے روایت کرتے ہیں۔ یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ دونوں راوی ایک دوسرے کے برابر ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے مقابل بھی۔ امام دار قطنیؒ نے المدبَّج کتاب اسی موضوع پر لکھی ہے اور امام ابن حجرؒ کی کتاب التعریج علی التدبیج لکھی ہے۔

۳۔ روایۃ الأکابر عن الأصاغر: اس سے مراد ایک آدمی جو عمر یا مرتبے میں بڑا ہو یا دونوں میں بڑا ہو اور وہ اپنے سے کم عمر والے سے روایت کرے۔ یہی تین صورتیں ہی اس میں ہوتی ہیں۔

مثلاً: امام زہریؒ اور یحییٰؒ بن سعید انصاری کا امام مالکؒ سے روایت کرنا۔ جبکہ دونوں امام مالکؒ سے عمر میں بڑے ہیں۔ یا عبادلہ کا کعبؓ بن مالک سے روایت کرنا۔ جبکہ عبادلہ، علم اور حفظ کے اعتبار سے کعب سے بڑے ہیں۔ یا امام برقانیؒ کا امام خطیب بغدادیؒ سے روایت کرنا۔ جبکہ امام برقانیؒ عمر اور مرتبہ کے اعتبار سے بڑے ہیں۔ ابو یعقوب اسحٰق الوراق کی اس موضوع پر کتاب ہے جس کا نام مَا رَوَاهُ الْكِبَارُ عَنِ الصِّغَارِ وَالآبَاءُ عَنِ الأَبْنَاءِ ہے۔

۴۔ روایۃ الآباء عن الأبناء: سند حدیث میں والد کا نام ہو جو اپنے بیٹے سے روایت کرے۔ مثلاً: وائلُ بنُ داؤدَ عَنِ ابْنِهِ بَكْرِ بْنِ وَائِلٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَوْلَمَ عَلَى صَفِيَّةَ بِسَوِيْقٍ وَتَمْرٍ۔ اس موضوع پر امام خطیب بغدادی کی کتاب روایۃ الآباء عن الأبناء ہے۔

۵۔ روایۃ الأبناء عن الآباء: میں ایسا راوی ہو جو اپنے والد سے یا اپنے دادا سے روایت کرے۔ مثلاً: سالم بن عبد الله عن أبیه۔ یا اپنے والد سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرے جیسے: بهز بن حکیم عن أبیه عن جده۔ یا عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده۔ ابونصر وائلی کی اس موضوع پر ایک کتاب ہے: روایۃ الأبناء عن الآباء۔

راوی حدیث کی خصوصیت و وصف کے لحاظ سے حدیث کی تقسیم

۱۔ سابق ولاحق: لغت میں متقدم کو سابق اور متأخر کو لاحق کہتے ہیں۔ یعنی ایک راوی متقدم الوفات ہوتا ہے اور دوسرا متأخر الوفاۃ۔ اصطلاح میں: کسی شیخ سے روایت میں دو شاگرد مشترک ہیں۔ ان میں سے ایک کی موت دوسرے سے پہلے ہو جاتی ہے۔ اور دونوں کی وفات کے درمیان ایک لمبا عرصہ گذر جاتا ہے۔ جیسے: امام زہری سے ایک روایت میں امام مالک اور احمد بن اسماعیل السہمی باہم شریک ہوئے۔ امام زہری سن ۱۲۴ھ میں فوت ہوئے اور امام مالک ۱۷۹ھ میں جبکہ احمد السہمی ۲۵۹ھ میں فوت ہوئے۔ ان میں سابق امام مالک ہوئے اور لاحق احمد السہمی۔ دونوں کی وفات میں اسی سال کا فرق ہے۔ یہی حال امام بخاری (۲۵۶ھ) اور احمد بن محمد الخفاف (۳۹۵ھ) کا ہے یہ دونوں محمد بن اسحق السراج (۲۵۶ھ) کے شاگرد ہیں مگر دونوں کی وفات میں ایک سو انتالیس سال کا فرق ہے۔ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے السابق واللاحق نامی ایک کتاب لکھی ہے۔

۲۔ معرفۃ الأخوۃ والأخوات: یہ معلومات اس لئے کہ کہیں طالب علم یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ چونکہ دونوں کے والد کا نام ایک ہی ہے لہذا یہ دونوں بھائی ہیں۔ مثلاً: عبداللہ بن دینار اور عمرو بن دینار۔ جو انہیں نہیں جانتا وہ شاید یہ سمجھ بیٹھے کہ چونکہ دونوں کے والد کا نام ایک ہی ہے لہذا یہ دونوں بھائی ہیں جبکہ ایسا نہیں۔ اسی طرح محمد بن سیرین اپنے بھائی یحیی سے اور وہ اپنے تیسرے بھائی انس سے روایت کرتے ہیں جو ایک نادر روایت ہے۔ اس لئے صحیح بہن بھائیوں کے ناموں سے واقفیت ایک طالب علم کے لئے ضروری ہے۔

دو بھائیوں کی مثالیں: صحابہ میں عمرو بن العاص اور ہشام بن العاص یا عمر بن خطاب اور زید بن خطاب۔

دو تابعین کی مثال: عمر بن شرحبیل اور ارقم بن شرحبیل۔

تین بھائیوں کی مثال: علی، جعفر اور عقیل جو ابو طالب کے بیٹے ہیں۔

چار بھائیوں کی مثال: سہیل بن صالح السمان الزیات اور ان کے یہ بھائی: عبد اللہ، محمد اور صالح۔

پانچ کی مثال: آدم، عمران، محمد، سفیان اور ابراہیم یہ سب عیینہ کے بیٹے ہیں۔

چھ کی مثال: محمد، انس، یحیی، معبد، حفصہ اور کریمہ یہ سب سیرین کے بچے ہیں۔

سات کی مثال: نعمان، معقل، عقیل، سُوَید، سنّان، عبد الرحمٰن، اور عبد اللہ، مقرن کے بیٹے ہیں۔

تصنیفات: کتاب الأخوۃ از ابو العباس السرّاج، ابو المطرف اندلسی کی بھی اس نام کی کتاب ہے اور ابن المدینی، مسلم، ابوداؤد و نسائی جیسے ائمہ نے اس موضوع پر کتب لکھی ہیں۔

۳۔ معرفۃ المُھْمَل: أَھْمَلَ سے ہے جس کا معنی ہے اس نے چھوڑ دیا یا اس نے اس کا استعمال نہ کیا۔ اصطلاح میں اس سے مراد یہ کہ دو ایسے راوی جو اپنے نام میں یا اپنے اور والد کے نام میں یا اپنے، والد اور دادا کے نام میں متفق تھے یا نسبت میں متفق تھے مگر راوی ان میں امتیاز نہ کر سکا۔

کیا ایسا اہمال حدیث کی صحت کو متأثر کرتا ہے؟ جب دونوں راوی ثقہ ہوں تب تو حدیث کی صحت پر کچھ فرق نہیں پڑتا لیکن اگر ان میں ایک ثقہ ہو اور دوسرا ضعیف تو اس سے صحت حدیث پر فرق پڑتا ہے کیونکہ راوی نے صحیح حدیث کو ضعیف یا ضعیف کو صحیح بنا دیا ہوتا ہے۔ مثلاً:

دونوں راوی جب ثقہ ہوں: قَالَ الْبُخَارِیُّ: حَدَّثَنَا أَحْمَدُ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ وَھْبٍ۔ اس میں راوی احمد مہمل ہے مگر یا تو وہ احمد بن صالح ہیں یا احمد بن عیسی ہیں اور دونوں ثقہ ہیں۔ یا امام بخاری کا یہ کہنا: حدثنا محمد۔ یہ محمد یا تو محمد سلام بیکندی ہیں یا محمد بن یحیی ذہلی ہیں اور دونوں ثقہ ہیں۔

دونوں میں ایک ثقہ اور دوسرا ضعیف ہو: جیسے: راوی کا یہ کہنا: حدثنا سلیمان بن داؤد۔ یہ یا تو خولانی ہیں جو ثقہ ہیں یا پھر یمامی ہیں جو ضعیف ہیں۔

اس موضوع پر امام خطیب بغدادی کی ایک کتاب الْمُکَمَّل فِی بَیَانِ الْمُھْمَل ہے۔

۴۔ **مسلسل:** ایک شے کا دوسری شے سے ملاتے چلے جانا۔ مسلسل کہلاتا ہے۔ اصطلاح میں اسناد کے راویوں کی ایک ہی صفت یا ایک ہی حالت کا تسلسل سے بیان ہونا۔ مسلسل کہلاتا ہے۔ اور ایسی حدیث مسلسل ہوتی ہے۔ اس سے تدلیس وانقطاع ختم اور حفظ وضبط حدیث کا زیادہ اہتمام ہو جاتا ہے۔

اقسام:

أ. راویوں کے قول یا فعل میں تسلسل: جیسے: آپ ﷺ نے کچھ ارشاد فرمایا یا کوئی فعل کیا تو صحابی رسول بھی جب اس حدیث کو بیان کرے وہی کہے اور کرے اور یوں یہ سلسلہ نیچے تک چلتا جائے۔ جیسے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی یہ مرفوع حدیث:

لَا یَجِدُ الْعَبْدُ حَلَاوَةَ الإِیْمَانِ حَتّٰی یُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ وَحُلْوِّهٖ وَمُرِّهٖ۔ قَالَ: وَقَبَضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰی لِحْیَتِهٖ وَقَالَ: آمَنْتُ بِالْقَدْرِ۔ أخرجه الحاكم۔

یہ حدیث مسلسل ہے کیونکہ اس حدیث کے ہر راوی نے حدیث بیان کرنے کے بعد یہی فعل کیا اور پھر کہا: آمَنْتُ بِالْقَدْرِ۔

ب۔ روایت کی صفت میں تسلسل: جیسے روایت کرتے ہوئے ہر راوی سَمِعْتُ، حَدَّثَنَا یا عَنْ یا أخبرنا کہے۔ مثلاً: سَمِعْتُ فُلَانًا پھر اگلا بھی سَمِعْتُ فُلَانًا یہ تسلسل آخر سند تک رہے۔ یعنی سند میں سب راوی ایک ہی لفظ میں متفق ہو جاتے ہیں۔

اس موضوع پر کچھ کتب علماء نے لکھیں جن میں المسلسلات: از اسماعیل تیمی کی ہے۔ ایک اور کتاب الأحادیث المسلسلة از محمد بن عبد الواحد المقدسی کی اور المُسَلسلات الکبری از حافظ سیوطی کی اور جیاد المسلسلات از خطیب بغدادی۔

۵۔ **متفق ومفترق:** راویوں کے اپنے اور والد کے نام، کنیت اور نسبت یا اوپر تک سبھی خط اور لفظ یعنی لکھنے اور بولنے میں متفقہ ہوں۔ مگر لوگ مختلف ہوں۔ مثلاً: خلیل بن احمد چھ راویوں کے نام ہیں۔ خلیل بن احمد بصری نحوی، خلیل بن احمد مزنی، خلیل بن احمد اصفہانی، خلیل بن احمد سجزی، خلیل بن احمد بُستی مُہلبی، اور خلیل بن احمد شافعی۔

اس کا فائدہ یہ ہے کہ مشترک نام میں دو کو ایک ہی فرد نہ سمجھ لیا جائے۔ ثقہ اور ضعیف اگر کوئی ہو تو ان میں امتیاز

ہو جاتا ہے۔ ورنہ ثقہ کو ضعیف یا ضعیف کو ثقہ کہہ کر کئی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ یہ علم اس وقت بہت مفید ہے جب یہ مشترک راوی ہم زمانہ ہوں اور ان کے اساتذہ و مشائخ بھی مشترک ہوں۔

مہمل اور متفق و مفترق میں فرق: متفق اور مفترق میں یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں طالب علم دونوں کو ایک نہ سمجھے۔ اور مہمل میں یہ کہ کہیں طالب علم ایک کو دو نہ سمجھے۔

اس موضوع پر امام خطیب بغدادی نے ایک کتاب المتفق و المفترق لکھی جو مطبوع ہے۔ اور دوسری محمد بن طاہر مقدسی کی الأنساب المتفقه ہے۔

۶۔ مؤتلف ومختلف: أل ف اس کا مادہ ہے مانوس ہونا یا جمع ہونا اس کا مطلب ہے۔ اور مختلف متفق کی ضد ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں اس سے مراد: رواۃ کے نام، القاب، کنی یا انساب خط (لکھنے) میں ایک جیسے ہوں مگر تلفظ (پڑھنے) میں مختلف ہوں۔ چونکہ ابتداء میں تحریر بغیر نقطے کے ہوا کرتی تھی تو اس لئے اس میں اندازہ نہیں چلتا تھا بلکہ سماع پر ہی اعتماد کیا جاتا۔ جیسے: سَلَام و سَلَّام، البَزَّازُ اور البَزَّار وغیرہ۔ اس میں غلطی اگر حروف کی مثلاً جیم کو حاء سے بدل دیا ہو تو تصحیف اور اگر اعراب کی ہو مثلاً زبر کو زیر سے بدل دیا ہو تو تحریف کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء حدیث نے اس فن کو مزید نکھارا اور کتب میں تحریری طور پر اعرابی اور حرفی وضاحت کی۔ قدیم مخطوطات کو پڑھنے یا پڑھانے میں اس علم کی ضرورت پیش آئی تھی۔ امام علی بن المدینی فرماتے ہیں:

> أَشَدُّ التَّصْحِيْفِ مَا يَقَعُ فِي الأَسْمَاءِ وَوَجَّهَهُ بَعْضُهُمْ بِأَنَّهُ شَيءٌ لَا يُدْخِلُهُ الْقِيَاسُ، وَلَا قَبْلَهُ شَيءٌ يَدُلُّ عَلَيْهِ وَلَا بَعْدَهُ، وَلِأَنَّهُ يُخْشَى أَنْ يَظُنَّ الشَّخْصَانِ شَخْصًا وَاحِداً، إِذَا اتَّفَقَتِ الأَسْمَاءُ، وَفِي ذٰلِكَ مَا فِيْهِ خَلَطٌ مِنَ الرُّوَاةِ۔ بدترین تصحیف جو اسماء رواۃ میں واقع ہوتی ہے اور جسے بعض علماء نے تابل تو جیہ بھی سمجھا ہے کہ یہ ایسی شے ہے جس میں قیاس داخل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس سے قبل یا بعد کوئی شے ہے کیونکہ خدشہ یہ ہے کہ جب نام متفقہ ہوں تو کوئی دو شخصوں کو ایک نہ بنا لے۔ اور پھر اس میں رواۃ کی طرف سے اختلاط بھی ہے۔

اس فن کو صرف سماع سے سمجھا جا سکتا ہے۔ قیاس کی صورت میں غلطی کا امکان باقی رہتا ہے۔ اس موضوع پر عمدہ کتاب امام دارقطنی رحمہ اللہ کی ہے جس کا نام المؤتلف و المختلف ہی ہے۔ اسی طرح عبد الغنی بن سعید کی

کتاب بھی اسی نام سے ہے۔

۷۔ **متشابہ:** راویوں کے نام خط یعنی تحریر میں متشابہ ہوں مگر تلفظ میں مختلف ہوں۔ جیسے: محمد بن عَقیل اور محمد بن عُقَیل۔ پہلے نیسابوری ہیں اور دوسرے فریابی۔ اسی طرح راوی کا اور اس کے والد کا نام لفظ و خط میں متفقہ ہوتا ہے مگر نسبت میں مختلف۔ جیسے: محمد بن عبداللہ المخرمی اور محمد بن عبداللہ المخرمی۔ پہلے کی نسبت بغداد کے ایک محلے کی طرف ہے اور دوسرے کی نسبت مخرمہ کی طرف۔ اس تشابہ کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً:

أ. **ایک ہی راوی، مختلف ناموں اور مخصوص صفات سے بیان کیا گیا ہو:** جیسے: محمد بن السائب کلبی۔ ان کا نام کچھ علماء نے حماد بن السائب بھی بیان کیا ہے اور ان کی کنیت کچھ نے ابو النضر، کچھ نے ابوسعید اور کچھ نے ابوہشام بتائی ہے اسی طرح بعض نے انہیں ان کے دادا محمد بن جعفر کی طرف منسوب بھی کیا ہے۔ عبدالغنی بن سعید نے إیضاحُ الإشْکالِ نام سے یہ کتاب اسی موضوع پر لکھی ہے اور خطیب بغدادی رحمہ اللہ کی کتاب مُوَضِّحُ أوهامِ الجَمْعِ وَالتَّفْرِيقِ بھی ہے۔

ب. **جو راوی کنیت سے مشہور ہیں:** کنیت والدین ہی رکھتے ہیں۔ اس نوع کو جاننے سے مراد یہ ہے کہ راویوں کی ہمیں صحیح ناموں کی معرفت ہو جو اپنی کنیت میں زیادہ مشہور ہیں۔ کبھی راوی اپنی کنیت سے مشہور ہوتا ہے اسے اس سے اور اس کے غیر معروف نام سے لوگ یاد کر لیتے ہیں۔ جسے یہ علم نہیں اس پر اس راوی کا معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے وہ انہیں دو الگ الگ راوی سمجھتا ہے جب کہ ہوتا وہ ایک ہے۔

خطیب بغدادی رحمہ اللہ کی بہت معروف کتاب تلخیص المتشابہ فی الرسم۔ مطبوع ہے۔

جو اپنے نام سے معروف ہیں مگر کنیت ان کی ایک ہے: جیسے: سوائے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تینوں ائمہ کے نام مختلف ہیں مگر سب کی ایک ہی کنیت ابوعبداللہ ہے۔

جو کنیت سے زیادہ معروف ہیں: جیسے ابوبکر رضی اللہ عنہ جن کا نام عبد اللہ، ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ جن کا نام عبدالرحمٰن، یا ابوادریس الخولانی جن کا نام عائذ اللہ بن عبداللہ ہے۔

جن کا نام ہی ان کی کنیت ہے۔ یہ دو قسم کے ہیں:

جس کی کنیت سوائے اس کے نام کے اور کچھ نہیں جیسے: ابو بلال اشعری ان کا نام ان کی کنیت ہی ہے۔

جن کی کنیت ہے مگروہ نہیں جس سے کنیت والا نام ہے: جیسے ابوبکر بن عبدالرحمٰن کا نام ابوبکر ہے مگر کنیت ابوعبد الرحمٰن ہے۔

وہ راوی جس کے نام یا کنیت میں اختلاف ہے: مثلاً اسامہ بن زیدان کے نام میں کوئی اختلاف نہیں مگر ان کی کنیت میں اختلاف ہے۔ کچھ ابوزید کہتے ہیں اور کچھ ابوخارجہ۔ اسی طرح ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں جنکی کنیت میں کوئی اختلاف نہیں مگر نام کیا ہے اس میں بہت سے اقوال ہیں۔ صحیح ترین قول یہی ہے کہ ان کا نام عبدالرحمٰن تھا۔

وہ راوی جس کے نام اور کنیت میں اختلاف ہے: مثلاً: سفینہ جو آپ ﷺ کے مولی ہیں ان کے نام میں اختلاف ہے، کوئی عمیر، تو کوئی صالح اور کوئی مہران کہتا ہے اسی طرح ان کی کنیت کوئی ابوعبدالرحمٰن تو کوئی البختری کہتا ہے۔

جس کے نام اور کنیت میں اختلاف نہیں۔ جیسے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کا نام عبداللہ۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اسی طرح احمد بن حنبل جن کی کنیت ابوعبداللہ ہے ان میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔

جس کی کنیتیں بہت سی ہوں۔ جیسے ابن جریج ان کی دو کنیتیں ہیں: ابوالولید اور ابوخالد۔ اسی طرح کنیت تو معلوم ہو مگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ ان کا نام بھی ہے یا نہیں۔ جیسے ابوأناس صحابی رسول ﷺ۔

جس کا نام اپنے والد کی کنیت جیسا ہو۔ جیسے: اسحاق بن ابی اسحاق سبیعی۔ یا جس کی کنیت اپنے والد کے نام جیسی ہو۔ جیسے: ابواسحاق ابراہیم بن اسحاق مدنی۔

۸۔ القاب: لقب کی جمع ہے۔ ہر وہ صفت جو بندے کو بلند کر دے یا گرا دے یا اس میں تعریف و مذمت کا پہلو ہو لقب کہلاتا ہے۔ محدثین لقب میں مذمت اور غیبت کے پہلو کو ذکر کرنا ناجائز سمجھتے ہیں اور ایسے لقب کو جسے وہ شخص خود پسند کرتا ہو اور اس کا تعارف مقصود ہو اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ نیز اس لقب کی حقیقی وجہ معلوم ہوتی ہے جو اکثر و بیشتر اپنے ظاہری معنی سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ جیسے: **الضال**: یہ معاویہ بن عبدالکریم ثقفی کا لقب ہے انہیں اس لئے یہ لقب دیا گیا کہ وہ مکہ کے راستے میں کھو گئے تھے۔ اسی طرح **ضعیف**: عبداللہ بن محمد طرسوی کا لقب ہے جسمانی طور پر وہ بہت کمزور تھے مگر اپنی حدیث میں نہیں۔ یا **غنجار**: عیسی بن موسی تیمی کو یہ لقب اس لئے دیا گیا کہ ان کے گال بہت سرخ تھے۔ یا **بندار**: یہ ائمہ ستہ کے شیخ محمد بن بشار کا لقب ہے۔ خرید و فروخت خوب کرتے تھے۔ ان کا یہ عمل انہیں یہ لقب دے گیا۔ غندر: محمد بن جعفر بصری کا یہ لقب اس طرح

مشہور ہوا کہ اپنے استاذ عبدالملک بن جریج سے کسی سند پر بحث کی اور زیادہ بول رہے تھے تو اس پر انہوں نے کہا: أسکت یا غندر۔ شور مت مچاؤ، خاموش رہو۔ وغیرہ

فائدہ: اس طرح کے القاب کا فائدہ یہ ہوا کہ راوی اگر نام سے نہیں تو کم از کم لقب کے ذریعے پہچان لیا گیا۔ اور دو الگ شخص بھی نہ رہے۔ بلکہ وہ تو ایک ہی شخصیت ہوتی ہے۔ مگر جو شخص اپنے آپ کو کبھی ایک نام سے اور کبھی ایک لقب سے دو شخص باور کراتا ہے جبکہ ہے وہ ایک ہی شخص۔ محدثین اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ امام ابن حجر عسقلانی کی ایک کتاب نزھة الألباب فی الألقاب اس موضوع پر ہے۔ ابن الجوزی نے بھی کشف النقاب۔ کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ یہ دونوں چھپ گئی ہیں۔

۹۔ وہ راوی جو اپنے آباء کی بجائے کسی اور کی طرف منسوب ہو گئے: کچھ راوی ایسے بھی ہیں جو اپنے آباء کی بجائے دوسروں کی طرف منسوب ہو گئے۔ ان کی معرفت بھی علم حدیث میں بہت اہم ہے۔ تاکہ ان کی نسبت میں کوئی اشتباہ نہ رہے۔ جیسے: مقداد بن اسود۔ اسود ان کے والد نہیں بلکہ اسود نے انہیں متبنی بنایا تھا اور نہ ان کے والد کا نام عمرو ہے۔ اسی طرح کچھ راوی ایسے بھی ہیں جو بجائے والد کے اپنی والدہ کی طرف منسوب ہوئے۔ جیسے: ابن علیہ۔ یہ امام اسماعیل بن ابراہیم بن مقسم ہیں انتہائی ثقہ عالم ومحدث۔ مگر منسوب اپنی والدہ کی طرف ہوئے۔ اسی طرح عبداللہ بن مالک ابن بحسینہ بھی ہیں۔ جو ابن بحسینہ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ صحابہ کرام میں بھی معوذ ومعاذ ابنی عفراء کے نام سے معروف تھے۔ کچھ اپنے دادا یا دادی کی طرف منسوب ہوئے مثلاً محمد بن سائب بن بشر کلبی۔ یہ محمد اپنے داد کی نسبت سے زیادہ معروف ہیں۔ آپ ﷺ نے بھی غزوہ حنین میں اپنی نسبت اگر اپنے دادا محترم کی طرف کی تھی۔ دادی کی طرف یعلی ابن منیة اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ منسوب ہوئے۔ اان ناموں کے لکھنے کا اصول یہ ہے کہ اگر والد کے علاوہ کسی اور طرف نسبت ہو تو منسوب الیہ میں ابن کو الف کے ساتھ لکھنا ہوگا۔

۱۰۔ وہ راوی جو بظاہر کسی شے کی طرف منسوب ہوئے مگر درحقیقت وہ نہیں تھے: جیسے: خالد الحذاء۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ جوتیاں بناتے یا بیچتے تھے مگر ایسا نہیں تھا بلکہ وہ ان موچیوں کے ساتھ بیٹھا کرتے تو یہ صحبت انہیں حذاء متعارف کرا گئی۔ یا عقبة بن عمرو البدری یہ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ وہاں رہتے تھے۔ یزید الفقیر

بھی ایک راوی ہیں۔ یہ فقیر نہیں تھے بلکہ ان کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے میں جسے فقار کہتے ہیں چوٹ لگ گئی تھی جس کی وجہ سے فقیر کہلائے۔ یہ وضاحتیں اس لئے کی گئیں تا کہ راوی کے بارے میں کوئی وہم نہ ہو۔ اس موضوع پر امام سمعانی کی کتاب الأنساب اور ابن الأثیر کی اللباب في تهذیب الأنساب دونوں مطبوع ہیں۔

۱۱۔ المفردات: اس سے مراد کسی راوی کا ایسا نام، کنیت یا لقب جو کسی اور کا نہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ان اسماء، کنی اور القاب میں انسان سے تصحیف وتحریف واقع نہیں ہوتی کیونکہ ایسے نام وکنی اور القاب بہت کم رکھے یا بولے جاتے ہیں۔ جیسے: ناموں میں صُدَیّ بن عَجْلان، سَنْدَر الخَصِيّ، شَكَل بن حُمَید العَبْسِي، یہ صحابہ کرام میں سے ہیں اور غیر صحابہ میں سے: الدُّجَین بن ثابت اور نُفَیْر بن نُفَیر کی طرح کُنٰی میں: ابو العُشْرَاء الدارمی، ان کا نام اسامہ بن مالک تھا۔ اور أبو المُدِلّ ان کا نام معلوم نہیں اور أبو الحمراء جو رسول اللہ ﷺ کے مولی تھے ان کا نام ہلال بن حارث تھا۔

اور القاب میں: سفینہ جو رسول اللہ ﷺ کے مولی تھے ان کے نام وکنیت میں اختلاف ہے۔ سَحْنُون جو مشہور کتاب المُدَوَّنہ کے مؤلف ہیں ان کا نام عبدالسلام بن سعید تھا اور مَنْدَل جن کا نام عمرو بن علی تھا۔ ایک کتاب الأسماء المفردة اس موضوع پر لکھی گئی جس کے مؤلف احمد بن ہارون بردیجی ہیں۔

☆☆☆☆☆

مسائل وعقائد کے بارے میں کتب حدیث یا احادیث کے درجات اور فرق مراتب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ عقائد وایمانیات سے متعلق احادیث صحیحہ کو یہ کہہ کر ترک کر دیا جائے کہ یہ خبر واحد ہے لہذا اس سے عقائد وایمانیات نہیں لئے جاسکتے یا مسائل فقہیہ میں تیسرے یا چوتھے درجے کی کتب کو اول وثانی درجے (صحیحین اور سنن اربعہ) کی کتب پر ترجیح دی جائے اور ان سے مسائل اخذ کئے جائیں۔

وَإِنْ تَجِدْ عَيْباً فَسُدَّ الْخَلَلاَ ۔۔۔ جَلَّ مَنْ لاَ عَيْبَ فِيهِ وَعَلاَ

اگر تم کوئی عیب پاؤ تو یہ خلا پر کر دو ذات تو وہی ہے جو بے عیب ہے اور بلند وبالا ہے

باب ۷

تحمل حدیث اور اداء حدیث

سماع حدیث: شیوخ سے سماع حدیث کے خواہشمند طالب علم کے لئے کیا اور کون سی شرائط و آداب ہیں اور اس کے لئے کیا مناسب ہے کہ وہ روایت کا سماع کرے اور کس طرح اسے شیخ سے حاصل کرے تا کہ بعد میں دوسروں کو وہ حدیث روایت کر سکے۔ یہ سب سماع حدیث کا لازمہ ہیں۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ:

سماع حدیث کی ابتداء کب ہو؟ ایک طالب علم حدیث کا سماع کب کرے؟ س بارے علماء کے مختلف اقوال ہیں:

......تیس سال کی عمر میں۔ اہل شام اسی کے قائل ہیں۔

......بیس سال کی عمر میں۔ اہل کوفہ کی یہی رائے ہے۔

......دس سال کی عمر میں۔ یہ اہل بصرہ کا کہنا ہے۔

متاخر زمانہ میں مناسب یہی ہے کہ طالب علم کو سماع حدیث اسی وقت شروع کر دینا چاہئے جب اس کا سننا صحیح ہو۔ کیونکہ احادیث کتب میں ضبط شدہ ہیں جنہیں کوئی خطرہ نہیں۔

کیا صغرسنی میں سماع ہوسکتا ہے؟

کچھ علماء نے سماع کی حد پانچ سال عمر مقرر کی ہے جس پر عمل بھی رہا ہے جب کہ بعض نے عمر میں تمیز کو مشروط کرتے ہیں کیونکہ شیخ کی بات یا خطاب کو سمجھنا اور پھر اس کا جواب دینا ہی صحیح سماع ہے جو اس کی حد امتیاز ہے۔ ورنہ نہیں۔ نیز وہ دو اشخاص کے مابین تمیز بھی کر سکے کہ فلاں نے یہ بات کہی تھی اور فلاں نے یہ۔ مزید یہ کہ اسے طہارت ونجاست کے مابین فرق بھی معلوم ہو۔ یہ پہلی شرط ہے جو طالب حدیث کی صلاحیت پرکھنے کے لئے رکھی گئی ہے۔ بعض علماء کے نزدیک سات سال عمر مکمل ہونے پر بچہ ممیز ہو جاتا ہے مگر کیا ایسے بچے کا سماع درست ہوگا؟ اس بارے میں علماء کے دو قول ہیں۔

پہلا قول یہ ہے کہ سماع صغیر درست ہے اور جائز بھی۔ یہ رائے جمہور کی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ گو وہ مکلف نہیں

مگر اس کے لئے سماع فرض بھی نہیں۔صرف جواز کی حد تک صحیح کہا جا سکتا ہے بشرطیہ کہ وہ صغیر ممیز ہو۔

دوسرا قول علماء کا یہ ہے کہ سماع صغیر نا جائز ہے۔اس لئے کہ وہ مکلّف نہیں ہوتا خواہ ممیز ہی کیوں نہ ہو۔

ان آراء میں پہلی رائے کو محدثین کی اکثریت تسلیم کرتی ہے۔ان کے دلائل یہ ہیں: محمودؓ بن الربیع کہتے ہیں:

عَقَلْتُ مِنَ النَّبِیِّ ﷺ مَجَّةً مَجَّهَا فِی وَجْهِی وَأَنَا ابْنُ خَمْسِ سِنِیْنَ مِنْ دَلْوٍ۔ مجھے یاد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے میرے منہ پر ایک بار کلی کی تھی اور میں پانچ سال کا تھا۔(صحیح بخاری ح:۷۷)

اسی طرح ابن عباسؓ کی حدیث بھی تحمل صغیر کو جواز فراہم کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

أَقْبَلْتُ رَاكِباً عَلَى حِمَارٍ أَتَانٍ، وَأَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الإِحْتِلَامَ، وَرَسُولُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي بِمِنًى إِلَى غَيْرِ جِدَارٍ، فَمَرَرْتُ بَيْنَ يَدَيْ بَعْضِ الصَّفِّ، وَأَرْسَلْتُ الأَتَانَ تَرْتَعُ، فَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ، فَلَمْ يُنْكِرْ ذَلِكَ عَلَيَّ۔ میں ایک بار گدھی پر سوار ہوتا آیا ان دنوں میں بالغ ہونے کے قریب تھا۔رسول اکرم ﷺ منی میں نماز پڑھا رہے تھے اور آپ ﷺ کے آگے کوئی دیوار نہیں تھی۔ میں کچھ صف کے آگے سے گذرا اور پھر گدھی کو چرنے کے لئے وہیں چھوڑ دیا۔پھر صف میں شامل ہو گیا۔کسی نے بھی میری اس حرکت پر مجھے نہیں ٹوکا۔

ان دلائل کے ہوتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ جس بچے میں تمیز کا ملکہ نہیں اس کا تحمل بھی درست نہیں۔اسی طرح اگر کوئی بزرگ اپنی بزرگی کی وجہ سے تمیز کھو بیٹھے تو اس کا تحمل بھی درست نہ ہوگا۔

تحمل حدیث: عربی میں کسی معاملہ کا بوجھ اٹھانا اور ذمہ لینا اسے تحمل کہتے ہیں۔**اصطلاح میں:** شیخ واستاذ سے حدیث، اخذ کرنے اور لینے کو **تحمل حدیث** کہتے ہیں۔اور

اداء: عربی میں کسی شے کو پہنچانا اور اسے مکمل کرنا۔**اصطلاح میں:** تحمل حدیث کے بعد اسے روایت کرنا اداء کہلاتا ہے۔

شرائط: محدثین نے حدیث سیکھنے اور پڑھنے والے کے لئے تین شرائط کا ہونا لازمی قرار دیا ہے۔

۱۔تمییز: کہ راوی خطاب کو سمجھ سکے اور اس کا جواب بھی درست دے سکے۔

۲۔عقل: دوسری شرط طالب علم کا عاقل ہونا ہے۔مجنون اور غنودگی والے کا تحمل درست نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ عاقل نہیں۔

۳۔ **موانع سے محفوظ ہو:** وہ چیز جو طالب علم کو تحمل حدیث سے روکتی ہو جیسے: اونگھ، بڑبڑانے کی عادت یا مصروف شخص۔

اس تحمل حدیث کی آٹھ اقسام ہیں۔ جن میں پہلے دو زیادہ مقبول ہیں۔:

ا۔ **سماع:** (Reading by the teacher) یہ پہلا طریقہ ہے کہ شیخ حدیث پڑھے اور طالب علم سنے۔ اس طریقہ میں:

...... شیخ، اپنی مرویات کو اپنے حفظ و یادداشت سے پڑھتے جس کی دوسری صدی ہجری میں عام ریت تھی مگر طالب علم کو اپنے شیخ کے ساتھ بہت عرصہ رہنا پڑتا تھا۔

...... یا شیخ اپنی کتاب سے احادیث پڑھتے یا کسی ذہین طالب علم کی منقول کتاب سے پڑھتے جو اس نے اپنے شیخ کی کتاب سے کی یا شیخ کی کتب سے انتخاب کیا ہوتا۔

...... یا طالب علم، شیخ سے علمی نشست کے دوران حدیث سے متعلق سوالات کرتے اور شیخ اس کے جوابات دیتے۔ یا طالب علم حدیث کا ابتدائی حصہ شیخ کو سناتا اور باقی حصہ شیخ خود مکمل کر دیتے۔

...... یا شیخ اپنی احادیث کو املاء کرادیتے۔ سیدنا واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ پہلے صحابی ہیں جو احادیث رسول کو املاء کرایا کرتے۔ ابتداء میں اس طریقہ کار کو بہت سہل سمجھ کر چھوڑ دیا گیا مگر امام زہریؒ نے اسی طریقہ کو ہی اپنایا جو طالب علم حدیث لکھتا اسے احادیث املاء کراتے۔ املاء عموماً حافظے سے ہوا کرتی۔ ایک اچھا کاتب منتخب کیا جاتا جو شیخ کی ادائیگی کی رفتار سے احادیث لکھ سکتا۔ دوسرے طلبہ اس کی کتابت کی غلطیوں کو پکڑتے بھی تھے۔ اس طرح یہ لکھی ہوئی کتاب طلبہ حدیث مستعار لے کر اس سے اپنی اپنی نقول تیار کرتے۔ یہ نقول بعد میں طلبہ آپس میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے دہراتے بھی یا شیخ کو سنا کر درست کر لیا کرتے تھے۔

سماع کے ان طریقوں کا مقصد یہی ہوتا کہ شیخ کے منہ سے نکلے الفاظ سن کر انہیں لکھ لیا جائے تا کہ شیخ کی سند سے انہیں روایت کیا جا سکے۔ مشائخ سے تحمل حدیث کی یہ اعلیٰ ترین نوع ہے۔

لفظ اداء: جب طالب علم سماع کے بعد اپنے شیخ کی ان احادیث کو روایت کرتا تو اس کے الفاظ کی ادائیگی یہ ہوتی:

سَمِعْتُ، حَدَّثَنَا، أَخْبَرَنَا، أَنْبَأَنَا یا حَدَّثَنِي، أَخْبَرَنِي، أَنْبَأَنِي وغیرہ۔جمع کے صیغے کا مطلب ہے: طالب علم نے اپنے شیخ سے حدیث دیگر طلبہ وحاضرین کی موجودگی میں سنی تو حَدَّثَنَا، أَخْبَرَنَا، أَنْبَأَنَا کے کلمات کہے۔ اور اگر اکیلے میں سنی تو زیادہ محتاط لفظ سمعتُ ہی ہے ورنہ حَدَّثَنِي، أَخْبَرَنِي، أَنْبَأَنِي کے الفاظ کہے۔امام صالح بن ابراہیم سے دریافت کیا گیا: حَدَّثَنَا، أَخْبَرَنَا اور أَنْبَأَنَا میں کسے استعمال کیا جائے؟ انہوں نے جواب میں کہا: حَدَّثَنَا کا استعمال زیادہ بہتر ہے۔ابن رجب کہتے ہیں:

وَكَانَ أَحْمَدُ يَسْتَنْكِرُ دُخُولَ التَّحْدِيثِ فِي كَثِيرٍ مِنَ الأَسَانِيدِ وَيَقُولُ: هُوَ خَطَأٌ يَعْنِي ذِكْرَ السَّمَاعِ۔امام احمد بہت سی اسانید میں حدثنا حدثنا کے لفظ کے دخول کو ناپسند فرماتے۔اور فرمایا کرتے: یہ غلط ہے یعنی سماع کا ذکر کرنا راوی کی غلطی ہے۔

ابن رجب نے اس موضوع پر مزید یہ لکھا ہے: مناسب یہی ہے کہ ان امور پر اہل علم غور کریں محض اسانید میں یا حدیث بیان کرتے وقت حَدَّثَنَا جیسی سماعی وضاحت سے دھوکہ نہ کھائیں۔امام ابن المدینیؒ نے کہا ہے: امام شعبہ بن الحجاج کی روایات میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن میں وہ اپنے شیوخ سے روایت کرتے ہیں مگر وہ منقطع ہوسکتی ہیں۔

۲۔**قِرَاءَۃٌ عَلَى الشَّيْخِ**:(Reading by the students) استاذ سے علم حدیث حاصل کرنے کا یہ دوسرا طریقہ ہے جسے عرض بھی کہتے ہیں۔طالب علم یا کوئی اور شیخ کی مرویات پڑھے اور شیخ سنیں۔خواہ یہ پڑھنا حفظ سے ہو یا کتاب سے۔یا خواہ شیخ پڑھنے والے کی متابعت اپنے حفظ سے کرے یا اپنی کتاب کو خود تھام لے۔جب کہ دوسرے طلبہ کمال ہوشیاری سے ان احادیث پر گوش برآواز ہوتے اور اپنے نسخے کے ساتھ ان کا مقابلہ کئے جاتے۔دوسری صدی ہجری کی ابتداء میں یہ طریقہ خاصا مقبول ہوا۔بیشتر مشایخ،طلبہ کو اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ دیتے جسے وہ اپنے لئے لکھ بھی لیتے۔بصورت دیگر شیخ کی اصل کتاب کے پہلے سے نقل شدہ صحیح نسخے سے ہی پڑھ لیتے۔کتاب کا جتنا حصہ وہ روزانہ پڑھتے یہ ایک مجلس کہلاتی اور اس جگہ وہ قلم سے گول دائرہ بنا دیتے تاکہ یاد رہے کہ اگلی مجلس میں یہاں سے پڑھنا ہے۔اس طرح کتاب کے اختتام تک اندازہ بھی ہوجاتا کہ شیخ کے ساتھ اس کتاب کو پڑھنے میں کل کتنی مجالس ہوئیں؟اگر ایک طالب علم ان احادیث کو کتب میں پاتا تو بھی اسے یہ اجازت

نہ تھی کہ وہ شیخ کے نام سے ان احادیث کو روایت کرے جب تک وہ انہیں شیخ پر پڑھ کر ان کی روایت کرنے کی اجازت نہ لے لیتا۔ ورنہ اسے سارِق الحدیث کہہ دیا جاتا۔ کاپی رائٹ کے قوانین اس زمانہ میں یہی ہوا کرتے۔

لفظ اداء: شیخ سے جب طالب علم اس طریقہ سے روایت کرے تو پھر وہ یوں کہے: أَخْبَرَنِي أَوْقَرَأْتُ عَلَى فُلَانٍ، مجھے فلاں نے خبر دی یا میں نے فلاں شیخ پر یہ احادیث یا کتاب پڑھی۔ اور اگر کسی اور نے کتاب یا حدیث پڑھی ہوتی اور یہ طالب علم خود سنتا تو پھر یوں کہتا: قُرِئَ عَلَى فُلَانٍ وَأَنَا أَسْمَعُ فلاں شیخ پر یہ احادیث یا کتاب پڑھی گئی اور میں سن رہا تھا۔ یا پھر حَدَّثَنَا أَوْ أَخْبَرَنَا قِرَاءَةً عَلَيْهِ۔ کہے۔ بیشتر محدثین أَخْبَرَنَا یا أَخْبَرَنِي سے یہی مراد لیتے ہیں۔

نوٹ: طالب علم کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ حدیث کو ویسے ہی ادا کرے جیسے اس نے شیخ سے سنا۔ یہ بالکل نامناسب بات ہوگی کہ ادائیگی کے صیغوں میں ردوبدل کر دیا جائے۔ یعنی حَدَّثَنِي کو أَخْبَرَنِي میں یا سَمِعْتُ میں بدلنے کی کوئی کوشش نہ کرے۔ وجہ یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک ہر اصطلاح کے الگ الگ معانی ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے منقول ہے: اتَّبِعْ لَفْظَ الشَّيْخِ فِي قَوْلِهِ حَدَّثَنِي وَحَدَّثَنَا وَسَمِعْتُ وَأَخْبَرَنَا وَلَا تَعْدُهُ۔ تم لفظ شیخ کو اسی کے قول میں ادا کرو۔ مثلاً اس نے حَدَّثَنِي، حَدَّثَنَا، سَمِعْتُ یا أَخْبَرَنَا کہا تو تم بھی وہی کچھ کہو اس سے تجاوز نہ کرو۔

۳۔ اجازہ (Permission to transmit): یہ روایت حدیث کا ایک سرٹیفکیٹ ہے جو شیخ اپنے اہل شاگرد کو یا شاگردوں کو اپنی کتب کی یا اپنی بعض مرویات کی روایت کی اجازت کے طور پر دیتا۔ یہ سرٹیفکیٹ کبھی شیخ خود لکھتا یا کبھی صرف منہ سے کہہ دیتا کہ أَجَزْتُ لَكَ أَنْ تَرْوِيَ عَنِّي مَرْوِيَّاتِي أَوْ مُؤَلَّفَاتِي۔ میں تمہیں اپنی کتب یا مرویات کی روایت کی اجازت دیتا ہوں۔ اس میں یہ بھی ضروری نہیں کہ شاگرد نے وہ کتاب شیخ کو پڑھ کر سنائی ہو یا شیخ سے سنی ہو۔

اجازہ کا یہ سلسلہ اس لئے قائم ہوا تاکہ حدیث یا اصل کتاب محفوظ رہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہ آنے پائے۔ جمہور محدثین کے نزدیک روایت حدیث، اجازہ کے ساتھ جائز ہے کیونکہ اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر ابن حزمؒ اسے بدعت کہتے ہیں۔

لفظ اداء: بہتر یہی ہے کہ مجاز لہ اداءِ حدیث کے وقت یوں کہے: أَجَازَ لِيْ فُلَانٌ۔ مجھے فلاں نے اجازت دی۔ یوں کہنا بھی معیوب نہیں: حَدَّثَنِي أَوْ أَخْبَرَنِي فُلَانٌ إِجَازَةً۔ مجھے فلاں نے حدیث بیان کی یا خبر دی اجازت سے۔ یا متاخرین کی اصطلاح کے مطابق یوں کہے: أَنْبَأَنَا یا أَنْبَأَنِي۔ ہمیں خبر دی یا مجھے خبر دی۔ ایسی اجازت کی صحت کے لئے تین شرطوں کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ جس چیز کی اجازت دی جا رہی ہے وہ یا تو متعین صورت میں معلوم ہو جیسے: میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم مجھ سے صحیح بخاری روایت کرو۔ یا عمومی صورت میں ہو جیسے: میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم میری تمام مرویات روایت کرو۔ اس لئے وہ طالب علم جس کے پاس اپنے شیخ کی ثابت شدہ مرویات ہوں وہ ان کی روایت کر سکتا ہے۔

اگر مجاز بہ مبہم ہے تو پھر روایت کرنا جائز نہیں ہوگا مثلاً: میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم صحیح بخاری کے کچھ حصے مجھ سے روایت کر سکتے ہو۔ یا میری کچھ مرویات روایت کر سکتے ہو۔

۲۔ جسے اجازت دی جا رہی ہے وہ موجود ہو۔ معدوم کی اجازت تبعاً یا مستقلاً درست نہیں ہوگی۔ مثلاً اگر شیخ یوں کہے: میں تمہیں اجازت دیتا ہوں اور تیرے ہونے والے بچوں کو بھی یا میں فلاں کے ہونے والے بچوں کو بھی اجازت دیتا ہوں۔

۳۔ جسے اجازت دی جا رہی ہے مجاز لہ کہلاتا ہے۔ ایسا بندہ یا تو معین شخص ہو یا اس کی صفت معین ہو جیسے: میں تمہیں اور فلاں کو اپنی مرویات کی روایت کی اجازت دیتا ہوں۔ یا میں اپنے طلبہ حدیث کو اپنی مرویات کی روایت کی اجازت دیتا ہوں۔ اگر یہ اجازت عام ہوئی تو پھر درست نہیں ہوگی جیسے: میں تمام اہل اسلام کو اپنی مرویات کی اجازت دیتا ہوں۔

ایک رائے یہ بھی ہے: کہ معدوم اور غیر معین کو اجازت مرویات دینا درست ہے۔

مُجاز لہ کی شرط یہ ہے کہ وہ واقعی اس کا اہل ہو۔ اور طالب علم کا نسخہ کتاب اپنے شیخ کی اصل کتاب سے مقابلہ شدہ بھی ہو۔ اس کتاب کی ادائیگی پھر ان الفاظ میں کرے: أَخْبَرَنِي فُلَانٌ إِجَازَةً یا فِيْمَا أَجَازَنِي وغیرہ۔

۳۔ مناولہ: (Granting books) یہ دو قسم کی ہے۔

مناولہ اجازہ کے ساتھ: یعنی شیخ طالب علم کو کتاب دے اور اسے کہے: هَذَا رِوَايَتِيْ عَنْ فُلَانٍ فَارْوِهِ عَنِّي۔ یہ میری فلاں سے روایات ہیں تم انہیں مجھ سے روایت کرو۔ اس طرح کی اجازت محدثین کرام نے جائز قرار دی ہے۔ جیسے امام زہریؒ (م: ۱۲۴ھ) اپنی کتب شاگردوں کو تھماتے ہوئے فرماتے۔ جن میں امام الثوری، الاوزاعی اور عبید اللہ

بن عمر جیسے نامی گرامی محدثین کرام ہیں۔ یہی صحیح طریقہ تحمل ہے۔ دوسری صدی کے شروع میں یہ صورت بہت ہی نادر تھی۔

مناولہ بغیر اجازۃ کے: یہ اس طرح کہ شیخ کتاب طالب علم کو دے اور کہے: یہ میرا سماع ہے۔ کیا اس کتاب کی روایت جائز ہے؟ جمہور محدثین اور فقہاء کہتے ہیں کہ جائز نہیں مگر کچھ جواز کے قائل ہیں۔

الفاظ اداء: شیخ نے کتاب دیتے وقت اجازت بھی دی ہو تو ادائیگی کے وقت افضل ہے کہ طالب علم یوں کہے: فِيْمَا نَاوَلَنِي وَأَجَازَنِي ۔یعنی مناولہ اور اجازہ دونوں کو جمع کرلے۔

۵۔ کتابہ:(Correspondence) شیخ اپنے خط سے یا کسی کو کہہ کر اپنی احادیث یا اپنی مسموعات لکھ کر اپنے ثقہ طالب علم کو بھیجے اور اسے روایت کرنے کی اجازت دے۔ اور یہ لکھے کہ کَتَبَهُ إِلَيَّ فُلَانٌ إِجَازَةً۔ فلاں نے یہ اجازت لکھی ہے۔ یا فلاں نے شیخ کی اجازت سے یہ لکھا ہے۔ ایسی صورت میں اس لکھے کی روایت بقول امام بخاریؒ بلا خلاف جائز ہوگی۔ ورنہ نہیں۔

لفظ اداء: طالب علم کے الفاظ ادائیگی پھر یہ ہوں گے: کَتَبَ إِلَيَّ فُلَانٌ۔ یا حَدَّثَنِي فُلَانٌ كِتَابَةً یا أَخْبَرَنِي فُلَانٌ كِتَابَةً۔ اس عمل کو کتابت کہا گیا۔ یہ فاصلاتی نظام تعلیم تھا جو دور بیٹھے طلبہ کے لئے پہلی صدی ہجری میں ہی وجود میں آیا۔

ابوطاہر السلفیؒ لکھتے ہیں: کتابت اجازت کی دلیل یہ ہے: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَتَبَ إِلَى كِسْرَى وَقَيْصَرَ...... تو یہ ان کے حق میں آپ ﷺ کی اجازت ہے۔ (الوجیز) اور متعدد صحابہ۔۔ جن میں خلفاء اربعہ بھی شامل ہیں۔۔ نے ایک دوسرے کو احادیث لکھ کر بھیجیں جو بعد میں روایت بھی ہوئیں۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: یحیی بن سعید جب عراق جانے لگے تو مجھے انہوں نے کہا: اُنْتَقِطْ لِي مِائَةَ حَدِيثٍ مِنْ حَدِيثِ ابْنِ شِهَابٍ حَتَّى أَرْوِيَهَا عَنْكَ۔ میرے لئے ابن شہابؒ کی احادیث میں سے سو احادیث چن کر لکھ بھیجیں تا کہ میں انہیں آپ سے روایت کروں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں: فَكَتَبْتُهَا ، ثُمَّ بَعَثْتُهَا إِلَيْهِ۔ پھر میں نے انہیں لکھا اور ان کی طرف یہ سو احادیث بھیج دیں۔

۶۔ اعلام الشیخ: (Announcement) جس سے مراد یہ ہے کہ شیخ اپنے شاگردوں یا طلبہ کو یہ بتائے کہ میں نے

فلاں سے یہ حدیث سنی تھی۔ یا یہ کتاب ہے اور اس کی روایت کی اجازت میرے پاس اس کے مصنف کی طرف سے ہے۔ لہٰذا تم: اِرْوِهِ عَنِّیْ: تم اسے مجھ سے روایت کرو۔ اس صورت میں اس کتاب یا حدیث کی روایت بلا خلاف محدثین، فقہاء اور اصولیین کے نزدیک جائز ہے بشرطیکہ اصل کتاب مصنف کے دستخط اور اجازہ سرٹیفکیٹ کے ساتھ میسر ہو۔ ورنہ نہیں۔

لفظ اداء: شاگرد ادائیگی کے وقت یوں کہے: فِيمَا أَعْلَمَنِي شَيْخِي أَنَّ فُلَاناً حَدَّثَهُ۔ میرے شیخ نے مجھے اطلاع دی کہ فلاں نے اسے یہ احادیث بیان کیں۔

۷۔ وصیۃ: (Bequest of books) یہ ہوتی ہے کہ شیخ اپنے سفر سے یا اپنی موت سے قبل کسی ثقہ طالب علم کو اپنی کتاب تھماتے ہوئے یہ وصیت کرے کہ وہ اسے روایت کردے یا کسی کے لئے لکھ دے۔

ابوقلابہ (م:۱۰۴ھ) جب شام میں فوت ہوئے تو اپنی کتب کی وصیت ایوب کے لئے کر گئے۔ کجاوے کے برابر یہ کتب جب ان کے پاس پہنچیں تو ایوب کہتے ہیں میں نے محمد بن سیرین سے کہا: میرے پاس ابوقلابہ کی کتب پہنچی ہیں کیا میں ان سے حدیث بیان کروں۔ انہوں نے کہا: ہاں۔ پھر فرمانے لگے: نہ میں تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ ہی اس سے روکتا ہوں۔ اس لئے اگر طالب علم کے پاس اس شیخ کی اجازت حدیث پہلے سے ہی ہے تو وہ ایسی کتب کو روایت کرسکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ علماء نے اسے مناولہ یا اعلام سے ملتی جلتی صورت قرار دے کر جائز کہا ہے۔

لفظ اداء: جسے وصیت کی گئی ہے وہ بعد میں یوں ادا کہے: فِيمَا أَوْصَى إِلَى فُلَانٍ بِكِتَابِ كَذَا، أَخْبَرَنِي فُلَانٌ وَصِيَّةً۔ فلاں نے مجھے اس کتاب کے بارے میں وصیت کی تھی۔ یا فلاں نے مجھے وصیت کرتے ہوئے اس حدیث یا کتاب کی وصیت کی تھی۔

۸۔ وجادۃ: (Discovery of books) یہ ہے کہ کسی معروف شخص کے ہاتھ کی لکھی کتاب حدیث کوئی پائے جس کا نہ تو اس نے سماع کیا ہو، نہ اجازت لی ہو، اور نہ ہی مناولۃً حاصل کی ہو۔ تو کیا وہ ایسی احادیث کو روایت کرسکتا ہے؟ کیونکہ یہ حدیث سیکھنے کا طریقہ نہیں۔

لفظ اداء: جمہور محدثین کہتے ہیں کہ جو ان احادیث یا کتب کو روایت کرنا چاہتا ہے اسے دوٹوک اور واضح الفاظ میں کہنا چاہیے: وَجَدْتُ فِي كِتَابِ فُلَانٍ قَالَ حَدَّثَنَا فُلَانٌ۔ میں نے فلاں کی کتاب میں پایا کہ ہمیں حدیث بیان کی فلاں نے۔ تو پھر کوئی معیوب بات نہیں۔ لیکن اگر صرف حَدَّثَنَا کہے گا تو پھر نا جائز ہوگا اور معیوب بات ہوگی۔ ایسی

کتاب یا احادیث کی ادائیگی کے وقت یوں کہے: وَجَدْتُ فِی کِتَابٍ أَوْ بِخَطِّ فُلانٍ۔ میں نے فلاں کی کتاب میں پایا۔

نوٹ: بغور دیکھا جائے تو یہ ایک پورا تعلیمی وتربیتی نظام ہے جس میں کلاس روم، استاذ وشاگرد کی موجودگی، علم حاصل کرنے کے مختلف طریقے، استاد کی مجلس حدیث اور حدیث کی روایت جسے شاگرد لکھتے جائیں یا شاگرد پڑھے اور استاد سنتا جائے اور تصحیح کرتا جائے۔ قلم ودوات، کاغذ، کتابت کے اصول، املاء شیخ، مستملی، بعد از مجلس کتابت کی غلطیوں کی اصلاح، پروف ریڈنگ، نسخوں کا باہم مقابلہ، اور پھر کتاب کے ختم ہوتے ہی ہزاروں نسخوں کا وجود میں آجانا، سرٹیفکیٹ لکھنے کا طریقہ، اس کا حصول، استاد کی وضاحت، تصدیق اور دستخط، اس کے حصول پر شاگردوں کی خوشی، بڑے عالم یا امام سے سرٹیفکیٹ کے حصول کے بعد اس کا مقام، شاگردوں کا اسے حاصل کر کے پھر اپنے اپنے علاقوں میں جا کر اسے آگے پھیلانا، سند سسٹم کا بن جانا۔ فاصلاتی نظام تعلیم، استاذ وشاگرد کا گہرا تعلق، اور ایک دوسرے پر فخر وخوشی۔ مسلمانوں نے ہی اس کو متعارف کرایا جو آج بھی تعلیم کے جدید طریقوں کے لئے اجنبی نہیں ہے بلکہ یہی قابل قبول ہے۔ صرف زبانی روایت کا الزام درست نہیں۔

رموز حدیث: تحمل حدیث کے بعد محدثین نے ادائیگی حدیث کے لئے کچھ کلمات بطور اصطلاح متعارف کرادیے ہیں جن کا جاننا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ عبد السلام ہارون لکھتے ہیں:

وهُنَاكَ رُمُوزٌ وَاخْتِصاراتٌ لِبَعضِ الكلماتِ أَوِ العِباراتِ نَجِدُها فِي الْمَخطوطاتِ الْقَدِيمةِ وَلَا سِيَّمَا فِي كُتُبِ الحديثِ، وَهَذا مِمَّا سَبَقَ بِهِ أَسْلافُنَا الْعَرَبُ۔۔۔ وَقَلَّدَهُمْ فِي ذَٰلِكَ الْفَرَنْجَةُ۔ قدیم مخطوطات بالخصوص حدیث کے مخطوطات میں کچھ ایسی عبارات اور کلمات کو مختصر رمزی صورت میں لکھا گیا ہے جسے ہمارے اسلاف علماء عرب نے استعمال کیا اور جسے آج فرنگی اپنا چکا ہے۔ (تحقیق النصوص ونشرہا:۵۲)

یہ اختصارات دوقسم کے ہیں:

ا۔ کسی بھی علم کے معروف عام اختصارات۔ ۲۔ خاص کتاب میں مؤلف کے اپنے اختصارات

محدثین نے کتاب میں بیان کردہ اسانید میں بکثرت آنے والے کلمات کو مختصر کردیا ہے اور کچھ کو حذف بھی کیا

ہے تاکہ بار بار کہنے یا لکھنے کی زحمت طالب علم کو نہ اٹھانی پڑے۔ بہر حال یہ مختصر اور مکسر عبارات ہیں جن سے کیفیت کتابت حدیث اور ان کے طریق تعلیم وتعلم کا علم ہوتا ہے۔ یہ اصطلاحات اب ایک فن کی صورت اختیار کر گئی ہیں اور نو واردوں کے لئے ان کا علم حد درجہ ضروری ہے۔ اگر چہ محدثین کی کتابت حدیث میں عام ریت تو یہی نظر آتی ہے کہ وہ حَدَّثَنَا وَأَخْبَرَنَا جیسے الفاظ کو مکمل لکھتے ہیں مگر کہیں کہیں رموز مزید مختصر کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ کلمات:

حدثنا، حدثني، أخبرنا ، أخبرني، أنبانا، أنبأني اور ح وغیرہ ہیں جنہیں محدثین عموماً اس ترتیب سے لکھتے ہیں:

......وہ حدثنا کو ثنا لکھتے ہیں۔ اور کبھی وہ ثاء کو بھی حذف کر دیتے ہیں اور صرف نا لکھتے ہیں اور کبھی وہ دال کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ جیسے دثنا...... اسی طرح وہ حدثني کو ثني یا دثني لکھتے ہیں۔ اور کچھ أرنا بھی راء کے ساتھ اس لئے لکھتے ہیں کہ کہیں اسے کوئی أنبأنا کا اختصار نہ سمجھ لے۔ اور أنبانا کو أنبا لکھتے ہیں۔

متقدمین میں امام بخاریؒ سمیت حَدَّثَنِي اور أَخْبَرَنِي میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ مگر متاخرین میں امام مسلم رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ حدیث حَدَّثَنِي اور أَخْبَرَنِي میں فرق کرتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔ اسی طرح سَمِعَ، عَنْ یا کچھ اور صیغے بھی محدثین کے استعمال میں ہیں جنہیں ہم نے تحمل حدیث کی اقسام کی تعریفات میں بیان کر دیا ہے۔

متعدد اسانید کے رمز: محدثین نے ایک اور قدم یہ اٹھایا کہ ایک ہی متن والی حدیث کی اگر دو یا دو سے زیادہ اسانید ہوں تو وہ انہیں ایک ہی متن میں جمع کر دیتے ہیں۔ اور دوسری سند کی مستقل پہچان کے لئے ح کا حرف لکھ دیتے ہیں جس سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ وہی حدیث اب ایک سند سے دوسری سند کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔ اسے حاء تحویل کہتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک ہی حدیث کی متعدد اسانید کو ایک ہی جگہ جمع کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ جب متن ایک ہی ہو اور اسانید مختلف تو ایک ہی متن کا بار بار تذکرہ کرنے کی بجائے اسے اختصار دینا زیادہ مفید اور علمی ہے۔ چنانچہ ایسے متعدد مقاصد کے لئے وہ سند کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور اپنے مختلف شیوخ، مختلف شہروں میں رحلہ اور عَنْعَنَة کو متصل ثابت کرنے کے لئے متعدد اسانید کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ح جو تحویل کا اختصار ہے۔ لکھ کر محدثین تحویل سند کا اشارہ دے دیتے ہیں کہ یہاں آ کر میں ان

دونوں اسانید کے ذریعے اس اوپر والے شیخ سے مل گیا ہوں۔ یہ سب اس لئے بھی لکھا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والا یہ وہم نہ کرے کہ شاید سند میں سقوط آ گیا ہے یا وہ ایک سند کو دوسری سند کے ساتھ ملا کر اسے ایک ہی سند نہ بنا لے۔اس لئے سند پڑھنے والا جب اس مقام پر پہنچے تو یا یوں کہے: حاء۔ یا کہے: تَحوِیل۔ اس رمز کے بارے میں علماء کے چار اقوال ہیں:

۱۔ یہ ح حائل سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ دو اسنادوں کے درمیان تحول پھیرنے کی ہے یہ حدیث میں شامل نہیں۔

۲۔ یہ حدیث سے ماخوذ ہے کیونکہ یہی ہمارے لفظ حدیث کا رمز بھی ہے۔

۳۔ یہ تحویل سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ ایک اسناد سے دوسری اسناد کی طرف پھرنے کا بتاتی ہے۔

۴۔ ابنؒ الصلاح نے لکھا ہے اور امام نوویؒ نے بھی بعض حفاظ حدیث مثلاً ابو مسلم لیثی اور ابو عثمان الصابونی کی تحریر میں ح کی جگہ صَحَّ کو لکھا پایا۔ ابنؒ الصلاح کہتے ہیں: یہ بہت ہی عمدہ انداز ہے تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ حدیث کی سند میں کوئی سقوط ہو گیا ہے یا اس لئے بھی تاکہ دوسری اسناد کو پہلی اسناد کے ساتھ ملا کر ایک ہی اسناد نہ بنا دی جائے۔ باقی اس رمز ح کو کیسے پڑھنا ہے؟ علماء کے چار اقوال ہیں:

۱۔ جب قاری اس رمز تک پڑھتے ہوئے پہنچ جائے تو کچھ نہ پڑھے بلکہ معمولی سکتہ دے کر اگلی سند پڑھنا شروع کر دے۔

۲۔ جب قاری اس رمز تک پہنچے تو کہے: الحدیث۔ یہ انداز اہل مغرب کا ہے۔

۳۔ جب قاری اس رمز تک پہنچے تو رمز حا کہے اور آگے چلتا جائے۔ یہ طریقہ امام ابن الصلاح اور امام نووی کا پسندیدہ ہے۔ ان تینوں اقوال کو ابن الصلاح اور نووی دونوں نے بیان کیا ہے۔

۴۔ قاری جب اس رمز ح تک پہنچے تو کہے: تحویل۔ علامہ قاسمی لکھتے ہیں: بعض مسند مشائخ جب دوران قرائت حدیث حا تک پہنچتے تو کہا کرتے: تحویل۔ مجھے ان کی یہ بات بہت بھلی اور مناسب حال لگی۔ (قواعد التحدیث: ۱۹۴)

محذوفہ کلمات: رجال سند کے درمیان (قال) اور (أنه) جیسے کلمات کو تکرار کی وجہ سے محدثین نہیں لکھتے مگر قاری کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ ان پوشیدہ کلمات کو پڑھے۔ رجال سند میں حذف کلمات کی مثال یہ سند حَدَّثَنَا أحْمَدُ، حَدَّثَنَا الشَّافِعِيُّ، أنا مَالِكٌ۔ ہے مگر یہ عبارت پڑھی اس طرح جائے گی: (قَالَ حَدَّثنا أحْمدُ،

قَالَ حَدَّثَنَا الشافِعِيُّ قَالَ حَدَّثَنَامَالِكٌ)۔اسی طرح (قُرِءَ عَلَی فُلَانٍ، حَدَّثَنَا فُلَانٌ) کو(قُرِئَ عَلَی فُلَانٍ قَالَ حَدَّثَنَا فُلَانٌ) پڑھیں گے۔یعنی ان پوشیدہ کلمات کا پڑھنا ضروری ہے۔تکرار کلمات کے حذف کی مثال:(حَدَّثَنَا صَالِحٌ قَالَ الشَّعْبِيُّ) کو یوں پڑھا جائے گا(قَالَ حَدَّثَنَا صَالِحٌ قَالَ قَالَ الشَّعْبِيُّ) ابنؒ الصلاح لکھتے ہیں: ان دونوں کلمات میں سے ایک کو خط میں یعنی لکھنے میں حذف کر دیتے ہیں اور قاری کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ ان سب کا تلفظ کرے۔

رہا لفظ(أَنَّهُ) اسے بھی محدثین نہیں لکھتے بلکہ پڑھتے ہیں۔مثلاً: (حَدَّثَنِي عَبدُ اللّٰهِ عَن عُمَرَ عَنْ رسولِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ) مگر اسے یوں پڑھیں:(حَدَّثَنِي عَبدُ اللّٰه بْنُ عُمَرَ عَنْ رسولِ اللّٰهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ) دوسری مثال:(قَالَ البُخارِيُّ: حدَّثَنا الْحَسَنُ بْنُ الصَّبَاحِ سَمِعَ جَعْفَرَ بْنَ عَونٍ) مگر یوں پڑھا جائے گا: (حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ الصَّبَاحِ أَنَّهُ سَمِعَ جَعْفَرَ بْنَ عَونٍ)۔

......اسی طرح ایک اور مصطلح مِثلَهُ یا نَحْوَهُ۔ بھی ہے۔محدث،حدیث کو روایت کرتے ہیں پھر اس کے پیچھے ہی ایک اور سند لگا دیتے ہیں اور پھر سند کے اختتام پر یہ کہہ دیتے ہیں: جس سے وہ پہلی حدیث مراد لیتے ہیں۔ (الکفایۃ:۳۱۹)اسی طرح محدثین کی اصطلاح میں یہ الفاظ۔۔وَبِهِ قَالَ حَدَّثَنَا۔۔ کے بارے میں امام قسطلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> إِذَا قَرَأَالْمُحَدِّثُ إِسْنَادَ شَيْخِهِ الْمُحَدِّثِ أَوَّلَ الشُّرُوعِ وَانْتَهَى، عَطَفَ عَلَيهِ بِقَولِهِ فِي أَوَّلِ الَّذِي يَلِيهِ۔۔وَبِهِ قَال حَدَّثَنَا۔۔ لِيَكُونَ كَأَنَّهُ أَسْنَدَهُ إِلَى صَاحِبِهِ فِي كُلِّ حَدِيثٍ، أَيْ لِعَوْدِ ضَمِيرِ (وبِهِ) عَلَى السَّنَدِ المَذْكُورِ، كَأَنَّهُ يَقُولُ: (وبِالسَّنَدِ المَذْكُورِ قَالَ) أَيْ صَاحِبُ السَّنَدِ لَنَا فَهَذَا مَعْنَى قَولِهِمْ: (وَبِهِ قَالَ)۔ جب محدث اپنے محدث شیخ کی سند کو اول تا آخر تک پڑھے، تو اس کے شروع میں یہ کہتے ہوئے عطف کرے: وبہ قال حدثنا۔ تاکہ وہ یوں ہوجائے گویا کہ اس نے ہر حدیث کی نسبت اپنے شیخ کی طرف کردی۔یعنی وبہ کی ضمیر کو سند مذکور کی طرف لوٹا کر۔گویا کہ وہ یوں کہہ رہا ہے: وبِالسَّنَدِ الْمَذْكورِ قال۔یعنی سند والے نے ہمیں یہ کہا۔محدثین کے اس قول وبہ قال کا یہی معنی ہے۔

امہات کتب کے قاری کے لئے ان رموز کا سمجھنا ضروری ہے تاکہ وہ اصل عبارت سمجھ پائے۔مگر بولتے وقت

اس اختصار کو مکمل لفظ میں پڑھی۔ اسی طرح تحریر میں بھی جو مستور ہے۔ اسے بھی پڑھے۔

اختصار حدیث: راوی حدیث یا اس کا ناقل، اگر حدیث سے کچھ الفاظ حذف کردے تو حدیث مختصر ہو جاتی ہے۔ مگر کیا ایسا کرنا جائز ہوگا؟ محدثین نے اس کے جواز کے لئے پانچ شرطیں بیان کی ہیں۔

۱۔ اختصار وہ درست و جائز ہوگا جس سے معنی حدیث متاثر نہ ہو اور حدیث کی اصل باقی رہے۔ جیسے استثناء، غایت، حال اور شرط کو عبارت سے حذف کردی جائے۔ مثلاً:

لَا تَبِيعُوا الذَّهَبَ بِالذَّهَبِ إِلَّا مَثَلًا بِمَثَلٍ۔ یا لَا تَبِيعُوا الثَّمْرَ حَتّٰى يَبْدُوَ صَلَاحُهُ، یا لَا يَقْضِيَنَّ حَكَمٌ بَيْنَ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانُ، یا نَعَمْ إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ۔ جو آپ نے خاتون کے سوال پر فرمایا۔ یا لَا يَقُلْ أَحَدُكُمْ: اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي إِنْ شِئْتَ۔ یا الْحَجُّ مَبْرُورٌ لَيسَ لَهُ الْجَزَاءُ إِلَّا الْجَنَّةُ۔

ان احادیث میں ہر حدیث کا آخری حصہ اگر گرا دیا جائے۔ مثلاً: إِلَّا مَثَلًا بِمَثَلٍ کو، یا حَتّٰى يَبْدُوَ صَلَاحُه کو، یا وَهُوَ غَضْبَانُ کو، یا إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ، یا إِنْ شِئْتَ کو، یا مَبْرُور وغیرہ کو حذف کر دیا جائے تو نہ حدیث سمجھ آئے گی اور نہ ہی کوئی علمی فائدہ ہوگا۔

۲۔ اختصار کے وقت ایسے الفاظ قطعاً حذف نہ کئے جائیں جن کے لئے حدیث بیان کی گئی ہو۔ جیسے: سمندری پانی کے بارے میں آپ ﷺ کا یہ فرمانا: هُوَ الطَّهُورُ مَاءُ هُ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهُ۔ اس میں راوی یا ناقل هُوَ الطَّهُورُ کو حذف کردے۔

۳۔ ایسا حذف بھی نہ ہو جس میں کسی قولی یا فعلی عبادت کی صفت بیان کی گئی ہو۔ جیسے: حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں آپ ﷺ نے تشہد میں یہ دعا پڑھنے کی تاکید فرمائی:

التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰاتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِينَ۔ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ۔

ایسے شرعی اوصاف سے مملو اذکار میں کسی قسم کے حذف کی اجازت نہیں۔

۴۔ یہ اختصار ایسے عالم کی طرف سے ہو جو حدیث کے الفاظ کے مفاہیم کو بخوبی جانتا ہو تاکہ وہ سمجھ جائے کہ کس لفظ کے حذف سے معنی میں خلل آتا ہے اور کس میں نہیں۔ ورنہ غیر عالم کے حذف سے معنی میں خلل آسکتا ہے۔

۵۔ راوی پر جھوٹ کا الزام نہ ہو ورنہ حدیث میں اس کا اختصار تردد پیدا کر دے گا کہ اس نے حدیث مکمل روایت بھی کی یا اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ کر دیا؟ غیر معروف کتب کے مطالعہ میں یہ تردد پایا جاتا ہے جسے اصل کتب کی طرف رجوع کر کے دور کیا جا سکتا ہے۔

جب یہ پانچوں شرطیں موجود ہوں تو حدیث میں اختصار جائز ہوگا۔ بالخصوص مناسب حال مقام پر حدیث کے ٹکڑے سے احتجاج لینے کے لئے حدیث کی تقطیع بھی جائز ہوگی جسے بہت سے محدثین اور فقہاء نے اپنایا ہے۔ امام ابن حجرؒ (فتح الباری ۱۱۴۱/۱) باب کُفْرَانِ الْعَشِيرِ، وَكُفْرٌ دُونَ كُفْرٍ کی شرح میں لکھتے ہیں:

أَنَّ الْبُخَارِيَّ يَذْهَبُ إِلَى جَوَازِ تَقْطِيعِ الْحَدِيثِ ، إِذَا كَانَ مَا يَفْصِلُهُ مِنْهُ لَا يَتَعَلَّقُ بِمَا قَبْلَهُ وَ لَا بِمَا بَعْدَهُ، تَعَلُّقاً يُفْضِي إِلَى فَسادِ الْمَعْنَى، فَصَنِيْعُهُ كَذَلِكَ يُوهِمُ مَنْ لَا يَحْفَظُ الْحَدِيثَ أَنَّ الْمُخْتَصَرَ غَيْرُ التَّامِ، لَا سِيَّمَا إِذَا كَانَ ابْتِدَاءُ الْمُخْتَصَرِ مِنْ أَثْنَاءِ التَّامِ كَمَا وَقَعَ فِي الْحَدِيثِ فَإِنَّ أَوَّلَهُ هُنَا قَوْلُهُ ﷺ: أُرِيْتُ النَّارَ۔۔ إِلَى آخِرِ مَا ذَكَرَ مِنْهُ، وَأَوَّلُ التَّامِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: خَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ ۔۔ فَذَكَرَ قِصَّةَ صَلَاةِ الْخُسُوفِ ثُمَّ خُطْبَةَ النَّبِيِّ ﷺ وَفِيهَا الْقَدَرُ الْمَذْكُورُ هُنَا۔ بخاری محترم حدیث کی تقطیع کو اس وقت جائز سمجھتے ہیں جب وہ جملہ حدیث سے الگ ہو اور اپنے ماقبل یا مابعد سے اس کا ایسا تعلق نہ ہو جو معنوی خرابی پیدا کر دے۔ امام محترم کے ایسا کرنے سے غیر حافظ شخص کو وہم ہو جاتا ہے کہ یہ مختصر حدیث نامکمل سی ہے۔ بطور خاص جب مختصر ٹکڑے کی ابتداء مکمل حدیث کے اثناء میں سے ہو۔ جیسا کہ اس حدیث میں ہوا ہے۔ کیونکہ یہاں جملے کی ابتداء آپ ﷺ کے اس ارشاد أریت النار سے ہو رہی ہے جبکہ مکمل حدیث کی ابتداء سیدنا ابن عباس سے مروی حدیث کی اس جملے سے ہو رہی ہے: خَسَفَتِ الشَّمْسُ۔۔۔۔

بہتر یہی ہے کہ اختصار حدیث کے وقت یہ کہتے ہوئے یا لکھتے ہوئے اشارہ کر دیا جائے: إِلَى آخِرِ الْحَدِيثِ۔ جس کا مختصر الخ ہے یا ذَكَرَ الحديثَ کہے۔

☆☆☆☆☆

باب ۸

حدیثی علوم کی انواع

امام ابن الصلاحؒ نے علوم حدیث کی کل 65 انواع بتائی ہیں اور ان کے بقول یہ حتمی انواع نہیں بلکہ مزید کی گنجائش بھی ہو سکتی ہیں۔ابن الملقن نے دوسو سے زائد انواع بتائی ہیں۔امام ابن حبان نے صرف ضعیف حدیث کی انچاس اقسام بتائی ہیں۔جنہیں مدغم کر کے کم بھی کیا جا سکتا ہے۔مگر ہر نوع کی اپنی مستقل حیثیت ہے۔اور اس پر کتاب بھی۔

۱۔**علم مختلف الحدیث**: اسے ختلاف الحدیث، تلفیق الحدیث، تأویل مختلف الحدیث، تأویل مشکل الحدیث وغیرہ بھی کہتے ہیں۔جس سے مراد: دو ایسی مقبول احادیث جو معنوی موافقت کے باوجود بظاہر متعارض ہوں جن کا جائزہ بغیر تکلف و اشکال کے ہو اور ان کے مابین تطبیق یا جمع کرنا ممکن ہو۔ابن الصلاح لکھتے ہیں:

اس بظاہر باہمی مخالفت کی نفی کر کے تطبیق دینا اور انہی دونوں احادیث کے مطابق فتوی دینا ہی تعارض کو رفع کرنا ہے۔(مقدمہ ابن الصلاح:۱۴۳)

ظاہر تعارض کا مطلب یہ ہے کہ سنت نبوی میں حقیقی تعارض محال ہے۔(الکفایۃ:۴۳۳)

مثال:۔صحیح بخاری میں حدیث سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ:

لَا عَدْوٰی وَلَا طِیَرَۃَ وَلَا هَامَةَ، وَلَا صَفَرَ، وَفِرَّ مِنَ الْمَجْذُوْمِ كَمَا تَفِرُّ مِنَ الأَسَدِ۔ بیماری کی چھوت، نہ بدفالی، اور نہ ہی الو اور نہ ہی کوئی صفر مہینے کی نحوست ہے۔اور مجذوم سے اس طرح بھاگو جیسا کہ شیر کو دیکھ کر بھاگتے ہو۔

اور پھر صحیح مسلم کی یہ حدیث:

لَا یُوْرَدُ مُمَرِّضٌ عَلَی مُصِحٍّ۔ بیمار کو صحت مند کے پاس مت لایا جائے۔

آپ ﷺ نے بدو کے اس سوال پر کہ:

أَرَأَيْتَ الإِبِلَ تَكُونُ فِي الرِّمَالِ أَمْثَالَ الظِّبَاءِ ، فَيَأْتِيهَا الْبَعِيرُ الأَجْرَبُ فَتَجْرَبُ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ : فَمَنْ أَعْدَى الأَوَّلَ؟ آپ یہ بتائیے کہ اونٹ جو صحرا میں ہرنیوں کے مانند پھلے ہوتے ہیں تو ان کے پاس ایک خارش زدہ اونٹ آ جاتا ہے اور دوسروں کو خارش ہو جاتی ہے؟ تو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو پہلے کو کس نے خارش زدہ کیا؟

جمع کی صورت: ان بظاہر متعارض احادیث میں علماء نے جمع کی صورت یہ نکالی ہے کہ معجزہ پر ایمان رکھنے والی قوم کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ (فعال لما یرید) اللہ تعالی ہی ہے۔ اسباب بھی اسی کے ہیں اور مسبب بھی وہی ہے۔ سبب ہو مسبب نہ ہو یہ بھی عام دیکھنے میں آتا ہے اسی طرح مسبب ہو مگر سبب نہ ہو یہ بھی ممکن ہے۔ ان احادیث میں ان خیالات کو ختم کیا گیا ہے جو عرب یا مختلف اقوام رکھتی تھیں کہ بعض بیماریاں متعدی ہوتی ہیں۔ نہیں بلکہ بیماری حکم الٰہی سے ہوتی ہے نہ کہ کسی کی چھوت لگنے سے۔ جس کی ایک دلیل یہ ہے کہ گھر میں ایک فرد نزلہ وزکام کی وجہ سے بیمار ہے تو باقی سبھی صحت مند ہیں۔ باقی شیر سے بھاگنے اور صحتمند کا بیمار کے پاس نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ متعدی کا عقیدہ غلط ہے کہ نتائج کو اسباب کے ساتھ جوڑ رہا ہے۔ یہ عقلی بات تو ہے کہ جو اسباب اللہ تعالی نے رکھے ہیں انہیں اختیار کرنے سے شریعت منع نہیں کرتی۔ مگر جو اللہ تعالی نے قدر میں لکھا ہے وہ بھی تو ہو کر رہے گا۔ اسی لئے جمع کے بعد دونوں احادیث محکم ہو جاتی ہیں۔ یعنی معارضت سے یہ محفوظ ہو جاتی ہیں۔ اکثر احادیث محکم ہی ہیں کوئی معارض نص نہ تو قرآن کریم میں ملتی ہے اور نہ حدیث میں خواہ وہ ظاہری ہی کیوں نہ ہو۔ اگر کہیں کسی کو تعارض یا اختلاف نظر آتا ہے تو یہ اس کے فہم کا ہے جو کم یا کوتاہ ہو سکتا ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں:

> علم حدیث کی یہ انتہائی اہم نوع ہے۔ علماء فنون اسے جاننے اور سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اس کا حق وہی ادا کر سکتا ہے جو حدیث وفقہ دونوں کا علم رکھتا ہو نیز اس کی باریکیوں کا واقف حال بھی۔ (اصول الحدیث از صبحی صالح: ۲۸۴)

غالباً اسی بناء پر امام ابن الصلاحؒ نے امام ابن خزیمہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے: میں نہیں سمجھتا کہ دو احادیث میں تضاد

ہو۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ ان میں تعارض ہے تو میرے پاس انہیں لایئے میں یہ تناقض دور کر کے دکھا دوں گا۔

(مقدمہ:۲۸۵)

اختلاف کی شروط:

۱۔ دونوں احادیث مقبول ہوں۔

۲۔ جس حدیث سے اختلاف ہے وہ دوسری ہو جو پہلی سے بظاہر اختلاف کرتی ہو۔ جن کا پہلا حصہ دوسری حدیث کے آخری حصہ سے یا آخری حصہ پہلے حصہ سے متعارض ہو ان احادیث کو مشکل الحدیث میں شامل کیا گیا ہے۔

۳۔ متعارض حدیث قابل احتجاج ہو اگر چہ وہ رتبہ میں صحیح، حسن کے لحاظ سے اپنے معارض کے بار بر نہ بھی ہو۔

۴۔ ان دو متعارض احادیث میں جمع و تطبیق بھی ممکن ہو۔

۵۔ احادیث میں اختلاف یا تعارض کے ثبوت کے لئے ایسی دو صحیح احادیث کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا ضروری ہے جو ہم پلہ ہوں اور ان کے درمیان صحت وضعف یا ناسخ ومنسوخ کا مسئلہ نہ ہو۔ ورنہ ایسی احادیث کے درمیان جمع و تطبیق (Combination & Adjustment) نہیں ہو سکتی۔ مسائل کا استنباط تو بہت دور کی بات ہوگی۔

ازالہ کی صورتیں:

محدثین کرام نے ایسی احادیث کے مابین تعارض کو رفع کرنے کی متعدد شکلیں بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ اولاً یہ کوشش کی جائے کہ دو متعارض روایات کی ایسی تشریح کی جائے جس میں بغیر کسی تکلف کے دونوں روایات کا تعارض دور ہو جائے۔ اگر یہ تعارض دور ہو جائے تو ان احادیث کو باہم جمع کرنا اور دونوں پر عمل کرنا بھی واجب ہوگا۔

۲۔ ثانیاً اس روایت کو ترجیح دی جائے جو راویوں کی کثرت یا ان کی عدالت والقاب کے لحاظ سے نمایاں

مقام رکھتی ہو۔(مقدمہ ابن الصلاح:۲۸۴)

نوٹ: جس طرح قرآن کریم میں بظاہر لفظی ومعنوی اختلاف مثلاً: عصا کو پتھر پر مارنے سے جو پانی پھوٹا اس کے لئے قرآن مجید میں کہیں فانفجرت کا لفظ ہے تو کہیں فانبجست کا۔ اسی طرح متوفی یا یتوفی کے الفاظ ہیں۔ یہی حال حدیث کے متن کا بھی ہے۔ علمائے تفسیر نے جس طرح ان مختلف الفاظ کے معنی ومفہوم میں جمع و تطبیق کی اور اس کے تعارض کو رفع کیا ہے اسی طرح مختلف احادیث کے مابین محدثین نے بھی جمع وتطبیق کی ہے۔

نوٹ: یہ تعارض شاید اس اختلاف سے نسبتاً بہت کم ہے جو ایک ہی مسلک کے فقہاء کے مابین فروع واصول میں پایا جاتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ المجموع شرح المهذب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

واعْلَمْ أَنَّ كُتُبَ الْمَذْهَبِ فِيْهَا اخْتِلَافٌ شَدِيْدٌ بَيْنَ الأَصْحَابِ بِحَيْثُ لَا يَحْصُلُ لِلْمُطَالِعِ وُثُوْقٌ يَكُوْنُ مَا قَالَهُ مُصَنِّفٌ مِنْهُمْ هُوَ الْمَذْهَبُ۔ تمہیں علم ہونا چاہئے کہ مذہبی فقہی کتابوں میں اصحاب مذہب کے مابین بڑا شدید اختلاف اس حد تک ہے کہ مطالعہ کرنے والے کو مذہب کے بارے میں وہ وثوق حاصل نہیں ہو پاتا جو مصنف نے کہا ہوتا ہے۔(ص:۱۸)

اگر چہ اس اختلاف کو چھپانے کیلئے **مُفْتٰی بِهَا** کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے مگر پھر بھی فقہی کتب میں موجود شدید اختلاف اپنی جگہ بدستور ہے۔

تصانیف: اولاً اس موضوع پر امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب اخْتِلَافُ الْحَدِيْثِ لکھی جو الگ چھپ چکی ہے۔ اسی طرح امام ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ (م:۲۷۶ھ) نے تَأوِيْلُ مُخْتَلَفِ الْحَدِيْثِ لکھی۔ ابو بکر محمد بن الحسن بن فورک انصاری (م:۴۰۶ھ) نے مُشْكِلُ الْحَدِيْثِ وَبَيَانُهُ لکھی جو مطبوع ہے۔

۲۔ علم ناسخ ومنسوخ: لغت میں نسخ: ازالہ ونقل وتحویل کو کہتے ہیں۔

اصطلاح میں: حکم شرعی کا تعلق متأخر حکم شرعی سے بذریعہ شرعی دلیل ختم کر دیا جائے۔ حکم کو رفع کرنے سے مراد اس کا تعلق مکلّف لوگوں سے کاٹ دیا جائے۔ کیونکہ قدیم حکم مرتفع نہیں ہوتا۔ جب مکلّف صحتمند ہو تو کہا جاتا ہے:

اس سے حکم شرعی متعلق ہے اور اگر پاگل ہو جائے: تو کہتے ہیں: اِرْتَفَعَ عَنْهُ الْحُكْمُ۔ اس سے حکم اٹھ گیا ہے۔ یعنی حکم کا تعلق اب اس سے نہیں رہا۔

ناسخ: ایسی دلیل جس سے پہلا حکم شرعی ختم ہو جائے یا واضح ہو جائے۔ یہ مجازی نام ہے کیونکہ درحقیقت ناسخ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے نہ کہ متاخر دلیل۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ما ننسخ من آية أو ننسها نأت بخير منها..﴾۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں صحابہ کرام نسخ کا لفظ وضاحت کے معنی بھی استعمال کرتے تھے۔ یعنی جہاں ابہام ہوتا دوسری جگہ اس کی وضاحت کر دیتی۔ (تفسیر ابن کثیر، البقرۃ:۲۸۵)

منسوخ: یہ سابق حکم ہوتا ہے جو متأخر دلیل سے ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے: آپ ﷺ سے سرگوشی سے قبل صدقہ کا حکم اور پھر بعد میں ختم کر دینا۔ یا متوفی عنها زوجها کا ایک سال انتظار کرنے کا حکم جو منسوخ ہو گیا۔

یہ علم، علوم حدیث کا انتہائی اہم، مشکل اور دقیق علم ہے۔ امام زہریؒ فرمایا کرتے:

أَعْيَا الْفُقَهَاءَ وَأَعْجَزَهُمْ أَنْ يَعْرِفُوا نَاسِخَ الْحَدِيثِ مِنْ مَنْسُوخِهِ۔ حدیث میں ناسخ ومنسوخ کے علم نے فقہاء کو تھکا مارا اور عاجز کر دیا کہ وہ اس علم کو پہچان سکیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کو اس علم میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے ایک بار محمد بن مسلم بن وارۃ (م: ۲۷۰ھ) سے جو مصر سے آئے تھے۔ دریافت کیا:

كَتَبْتَ كُتُبَ الشَّافِعِي؟ کیا تم نے امام شافعی کی کتب لکھی ہیں؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: فَرَّطْتَ۔ آپ نے بہت زیادتی کی۔ مَا عَلِمْنَا الْمُجْمَلَ مِنَ الْمُفَسرِ، وَلَا نَاسِخَ الحديثِ ومَنسوخَهُ حَتَّى جَالَسْنَا الشَّافِعِيَّ۔ ہم تو مجمل کو مفسر سے یا ناسخ حدیث ومنسوخ کو پہچان ہی نہ سکے جب تک ہم امام شافعی رحمہ اللہ کے پاس بیٹھ کر مستفید نہ ہوئے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ ایک قصہ گو کے پاس سے گذرے تو اس سے دریافت کیا: کیا تم ناسخ ومنسوخ کو جانتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپؓ نے فرمایا: هَلَكْتَ وَأَهْلَكْتَ۔ تم بھی ہلاک ہوئے اور لوگوں کو بھی تم نے ہلاک کیا۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کوئی سوال ہوا تو فرمانے لگے فتوی تو وہ دیا کرتا ہے جو ناسخ ومنسوخ کو جانتا ہو۔ لوگوں نے پوچھا: ایسا کون ہوسکتا ہے؟ فرمایا: سیدنا عمر۔ رضی اللہ عنہ۔

حدیث میں ناسخ ومنسوخ کو اس وقت زیر بحث لایا جاتا ہے جب دو احادیث یا نصوص متعارض ہوں۔ اور ان کے مابین جمع کی کوئی صورت نہ ہو۔ ناسخ ومنسوخ میں ہر حدیث کی تاریخ دیکھی جاتی ہے کہ ان میں کون سی متقدم ہے اور کون سی متأخر۔ متأخر نص ناسخ بن جاتی ہے اور متقدم منسوخ۔

نسخ کو جاننے کا طریقہ: مختلف طریقے علماء نے بتائے ہیں۔ جن میں:

کبھی یہ ناسخ آپ ﷺ کے ارشاد سے واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً: بریدہ بن الحصیب الاسلمی سے مروی ہے:

كُنْتُ نَهَيْتُكُم عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ فَزُورُوهَا، وَنَهَيْتُكُمْ عَنْ لُحُومِ الأَضَاحِيْ فَوْقَ ثَلاَثٍ فَأَمْسِكُوْا مَا بَدَا لَكُمْ، وَنَهَيْتُكُمْ عَنِ النَّبِيْذِ إِلَّا فِيْ سِقَاءٍ فَاشْرَبُوا فِي الأَسْقِيَةِ كُلِّهَا وَلَا تَشْرَبُوا مُسْكِراً۔ میں نے تمہیں قبروں کی زیارت کرنے سے منع کیا تھا۔ پس قبرستان جایا کرو۔ میں نے تمہیں قربانی کے گوشت کو تین دن سے زیادہ کے لئے جمع کرنے سے روکا تھا اب جو دل چاہے جمع کرلو۔ میں نے تمہیں نبیذ سے روکا تھا سوائے مخصوص برتنوں میں پینے سے۔ اب تمام برتنوں میں نبیذ پی سکتے ہو اور مسکر مت پینا۔ (صحیح مسلم: ۳/۶۵)

اور کبھی یہ علم تاریخ اور علم سیرت سے مستفاد ہوتا ہے جو ناسخ ومنسوخ حدیث کی پہچان میں بڑا مددگار ثابت ہوا ہے۔ مثلاً: شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کی روایت: أَفْطَرَ الْحَاجِمَ وَالْمَحْجُومَ۔ مگر سیدنا ابن عباس کی حدیث جس میں: اِحْتَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَهُوَ مُحْرِمٌ وَصَائِمٌ۔ کے الفاظ ہیں۔ امام شافعی کا کہنا ہے کہ پہلی حدیث فتح مکہ کے دوران کی ہے۔ اور دوسری حدیث حجۃ الوداع کی ہے۔ اس لئے یہ پہلی حدیث کی ناسخ ہے۔

اسی طرح صحابی کے قول سے بھی اندازہ لگالیا جاتا ہے کہ یہ منسوخ ہے: جیسے: جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ: كَانَ آخِرَ الأَمْرَيْنِ دو کاموں میں آخری کام یہ تھا۔ (سنن النسائی، کتاب الطہارۃ) یا سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت: كَانَ الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ رُخْصَةً فِي أَوَّلِ الإِسلامِ ثُمَّ أُمِرَ بِالْغُسْلِ۔ (سنن الترمذی کتاب الطہارۃ) پانی پانی سے ہے اس کی رخصت شروع اسلام میں تھی بعد میں غسل کرنے کا حکم دیا گیا۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ چونکہ متأخر اسلام تھے اس لئے ان کی بیشتر مرویات ناسخ بھی ہیں۔سیدنا ابوہریرہؓ ائمہ اجتہاد میں سے تھے اور فتوی دینے کے اہل بھی۔اس لئے ان سے ثابت شدہ سنن کو محض دعووں سے منسوخ کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا۔

مگر اصولی حضرات کا کہنا ہے کہ صحابی کا قول یہ ثبوت ضرور مہیا کرے کہ یہ خبر متأخر ہے مثلاً وہ یہ کہے: هَذَا كَانَ قَبْلَ هَذَا۔ یہ اس سے پہلے تھا۔ کیونکہ اب وہ ناقل ہے اور ثقہ بھی۔اس لئے اس کی یہ روایت قبول ہوگی۔لیکن صرف: یہ منسوخ ہے۔ کہنے سے نسخ ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اس قول کو اجتہاد کی ایک قسم سمجھتے ہیں جس میں خطا ہوسکتی ہے اس لئے یہ حجت نہیں۔

امام عراقی رحمہ اللہ اور دیگر محدثین نے اس شرط کو رد کیا ہے بلکہ محدثین کا موقف زیادہ واضح اور مشہور ہونے کی تائید کی ہے۔ کہ انہوں نے اصولیوں کی طرح یہ شرائط نہیں لگائیں بلکہ جب بھی صحابی خبر دے کہ یہ نص ناسخ ہے تو کافی ہے۔ورنہ:

......نسخ: اجتہاد اور رائے سے نہیں ہوتا اور نہ ہی ثابت ہوتا ہے۔

......صحابہ کرام اس بات سے کہیں زیادہ محتاط تھے کہ کوئی ان کے بارے میں یہ فیصلہ کرے کہ یہ حکم شرعی منسوخ ہوگیا ہے اور انہیں اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ یہ ناسخ، منسوخ کے بعد ہوا ہے۔

ناسخ ومنسوخ کی دلیل خبر رسول اللہ ﷺ سے ہی ہوگی۔جس کے بارے میں وقت بتائے گا کہ ان میں پہلا حکم کون سا اور متأخر کون سا؟ یا جس نے حدیث سنی ہو وہ کہے۔ یا عام لوگ کہیں۔وہ صحابی جو متأخر اسلام ہیں۔ تعارض کی صورت میں ان کی حدیث صحابی متقدم کی حدیث کی دو صورتوں میں ناسخ ہوگی۔

ا۔ متأخر اسلام صحابی بصراحت کہے کہ اس نے خود نبی ﷺ سے سنا ہے۔اسی طرح بغیر صراحت کے اس کی حدیث ناسخ نہیں ہوگی کیونکہ ہوسکتا ہے اس نے یہ حدیث کسی اور قدیم صحابی سے یا ہم عمر سے سنی ہو پھر اسے مرسل بیان کیا ہو۔

۲۔ متاخر اسلام صحابی نے اپنے اسلام سے قبل کوئی حدیث نبی ﷺ کی نہ سنی ہو۔ اگر ایسا ہے تو پھر بھی تصریح سماع کافی نہیں جب تک وہ یہ نہ کہے کہ میں نے یہ حدیث اسلام لانے کے بعد آپ ﷺ سے سنی۔

شرائط: نسخ کی یہ شرط بھی ہے کہ وہ صرف آپ ﷺ ہی کی طرف سے ہو نہ کہ کسی اور کی طرف سے ورنہ یہ نسخ نہیں ہوگا۔ جیسے دنیاوی قوانین، شرعی احکام ونصوص کے ناسخ نہیں ہو سکتے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ شارع حکم سابق کو اٹھالے اور نئے مسئلے کو نئے حکم سے بدل دیا ہے تو یہ نسخ نہیں۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ ناسخ متأخر ہو اور منسوخ متقدم۔ اگر دونوں اکٹھے ہوں جیسے مجمل کی وضاحت وغیرہ تو یہ نسخ نہیں۔ آخری شرط یہ ہے کہ حکم سابق حکم لاحق سے منسوخ ہو۔ جب مکلّف فوت ہو جائے یا اس کی تکلیف اس سے زائل ہوگئی ہے تو یہ نسخ نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر حکم، علت کے ختم ہونے پر ختم ہو جائے تو اسے بھی نسخ نہیں کہتے۔ جیسے روزہ کو آپ ﷺ نے یہ کہہ کر کھلوا دیا: إِنَّكُمْ قَدْ دَنَوْتُمْ مِنْ عَدُوِّكُمْ وَالْفِطْرُ أَقْوٰى لَكُمْ۔ تم اپنے دشمن کے قریب آ گئے ہو افطار تمہارے لئے زیادہ قوت کا باعث ہوگا۔ تو یہ رخصت تھی۔ ہم میں کسی نے افطار کیا اور کسی نے روزہ باقی رکھا۔ پھر اگلی منزل پر آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: إِنَّكُمْ مُصَبِّحُوا عَدُوِّكُمْ، وَالْفِطْرُ أَقْوٰى لَكُمْ فَأَفْطِرُوْا۔ تم صبح دشمن کے پاس کروگے اس لئے افطار تمہارے لئے باعث تقویت ہوگا۔ یہ عزیمت تھی تو ہم نے افطار کیا۔ ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں: بعد میں سفر کرتے تو ہم آپ ﷺ کے ساتھ روزہ رکھا کرتے۔ مراد یہ کہ سابق روزہ، متأخر روزہ کا ناسخ نہیں بنا۔ (صحیح مسلم)

محدثین کرام میں سے امام ابوبکر الحازمیؒ (م:۵۸۴ھ) ہی پہلے فرد ہیں جنہوں نے اس موضوع پر کتاب الاعتبار لکھی جس میں تقریباً پچاس اصول ناسخ ومنسوخ ضبط کئے۔ امام زین الدین العراقیؒ (م:۸۰۶ھ) نے التقیید والإیضاح میں سو سے زائد وجوہ ترجیح بیان کی ہیں جو بہت وقیع اور دلچسپ ہیں۔

۳۔علم علل حدیث: اس حدیث میں ایک مخفی علت ہوتی ہے جو اس کی ثقاہت کو Impugn چیلنج کرتی ہے۔ یہ حدیث علت سے خالی لگتی ہے اور بظاہر ثقہ راویوں کو دکھاتی ہے اور متن کو بھی۔ مگر ہوتی وہاں علت ہی ہے۔ مثلاً:

اگر ایک راوی حدیث کو روایت کرے اور دوسرے اس سے اختلاف کر رہے ہوں تو یہ اس مخفی علت کو باور کرانے

میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ مزید ماہرین حدیث کچھ دیگر علل سے بھی آگاہ ہوتے ہیں جیسے: ایک متصل حدیث میں ارسال خفی ہو یا وہ موقوف ہو۔ یا ایک متن کو دوسرے متن حدیث میں ضم کر دیا گیا ہو یا کوئی اور مخفی غلطی ہو۔ ایسی صورت میں ماہر حدیث اس روایت کے بارے میں شک کرتا ہے۔ یا تو وہ اس حدیث کے خلاف اپنی نقد کرے گا یا پھر اپنی تنقید کو روک لے گا۔

علت کیسے معلوم ہوتی ہے؟ ان مخفی اور پوشیدہ علل کو واضح کرنے اور بیان کرنے کی ضرورت محدثین کرام کو اس لئے پیش آئی کہ بعض حدیث سے لاتعلق بزرگوں نے روایت حدیث کو اختیار کیا اور اپنی کتب میں احادیث کو بیان کر کے ان میں مخفی اور دقیق سقم پیدا کر دیے۔ جیسے: منقطع حدیث کو متصل بنا دیا، یا موقوف کو مرفوع بنا دیا، یا ایک حدیث کے متن کو دوسری حدیث کے متن میں داخل کر دینا۔ ثقہ کی موصول روایت کو مرسل بیان کرنا۔ یہ سب مخفی کام تھے جن کا جاننا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے محدثین کرام ان خفیہ اسباب وعلل کو جاننے کے لئے حدیث کے تمام طرق یعنی اسانید کو جمع کرتے ہیں اور پھر راویوں کے ضبط اور اتقان میں موازنہ کر کے ان کے اختلاف میں غور کرتے ہیں اس طرح انہیں وہ پوشیدہ عیب اس حدیث میں مل جاتا ہے جسے وہ علت کہتے ہیں۔ یہی سبب علت ہے جس کی بناء پر حدیث ضعیف قرار پاتی ہے اگرچہ بظاہر اس میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ بسر بن سعید اپنے شاگردوں کو اس بارے محتاط و بیدار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اتَّقُوا اللّٰهَ وَتَحَفَّظُوا مِنَ الحديثِ، فَوَاللّٰهِ لَقَد رَأَيْتُنَا نُجَالِسُ أباهريرةَ، فَيُحَدِّثُ عَن رسولِ الله ﷺ، وَيُحَدِّثُنا عَنْ كَعْبٍ، ثُمَّ يَقُومُ فَأَسْمَعُ بَعْضَ مَنْ كانَ مَعَنَا يَجْعَلُ حَدِيثَ رسول اللهِ ﷺ عَنْ كَعْبٍ وَيَجْعَلُ حديثَ كَعْبٍ عَنْ رسولِ اللهِ ﷺ۔ خدا کا خوف کرو۔ اور حدیث کو بخوبی یاد کیا کرو۔ بخدا ہم سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مجلس حدیث میں بیٹھتے وہ ہمیں رسول اکرم ﷺ کی احادیث سناتے اور کچھ کعب کی بھی۔ پھر جب وہ چلے جاتے تو میں ان ہم نشینوں سے سنتا وہ حدیث رسول اللہ ﷺ کو کعب کی بنا دیتا اور کعب کی گفتگو کو حدیث رسول اللہ ﷺ بنا دیتا۔

اہمیت: حفاظ حدیث سے یہ علم مکمل تنقیدی ذوق اور بصیرت چاہتا ہے۔ ورنہ یہ قوی امکان ہے کہ کوئی حدیث کو

ضعیف یا ضعیف کو قوی بنا دے۔ ائمہ محدثین کا گو علل میں اجتہادی اختلاف ہے مگر ہے نادر۔ وجہ یہ ہے کہ ان علماء کا حدیثی علم اور ذوق ملتا جلتا ہے۔ بقول امام عبدالرحمنؒ بن مہدی: مَعْرِفَةُ الْحَدِيثِ إِلْهَامٌ۔ علم حدیث کی معرفت الہام ہے۔ اس لئے وہ کہا کرتے:

لَأَنْ أَعْرِفَ عِلَّةَ حَدِيثٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَسْتَفِيْدَ عَشْرَةَ أَحَادِيثَ۔ اگر میں ایک حدیث کی علت دریافت کرلوں یہ مجھے زیادہ محبوب ہے بہ نسبت دس احادیث سے مستفید ہونے کے۔

حدیث میں علت کو جاننا گویا حدیث کی صحیح تشخیص کرنا اور حدیث کے بہت بڑے ذخیرے کا جاننا ہے۔ یہ علوم حدیث کی تمام انواع میں انتہائی الجھا ہوا اور دقیق علم ہے۔ اس میں کامیاب وہ علماء ہوئے جو حافظ حدیث، ضابط اور فہم سلیم رکھنے والے تھے۔ جیسے امام سفیان الثوری، شعبہ بن الحجاج، امام یحیی بن سعید القطان رحمہم اللہ معرفت علل کے شہسوار ہیں جن سے امام علی بن المدینی رحمہ اللہ (م:۲۳۴ھ) نے یہ علم سیکھا اور ان سے امام ابوعبداللہ البخاری نے۔ ابن ابی شیبہ (م:۲۳۵ھ)، ابوحاتم (م:۲۷۷ھ)، ابوزرعہ (م:۲۶۴ھ) وغیرہ علماء بھی اس علم کے ماہرین ہیں۔ ان کے بعد امام ابن ابی حاتمؒ کی کتاب العلل، ابوبکر الخلال کا مجموعہ علل از امام احمدؒ، اور امام دار قطنیؒ کی کتاب العلل وغیرہ بھی ندرت علمی کا شاہکار ہیں۔ امام ذہبی اور ابن حجر عسقلانی بھی اپنے عہد کے جلیل القدر فاضل علماء علل میں سے ہیں۔ ان علماء میں بعض کی کتب مطبوع نہیں ہوسکیں۔

۴۔ **علم غریب الحدیث:** غریب سے مراد حدیث کے غیر مانوس اور قلیل الاستعمال الفاظ ہیں۔ ایسے الفاظ کا معنی ومفہوم چونکہ لوگوں پر مخفی ہوتا ہے اس لئے یہ شرح وتفسیر کے محتاج ہوتے ہیں۔ حدیث فہمی کا یہی پہلا زینہ ہے تاکہ تفہیم حدیث کے ساتھ استنباط مسائل بھی صحیح ہوسکیں۔ اس لئے جو حدیث بامعنی بیان ہوتی ہے محدثین اس کے الفاظ پر خاص توجہ دیتے ہیں۔

وجوہات: لوگوں کی اپنی عربی زبان بگڑتی یا عربی دانی کم ہوتی ہے تو ان پر ان الفاظ کا معنی ومفہوم واضح نہیں ہوتا۔ یا ان الفاظ کا استعمال کم ہو تو سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے الفاظ کی شرح اور وضاحت گو دشوار کام ہے مگر پھر بھی درست معنی کی تلاش ضروری ہے جو غریب الحدیث کی قوامیس (Dictionaries) میں بآسانی مل جاتی

ہے۔ محض ظن وتخمین کی بنیاد پر نبی کریم ﷺ کے کلام کی تفسیر ووضاحت کی اجازت نہیں۔ غیر مانوس لفظ کی عمدہ ترین وضاحت وہ روایت ہوگی جس میں تفسیر مل جائے۔ اس علم نے استنباط واجتہاد کے دروازے بھی کھولے ہیں اور ذہنوں میں دینی وفقہی وسعت پیدا کی ہے۔ قوامیس کو الفبائی ترتیب سے کس طرح مرتب کیا جائے اور تشکیل نہ ہونے کی صورت میں لفظ یا نام کے اعراب کو کیسے واضح کیا جائے یہی علم ہے جس نے ان مشکلات کا راستہ سہل بنا دیا۔ مشہور کتب درج ذیل ہیں۔

۱۔ **مشارق الانوار** از قاضی عیاض بن موسی الیحصبی۔ ۲۔ **غریب الحدیث**۔ از ابوعبید القاسم بن سلام۔

۳۔ **النهایہ فی غریب الحدیث**: از ابن الاثیر الجزری۔

۵۔ علم الرجال: راوی حدیث کے حالات کا جائزہ اس علم میں اس طرح لیا جاتا ہے کہ راوی کا نام، اس کی کنیت، نسبت اور لقب وغیرہ کیا ہیں۔ کس طبقے ومرتبے میں اس کا شمار ہوتا ہے؟ اس کی پیدائش، اساتذہ وتلامذہ کی تفصیل، طلب حدیث کے لئے اس کے اسفار، اس کی ثقافت ودیگر حالات زندگی نیز علمائے حدیث نے اس کی حدیث کو قبول یا رد کرنے میں کیا کیا جرح وتعدیل کی۔ کون سی کتابیں لکھیں؟ ان میں وارد احادیث کا یا رواۃ کا علمی معیار کیا ہے؟ راوی خود کب اور کہاں فوت ہوا۔ راوی کے بارے میں ان تمام معلومات کو جمع کرنا۔ علم الرجال کہلاتا ہے۔ گو حدیث کی روایت میں متمیز بچوں اور خواتین کا بھی خاصا حصہ ہے مگر چونکہ زیادہ تر کام مرد حضرات نے اس میدان میں کیا ہے۔ اس لئے اسے علم الصبیان یا علم النساء کہنے کی بجائے تغلیباً علم الرجال کہا گیا۔ اس علم کے تعارف سے مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے بے شمار رجال کار کے حالات زندگی محفوظ کر لئے۔ جو ایک بہت بڑا قیمتی سرمایہ اور قابل فخر اعزاز ہے۔ اس علم کے کچھ اور نام بھی ہیں۔ مثلاً

علم الرواۃ۔ علم الاسانید۔ علم اسماء الرجال۔ علم رجال الاثر۔

۶۔ علم جرح وتعدیل: یہ وہ علم ہے جس میں راوی کی عدالت وثقاہت یا اس کے معائب وضعف سے متعلق مخصوص الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اگر وہ لفظ جرح کے ہوں تو راوی مجروح ہوتا ہے اور اگر عدالت کے ہوں تو

راوی عادل قرار پاتا ہے۔ جو عالم راوی پر جرح کرتا ہے اسے جارح اور جو کسی راوی کو عادل قرار دیتا ہے اسے معدل کہتے ہیں۔ یہ علم، فن روایت حدیث کی اساس اور اس کی اولین بنیاد ہے اس لئے کہ اگر راوی ضعیف ہو تو روایت یا درایت کس کام کی؟ اور اگر راوی ثقہ ہو تو ایسی حدیث رد کر دینا کون سی دانش مندی ہے؟ محدثین نے جرح وتعدیل کے اصول قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ سے کشید کیے تا کہ صحیح حدیث کو برآمد کیا جا سکے۔ مثلاً یہ آیت:

﴿یایها الذین آمنوا إن جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا أن تصیبوا قوماً بجهالة فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین﴾۔ الحجرات:٦۔ اے اہل ایمان! جب تمہارے پاس کوئی فاسق اہم خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو نادانی میں نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر تم پشیمان ہو۔

اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی:

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي فَوَعَاهَا ثُم أَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا۔ اللہ اس شخص کو تروتازہ رکھے جو میری بات غور سے سنتا ہے اور پھر اسے بخوبی یاد کرتا ہے پھر اسے ویسے ہی آگے پہنچا دیتا ہے جس طرح اس نے اسے سنا ہوتا ہے۔

نیز آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی:

مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ كَذِباً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ جو بھی جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولتا ہے تو وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنا لے۔

یہ آیات واحادیث علم جرح وتعدیل کی بنیاد بنیں۔ قرآن مجید نے افراد پر جرح کی اور ان کی تعدیل بھی۔ ﴿کانوا لا یتناهون عن منکر فعلوه﴾ کی جرح ہو یا ﴿إنه کان من عبادنا المخلصین﴾ کی تعدیل۔ جرح سے قبل تحقیق کا بھی اسلوب دیا۔ ﴿سننظر أصدقت أم أنت من الکاذبین﴾ ہم دیکھیں گے کہ آیا تو اپنی بات میں سچا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ آپ ﷺ نے خود بھی تعدیل فرمائی اور جرح بھی کی۔ آپ ﷺ کی یہ تعدیل سیدنا فاروق اعظم کے بارے میں: لَو كَانَ بَعْدِيْ نَبِيًّا لَكَانَ عُمَرُ۔ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔ اسی طرح یہ ارشاد: فَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلَى الطَّعَامِ۔ ام المومنین عائشہؓ کو عورتوں پر ایسی فضیلت

حاصل ہے جیسے ہر قسم کے کھانے پر ثرید کو۔ آپ ﷺ نے ابوجہمؓ کے بارے میں فرمایا: أَمَّا أَبُو جَهْمٍ فَضَرَّابُ النِّسَاءِ وفي رواية: لَا يَضَعُ الْعَصَا عَنْ عَاتِقِهِ۔ رہے ابوجہم! وہ تو عورتوں کو بہت مارتے ہیں ایک اور روایت میں ہے: وہ اپنی لاٹھی کو اپنے کندھوں سے نیچے نہیں رکھتے۔

ان آیات واحادیث میں غیبت نہیں بلکہ خیر خواہی مطلوب ہے۔ روایت حدیث امت مسلمہ کے افادے کا نام ہے۔ جس کے لئے زہد وعبادت نہیں بلکہ نقد وتجزیہ کی نصیحت ہی کارگر ہوتی ہے۔ اسی طرح عدالت محض مجرم کی نماز یا روزہ وشکل وشباہت کو دیکھ کر بری الذمہ قرار نہیں دیتی بلکہ ایسے مواقع پر گواہی اور کھود کرید ہی جرم ثابت کرتی ہے۔

یہ علم آج کئی لاکھ علماء حدیث اور دیگر رجال کے حالات کو اپنے ہاں قلم بند کر چکا ہے جس میں کنیت سے لے کر نسبت، پیدائش ووفات کی تواریخ، طلب علم کے لئے ان کی سعی ومحنت اور اسفار، شاگردوں کے علاوہ اساتذہ کی معلومات اور ناقدین حدیث کا ان کے بارے میں بے لاگ تبصرہ، سب ایک تاریخ ہے۔ روایات کی صحت اور ان کا ضعف پہچاننے میں بڑا معاون ہے۔

محدثین نے جسے عادل قرار دیا وہ ہمیشہ کے لئے صحیح حدیث واسانید کی زینت بن گیا اور جس پر جرح کی اس کی سند وحدیث قابل ذکر وقابل اعتماد نہ ٹھہری۔ کنی واسماء، القاب وآباء اور انساب پر مشتمل امام مسلم، امام بخاری، خطیب بغدادی، ابن الجوزی، سمعانی، ابن الأثیر اور ابن حجر رحمہم اللہ وغیرہ کی کتب اس علم کی پہچان ہیں۔

جرح وتعدیل کے اصول بھی آفاقی ہیں جس میں صرف راوی حدیث ہی نہیں بلکہ ہر وہ شخص زیر بحث آتا ہے جس نے دین کی کسی بھی بات کو کسی بھی سطح پر کہا ہو۔ فقہاء ومحدثین، مفسرین اور متکلمین وغیرہ میں کوئی بھی ان سے مبرا نہیں۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ نقد وجرح کا پیمانہ ایک خاص گروہ کے لئے تو ہو مگر دوسرے معصوم وپاک ٹھہریں۔

۷۔ علم تخریج حدیث: بعض مصنف حضرات، اپنی کتب میں کتب صحاح وسنن سے حدیث بیان کرکے اور ان کا حوالہ دے کر اسے تخریج کا نام دے دیتے ہیں۔ اور بعض اسے تحقیق بھی کہہ دیتے ہیں۔ محدثین نے ان دو لفظوں کا مفہوم لکھا ہے:

تحقیق: محدثین کے نزدیک تحقیق حدیث یہ ہے کہ صرف حدیث کے بارے میں یہ معلومات جمع کر لینا کہ کس کس کتاب میں اور کون کون سے باب میں اور کس نمبر کی یہ حدیث کیا نص رکھتی ہے۔

تخریج: یہ ہے کہ حدیث کی تمام اسانید، کتبِ حدیث سے جمع کی جائیں۔ ہر حدیث کے رجال اور متن کے الفاظ پر جرح وتعدیل کے قواعد منطبق کئے جائیں۔ آخر میں یہ نتیجہ نکالا جائے کہ ان احادیث میں کون سی حدیث، سند ومتن کے اعتبار سے صحیح ہے اور کون سی ضعیف وموضوع۔ اسے تخریج کہتے ہیں۔ اس سے بہتر یا قابل عمل طریقہ تخریج آج تک نہیں بتایا جا سکا۔ عموماً لوگ تخریج حدیث کرتے وقت اپنی سوچ یا اخباری عقل اور رجحان کو میزان بنا لیتے ہیں مگر تخریج کے اصولوں کو وہ نہیں مانتے۔ اور بظاہر کئی ہچیں نکال کر صحیح حدیث کو ضعیف یا موضوع کہہ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے علم حدیث مذہبی تعصب، یا انکار حدیث کی بیساکھیوں پر چلنے والا تو نہیں۔ اس کے تو ماہرین ہیں جو جانتے ہیں کہ تخریج حدیث کیا ہوتی ہے اور تخریب حدیث کیا؟

عمل تخریج کا فائدہ یہ ہے کہ ہر حدیث کا اصل منبع یعنی اس کے تمام طرق اور مصادر معلوم ہو جاتے ہیں۔ رجال حدیث کے احوال سے واقفیت پر علم جرح وتعدیل حرکت میں آتا ہے۔ مصطلح اور اس کے قواعد کی تطبیق سمجھ آتی ہے۔ نیز علل وشذوذ سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس طرح صحیح احادیث کو ضعیف وموضوع احادیث سے علیحدہ کرنے کا ملکہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے تخریج وتحقیق کے درمیان تعریفی اعتبار سے فرق ہے مگر دونوں باہم مربوط بھی ہیں۔ تحقیق کے عمل کو تخریج نہیں کہا جا سکتا۔

اس تحقیق نے دیگر فنون اسلامیہ کے ریکارڈ کو درست کرنے اور تصنیف کتاب میں ثقاہت کو رواج دینے کا ڈھنگ سکھایا اور ثابت شدہ سند کو نقل وروایت کی صحت کیلئے علامت بنا دیا۔ مثلاً تاریخ، فقہ، سیرت یا کتب حدیث میں وارد احادیث کے بارے میں یہ معلومات اکٹھی کرنا: حدیث کا راوی کون ہے؟ کس پائے کا ہے؟ اور حدیث کا مصدر کیا ہے؟ اس سے ملتی جلتی احادیث کا احاطہ کرنا، ان تمام معلومات کے بعد یہ کہنا کہ یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف؟ موضوع ہے یا مرسل وغیرہ۔ یہ سب مکمل مگر دقیق معلومات چاہتا ہے۔ ان کی اسانید کے تمام رواۃ کا علمی وتحقیقی جائزہ لینا۔ اور آخر میں ایک جچی تلی علمی رائے دینا ایک مشکل اور تھکا دینے والا کام اگر نہیں تو اتنا آسان بھی نہیں۔ یہ ایک مسلسل تحقیقی عمل ہے جس کے ذریعے ہر حدیث کا مقام ومرتبہ متعین کیا جا سکتا ہے۔

محدثین کرام تخریج حدیث مختلف انداز سے کرتے آئے ہیں۔ مثلاً راوی کے نام سے تخریج کرتے وقت انہوں نے کتب مسانید، معاجم، کتب الأطراف اور الجوامع کو زیر مطالعہ رکھا۔ موضوع حدیث کو دیکھ کر انہوں نے تخریج کی تو اس میں مددگار کتب مستخرج، مستدرک، زوائد، مجامع، سنن، موطآت ومصنفات اور اجزاء وترغیب وترہیب تھیں۔ حدیث کے ابتدائی کلمات سے بھی تخریج کا طریقہ انہوں نے نکالا جسے بڑی عرق ریزی سے تحفة الأشراف، موسوعة أطراف الحديث ، المقاصد الحسنة، الجامع الصغير جیسی کتب میں جمع کیا ہے۔ نیز کسی بھی موضوع پر کتب یا ان کی فہارس سے بھی کام لیا۔ اسی طرح سند ومتن کے ذریعے بھی تخریج کر ڈالی۔ متن میں موضوع حدیث، یا اس کے الفاظ یا معنی حدیث کو نوٹ کیا، اگر وہ قرآنی مفہوم کے خلاف یا رکاکت لفظی رکھتی تو پھر کتب موضوعات، ضعاف وغیرہ سے مدد لی ورنہ سنن وصحاح یا المعجم المُفَهْرَسُ جیسی کتب کافی رہیں۔ سند میں راوی کے لطائف: ارسال، تسلسل اور ضعف کو دیکھ کر بھی تخریج کی۔ لیکن اگر متن وسند میں یہ تمام صفات اکٹھی نظر آئیں تو پھر کتب علل حدیث، الأسماءُ المُبْهَمَةُ وغیرہ کتب سے مستفید ہوئے۔

اس علم کو متعارف کرانے کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی کہ بعض مشہور کتب، تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف میں بیشتر ایسی احادیث در آئیں جو ضعیف اور موضوع تھیں مگر عامۃ الناس اور واعظ حضرات کے لئے ان میں آسانی اور کشش تھی۔ یہ روایات علماء حدیث کے قائم کردہ علمی واصولی معیار پر پورا نہ اترتی تھیں۔ اس لئے مشہور و متداول کتب میں وارد احادیث کی تخریج علمائے حدیث کو کرنا پڑی تاکہ حدیث کی حقیقت حال کا علم ہو۔ فقہ اسلامی کو صحیح رخ دیا جاسکے۔

۸۔ **علم فقہ الحدیث:** یہ حدیث کا درایتی واستنباطی فہم وعلم ہے جو اس اعتبار سے زیادہ اہم ہے کہ قرآن کریم کے بعد ایک طالب علم اس سے آگاہ ہو کر فقہی اختلافات کو غیر اہم سمجھتا ہے اور اسے ہی دینی میراث سمجھتا، رسول اللہ ﷺ سے محبت کرتا اور اپنی دینی بنیاد کو استوار کرتا ہے۔ اسی میزان کے عطا ہو جانے کے بعد وہ فقہاء کے مابین ہونے والے اختلاف کے دلائل اور ان کی صحت وکمزوری سے واقف ہوتا ہے۔ اگر فقہی، اصولی، اور مسلکی مسائل کو پہلے سکھا دیا جائے تو حدیثی ذوق تو کجا صحیح نصوص سے استنباط کا ملکہ بھی حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے دینی ارتقاء کا سفر رک کر مذہبی فقہ تک محدود ہو جاتا ہے۔ فقہ کی مشکل اور مختلف اقوال وابحاث کی نمائندہ کتب کی عبارت کو سمجھنے

میں ہی پھنس جاتا ہے۔ایسا طالب علم ہر حدیث کو پھر اپنے مسلک اور اصول کی عینک سے دیکھتا اور اس کے تابع کرنے کی کوشش میں ہوتا ہے۔جو دینی فہم کی صحیح بنیاد نہیں۔

فقہ الحدیث کو اولیت واہمیت اس لئے بھی حاصل ہے کہ سبھی ائمہ فقہاء ایک دوسرے کے علم سے مستفید ہوئے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اگر امام زہری رحمہ اللہ کی شاگردی اختیار کی تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے مسجد نبوی میں ان کے حلقہ درس میں بیٹھ کر حدیث رسول سنی۔اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ نے امام مالک سے موطا سنی اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ سے علم حدیث اور اصول فقہ کا علم حاصل کیا۔مگر باوجود ایک دوسرے کے شاگرد ہونے کے کوئی کسی کا مذہب اختیار نہ کر سکا۔وجہ یہی تھی کہ فقہ الحدیث ان کی تعلیم کی ابتدا تھی۔جس نے انہیں یہ مقام دلایا۔سنن، صحیح اور مصنفات کی کتب اس علم کے مآخذ ہیں۔نیز ان پر لکھی گئی شروحات بھی اس فقہی ذخیرہ کو سموتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

اعذار برائے ائمہ فقہاء

بعض ائمہ فقہاء نے صحیح احادیث کو ترک کیا ہے اس کے لئے ائمہ محدثین نے ان کی طرف سے تین اعذار پیش کئے ہیں۔

۱۔اس صحیح حدیث کا علم امام کو نہیں تھا۔

۲۔علم تھا لیکن اس کی نظر میں مسئلہ کی پیش آمدہ صورت جس پر اس نے فتوی دیا حدیث کے عموم یا خصوص میں داخل نہیں نہ اس کا علم کہ مفتی بہ مسئلہ اس حدیث کے عموم سے مخصوص ہے۔

۳۔اس کا خیال ہوگا کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔

باب ۹

علم جرح وتعدیل

اس علم میں مخصوص الفاظ کے ذریعے راوی کی عدالت وثقاہت یا اس کے معائب وضعف زیر بحث آتے ہیں کہ آیا ان کی روایات کو قبول کیا جائے یا رد۔

وجوہ واسباب: محدثین نے جرح وتعدیل کے اصول اس لئے بنائے کہ صحیح حدیث برآمد ہو۔ جن کا مصدر قرآن مجید کی آیات اور احادیث رسول ﷺ ہیں۔ مثلاً یہ آیت:

﴿یأیها الذین آمنوا إن جائکم فاسق بنبأ فتبینوا أن تصیبوا قوماً بجهالة فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین﴾۔ الحجرات:۶) اہل ایمان جب تمہارے پاس کوئی فاسق اہم خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو نادانی میں نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر تم اپنے کئے پر پشیمان ہو۔

آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي فَوَعَاهَا ثُمَّ أَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا۔ (سنن ترمذی:۲۶۵۶) اللہ اس شخص کو تروتازہ رکھے جو میری بات (حدیث) کو غور سے سنتا ہے اور پھر اسے بخوبی یاد کرتا ہے اور پھر اسے ویسے ہی آگے پہنچا دیتا ہے جس طرح اس نے اسے سنا ہوتا ہے۔

نیز آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی:

مَنْ تَعَمَّدَ عَلَيَّ كَذِباً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ (صحیح بخاری:۱۰۸) جو بھی جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولتا ہے تو وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنا لے۔

قرآن مجید نے بھی افراد پر جرح کی اور ان کی تعدیل بھی۔ ﴿کانوا لا یتناهون عن منکر فعلوه﴾ کی جرح ہو یا ﴿إنه کان من عبادنا المخلصین﴾ کی تعدیل۔ تحقیق بھی کی: ﴿سننظر أصدقت أم أنت من

الکاذبین﴾ ہم دیکھیں گے کہ آیا تو اپنی بات میں سچا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔آپ ﷺ نے خود بھی تعدیل فرمائی اور جرح بھی کی۔آپ ﷺ کی یہ تعدیل سیدنا فاروق اعظم کے بارے میں: لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيًّا لَكَانَ عُمَرُ۔ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔اسی طرح یہ ارشاد: فَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلَى الطَّعَامِ۔ام المومنین عائشہؓ کو عورتوں پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسے ہر قسم کے کھانے پر ثرید کو سیدنا معاذؓ بن جبل سے آپ ﷺ کا یہ فرمانا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہ کے قاصد کو فہم کی یہ توفیق بخشی۔آپ ﷺ نے ابوجہمؓ کے بارے میں فرمایا: أَمَّا أَبُو جَهْمٍ فَضَرَّابُ النِّسَاءِ وَفِي رِوَايَةٍ: لَا يَضَعُ الْعَصَا عَنْ عَاتِقِهِ۔رہے ابوجہم تو وہ تو عورتوں کو بہت مارتے ہیں ایک اور روایت میں ہے: کہ وہ اپنی لاٹھی کو اپنے کندھوں سے نیچے نہیں رکھتے۔

محدثین کرام نے اپنی ان کوششوں کا آغاز عہد خلافت راشدہ میں ہی کر دیا تھا۔صحابہ کرام میں ابن عباسؓ، اور تابعین میں امام شعبیؒ شامل تھے جنہوں نے راویوں کی جرح وتعدیل کی ۔شہادت ذوالنورینؓ مسلمانوں کے لئے ایک عظیم المیہ اور فتنہ تھا اسی دور میں انہوں نے کسی بھی راوی حدیث کے لئے اس اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا کہ تم نے ہمیں حدیث تو سنادی اب سَمُّوا لَنَا رِجَالَكُمْ۔ جس سے تم نے یہ حدیث سنی ہے اس کا نام بتاؤ؟ اگر وہ فتنہ زدہ ہوتا تو اس کی حدیث کو پرے رکھ دیتے اور اگر محفوظ ہوتا تو اس کی حدیث قبول کر لیتے ۔(مقدمہ صحیح مسلم)

نوٹ: اس علم کو روایت حدیث کے فن کا نچوڑ اور اس کی پہلی سیڑھی قرار دیا جا سکتا ہے اس لئے کہ اگر راوی ضعیف ہو تو روایت کس کام کی؟ اور اگر راوی ثقہ ہوں تو ایسی حدیث رد کر دینا کون سے دانش مندی ہے؟ اور اس کی لاعلمی میں حدیث سے استخراج واستنباط کون سی فقاہت ہے؟

جرح یا غیبت: بعض سادہ لوگ نیکی کے غلبہ کی وجہ سے راوی حدیث پر جرح کو غیبت سمجھتے ہیں۔گو کسی کے عیوب بیان کرنا غیبت ہے مگر ایسی غیبت کی اجازت محدثین کرام نے اس حدیث کی روشنی میں اس مقصد کے تحت دی ہے کہ صرف حدیث رسول ﷺ کو ہر قسم کے غیر ثقہ راویوں سے پاک رکھا جائے۔جرح کو اس لئے جائز قرار

دیا گیا ہے تا کہ حقیقت حال واضح ہو جائے۔ اسے علماء نے غیبت شمار نہیں کیا۔ بلکہ اسے دین اور اہل دین کے لئے نصیحت قرار دیا ہے۔ جج حضرات بھی گواہوں پر جرح کرتے ہیں اور انہیں خوب کھدیڑتے ہیں حتی کہ بعض اوقات شرم وحیا کے تقاضوں کو بھی اس کرید میں انہیں چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اس جرح کے بغیر وہ صحیح فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس سلسلے میں اپنے والد یا بیٹے کو بھی اگر ضعیف کہنا پڑا تو دینی فریضہ سمجھتے ہوئے کہہ دیا۔ سب سے پہلے جس نے جرح وتعدیل میں علماء کے کلام اور ان کی جرح وتعدیل کی آراء کو جمع کیا وہ امام یحییٰؒ بن سعید القطان (م:۱۸۹ھ) تھے۔ انہی سے کسی نے کہا:

أَمَا تَخْشَى أَنْ يَكُونَ هٰؤُلاءِ الَّذِينَ تَرَكْتَ حَدِيثَهُمْ خُصَمَاؤُكَ عِنْدَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ؟ قَالَ: لَأَنْ يَكُونَ هٰؤُلاءِ خُصَمَائِي أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ يَكُونَ النَّبِيُّ ﷺ خَصْمِيْ، يَقُولُ لِي: لِمَ لَمْ تَذُبَّ الْكَذِبَ عَنْ حَدِيثِيْ؟ کیا آپ کو خوف نہیں آتا جن کی احادیث آپ نے ایک طرف کر دیں کہ وہ لوگ کل اللہ کے ہاں آپ کے دشمن بن جائیں؟ فرمانے لگے: ان لوگوں کا میرا دشمن بننا مجھے زیادہ عزیز ہے بہ نسبت اس کے کہ اللہ کے رسول میرے دشمن کل بنیں کہ وہ مجھے فرمائیں: تم نے میری حدیث سے جھوٹ کو دور کیوں نہیں کیا تھا۔ (تحذیر الخواص از ابن جوزی: ۱۷۵)

ہاں کسی کے ذاتی رنجش یا تعصب کی بنا پر عیب تلاش کرنا، تجسس کرنا، یا اس کی عزت اچھالنا قطعاً جائز نہیں۔

تعدیل: ماہرین حدیث کی طرف سے کسی راوی کو عادل قرار دینا۔ یعنی اسے روایت میں قابل اعتماد سمجھنا اور باور کرانا۔ یہ عمل بھی خاصی تحقیق کے بعد کیا جاتا۔ ظاہر ہے نہ علماء فرشتے ومعصوم تھے اور نہ ہی راوی۔ مگر اپنی بساط بھر کوشش کے بعد جو وہ کسی کے بارے میں دیانت داری سے کہہ سکے انہوں نے کہہ دیا۔ دنیا کے معاملات ایسے ہی چلتے ہیں اور قابل اعتماد لوگوں کی تلاش مسلسل رہتی ہے۔ معاملات سے یا معتمد لوگوں سے پوچھ گچھ سے ہی فرد کی تصدیق ہوتی ہے۔

علماء اور کتب: اس علم میں جو علماء مشہور ہوئے وہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اس لئے کہ یہ علم ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس علم کو انتہاء تک پہنچانے والے امام یحیی بن معین رحمہ اللہ (م:۲۴۱ھ) تھے۔ الحمد للہ امت تک افراد کے بارے میں ایک نصیحت آمیز گفتگو اور پیمانہ پہنچانے کا حق قرون اولی کی ان سعید روحوں نے ادا کر دیا۔ جزاھُم

اللّٰهُ عَنَّا أَحْسَنَ الْجَزَاءِ۔ آمین۔ چند علماء جرح وتعدیل کے نام درج ذیل ہیں:

امام سفیان ثوری، امام مالک (م:۱۷۹ھ)، عبداللہ بن المبارک (م:۱۸۱ھ)، سفیان بن عیینہ (م:۱۹۷)، عبدالرحمٰن بن مہدی (م: ۱۹۸ھ)، علی بن المدینی (م: ۲۳۴ھ)، امام بخاری (م: ۲۵۶ھ)، ابوزرعہ الرازی (م: ۲۶۴ھ)، امام نسائی (م:۳۰۳ھ)، ابن ابی حاتم الرازی (م: ۳۲۷ھ)، دارقطنی (م: ۳۸۵ھ)، ابوالحجاج المزی (م: ۷۴۳ھ) امام ذہبی (م:۷۴۸ھ) اور ابن حجر (م:۸۵۲ھ) رحمہم اللہ

☆......ان میں اکثر بزرگوں کی کتب بھی مطبوع ہیں۔ مگر ان سب کا تفصیلی اور تنقیدی خلاصہ دو چار مؤلفین کی کتب میں سمو دیا گیا ہے۔ جن میں بطور خاص امام بخاریؒ کی کتب: التاریخ الکبیر، الوسیط اور الصغیر میں، ابنؒ ابی حاتم کی: تقدمۃ الجرح والتعدیل میں، ابوالحجاج المزی کی کتاب: تھذیب الکمال ۳۵ مجلد میں، امام ذہبیؒ کی کتب: سیر اعلام النبلاء، تذکرۃ الحفاظ اور میزان الاعتدال میں، امام ابن حجر عسقلانیؒ کی کتب: تہذیب التھذیب، تقریب التھذیب اور امام ذہبیؒ کی کتاب میزان پر ان کا استدراک بہ نام: لسان المیزان میں۔ یہ سب کتب علم جرح وتعدیل کے اساسی مصادر اور مراجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

جرح: عربی میں عیب یا خرابی کو یا زخم کے نشان کو کہتے ہیں۔ جراح بھی اسی سے ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں جرح: راوی کی ایسے الفاظ سے تنقید کرنا کہ اس کی شخصیت سے عدالت اور ضبط کا پہلو گم نظر آئے۔ ایسے الفاظ سے اس کی روایت رد ہو جاتی ہے مثلاً یہ کہا جائے: هُوَ كَذَّابٌ۔ وہ جھوٹا ہے۔ أو فَاسِقٌ: یا وہ فاسق ہے۔ یا لَيْسَ بِثِقَةٍ، وہ ثقہ نہیں ہے۔ لَا يُعْتَبَرُ قابل اعتبار نہیں۔ لَا يُكْتَبُ حَدِيثُهُ اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔

جارح: ایک ماہر، منصف اور بے لاگ بات کرنے والا محدث جو کسی راوی کی علمی، بدعملی، اور اس کی عدالت وضبط کی کمزوری کو بخوبی جان کر اسے نا قابل قبول قرار دے، جارح کہلاتا ہے۔ یہ تین قسم کے ہیں:

۱۔متشدد　　　۲۔معتدل　　　۳۔متساہل

۱۔متشدد: بہت ہی سختی کرنے والے علماء میں امام یحییٰ بن سعید القطان، شعبہ بن الحجاج، سفیان ثوری، یحییٰ بن

معین رحمہم اللہ تھے۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ ان کے دور میں مفتون ومبتدع قسم کے لوگ اپنی بدعقیدگی سمیت میدان روایت حدیث میں گھس رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے بغیر کسی رورعایت کے ان کے معائب اور خرافات کا پردہ چاک کر کے انہیں نااہل قرار دیا۔

۲۔ **معتدل:** ان علماء میں عبدالرحمٰن بن مہدی، امام احمد بن حنبل، امام بخاریؒ جیسے زیرک علماء تھے۔ ان کے دور میں جن مفتون ومبتدع اور نااہل حضرات نے میدان حدیث کا رخ کیا تو انہوں نے بہت ہی مختصر ومعتدل مگر جامع اور دھیمے الفاظ میں جرح کی جو سخت ترین نقد وجرح سمجھی گئی۔

۳۔ **تساہل:** علماء میں ابن حبان، اور امام حاکم جیسے علماء کو شامل کیا گیا ہے گو ان کا تساہل بہت کم رواۃ واحادیث میں ملتا ہے۔ چونکہ وہ نقطہ اعتدال سے ذرا ہٹ گئے تھے اس لئے ضعیف راوی کے حق میں ان کی توثیق قبول نہیں کی گئی۔

ان تینوں علماء کی جرح وتعدیل میں کس طرح امتیاز کیا جائے؟ اس کے لئے قاعدہ یہ بنایا گیا کہ اگر متشدد کی نقد کی تائید کوئی معتدل کرتا ہے تو سرآنکھوں پر ورنہ معتدل کی جرح ہی مقبول ہوگی۔ رہے متساہل ان کے ساتھ بھی معاملہ اسی طرح کا ہے کہ اگر متساہل سے معتدل موافقت نہیں کر رہا تو معتدل کی جرح ہی قبول ہوگی نہ کہ متساہل کی۔ توثیق راوی میں بھی یہی قاعدہ چلے گا۔

اقسام: جرح دو قسم کی ہوتی ہے مطلق اور مقید

مطلق: راوی پر کسی پابندی کے بغیر آزاد جرح ہو۔ جو راوی کی بہر حال ایک برائی بن جاتی ہے۔

مقید: راوی پر جرح کسی معین شے کی ہو۔ مثلاً کسی شیخ یا گروہ کی طرف نسبت کی وجہ سے۔ ایسی جرح اس کے خلاف ایک برائی تصور ہوتی ہے۔ جیسے: تقریب میں امام ابن حجر رحمہ اللہ کا زید بن الحباب کے بارے میں یہ کہنا: صَدُوقٌ يُخْطِئُ فِي حَدِيثِ الثَّورِيِّ۔ یہ سچے ہیں مگر امام ثوریؒ کی روایت میں خطا کر جاتے ہیں۔ جب کہ ان سے امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح مسلم میں روایت کی ہے۔ اسی طرح الخلاصۃ کے مصنف کا اسماعیل بن عیاش کے بارے یہ کہنا:

وَثَّقَهُ أَحْمَدُ وَابْنُ مَعِينٍ وَالْبُخارِيُّ فِي أَهلِ الشَّامِ، وَضَعَّفُوهُ فِي الْحِجَازِيِّيْنَ، فَيَكُونُ ضَعِيفاً

فِي حَدِيثِهِ عَنِ الْحِجَازِيِّينَ دُونَ أَهْلِ الشَّامِ، وَمِثْلُ ذَلِكَ إِذَا قِيلَ هُوَ ضَعِيفٌ فِي أَحَادِيثِ الصِّفَاتِ مَثَلاً قَدْ يَكُونُ ضَعِيفاً فِي رِوَايَةِ غَيْرِهَا۔ امام احمد، ابن معین اور بخاری نے اہل شام میں انہیں ثقہ گردانا ہے اور اہل حجاز میں ضعیف۔ لہذا وہ اہل حجاز سے روایت کردہ حدیث میں ضعیف ہوں گے نہ کہ اہل شام سے۔ اسی طرح مثلاً جب یہ کہا جائے: احادیث صفات میں وہ ضعیف ہیں۔ تو کسی اور روایت میں بھی وہ ضعیف ہو سکتے ہیں۔

مگر جب مقید جرح کا مقصد یہ ہو کہ اس سے راوی کی توثیق کے دعوی کو اسی مقید جرح کے ذریعے غلط ثابت کیا جائے تو پھر وہ راوی کسی اور روایت میں ضروری نہیں کہ ثقہ ہو بلکہ وہاں بھی ضعیف ہو سکتا ہے۔

جارح کے لئے شروط: جرح کرنے والے کے لئے پانچ شرطیں عائد کی جاتی ہیں:

۱۔ جرح ایک عادل شخص کی طرف سے ہو۔ فاسق جارح کی جرح قبول نہ ہوگی۔

۲۔ جرح ایسے شخص کی طرف سے ہو جو بیدار مغز ہو نہ کہ غفلت کا شکار۔ اس کی جرح قبول نہ ہوگی۔

۳۔ جو عالم جرح کے اسباب کو جانتا ہو اس کی یہ جرح ہو۔ مگر جو خرابیوں کو نہ جانتا ہو اس کی جرح نا قابل قبول ہوگی۔

۴۔ جرح کرنے والا جرح کا سبب بھی بیان کرے۔ مبہم جرح قبول نہ ہوگی۔ مثلاً صرف وہ یہ کہہ دے: هُوَ ضَعِيفٌ: وہ ضعیف راوی ہے یا يُرَدُّ حَدِيثُهُ: اس کی حدیث رد کی جاتی ہے کیونکہ یہ سبب بتائے بغیر کی جرح ہے۔ اس لئے کہ ہو سکتا ہے وہ اسے ایسے سبب کی بناء پر جرح کر رہا ہو جو جرح کا تقاضا ہی نہ کرتا ہو۔ محدثین کے ہاں یہی قاعدہ مشہور و معروف ہے۔ امام ابن حجرؒ نے مبہم جرح قبول کرنے کا لکھا ہے۔ ہاں جو راوی عادل ہو تو اس پر جرح سبب جرح بیان کرنے پر ہی قبول کی جائے گی۔ یہی راجح قول ہے اور جارح بھی ائمہ جرح وتعدیل میں سے ہو۔ اس لئے عمرو بن علی الفلاس کی محمد بن بشار بندار پر جرح جو بغیر سبب کے ہے قبول نہیں کی گئی۔

۵۔ یہ جرح ایسے علماء وائمہ پر نہ ہو جن کی عدالت تواتر سے اور امامت شہرت کی حد سے متجاوز ہو چکی ہو۔ جیسے: نافع، شعبہ، مالک و بخاری رحمہم اللہ پر کسی کی جرح۔ ایسے علماء وائمہ پر جرح سورج پر تھوک پھینکنے کے مترادف ہے۔ یہ جرح خواہ مفسر ہی کیوں نہ ہو بالکل قبول نہیں ہوگی۔ اس کی روایت کردہ حدیث بھی صحیح درجے کی ہوگی

نہ کہ حسن درجے کی۔ معاصرت بھی منافرت کا سبب بنتی ہے۔ اس لئے بقول امام السبکی: ابن ابی ذئب کی امام مالک پر، ابن معین کی امام شافعی پر، نسائی کی احمد بن صالح پر جو جرح ہے وہ نا قابل التفات ہے۔ یہ جرح ایک انجانی سی اطلاع کی طرح ہے۔ کیونکہ یہ سب مشہور ائمہ ہیں۔ اگر یہ جرح صحیح بھی ہو تب بھی بہت سی اور معلومات درکار ہوں گی جو نتیجۃً اس خبر کو غیر درست ہی ثابت کریں گی۔ (طبقات الشافعیہ الکبری ۱۲/۲)

اسی طرح امام ابن حزمؒ نے امام ترمذیؒ، ابوالقاسم البغویؒ، اسماعیل بن محمد الصفارؒ اور ابوالعباس الأصمؒ کو مجہول کہا ہے۔ اس جرح پر نقاد محدثین نے ابن حزمؒ پر خاصی لے دے کی ہے۔ ان کی مزید مثالیں دیکھنا ہوں تو امام ابن حجرؒ کے مقدمہ ہدی الساری کا مطالعہ مفید رہے گا۔

تعدیل: عربی میں عدل معاملات میں اعتدال ومیانہ روی کو کہتے ہیں۔ اس کا متضاد جور ہے۔ اصطلاح میں **تعدیل:** راوی کی شخصیت کا ایک تزکیہ ہے کہ وہ ایک عادل وضابط راوی ہے۔ یہ تزکیہ تحقیق حال کے بعد دیا جاتا ہے۔ مثلاً: ضَابِطٌ، ثِقَةٌ، مُتْقِنٌ، یا أَوْثَقُ النَّاسِ وغیرہ۔ ان الفاظ میں راوی کے ضبط کے صحیح ہونے یا اس کی عدالت میں استقامت کی خوبی کو بیان کیا گیا ہے۔ یہی اس کی تعدیل ہے۔ یوں توثیق کے بعد ایسے راوی کی روایت مقبول ہو جاتی ہے۔ یہ توثیق راوی کے تمام احوال جاننے کے بعد ایک محدث کبیر کرتا ہے تاکہ راوی کی روایت قبول کی جائے۔ اسے حجت بنایا جائے اور اسے روایت بھی کیا جائے۔

عدالت، سے مراد عدل کو لازم کرنا ہے۔ جو فرض کی ادائیگی، حرام سے اجتناب اور اپنی روایت کو بخوبی یاد رکھنا کو کہتے ہیں۔ ذیل کی چند خوبیاں راوی میں عدل کو ثابت کرتی ہیں:

اسلام: راوی مومن صادق ہو، منافق، مشرک، کافر نہ ہو یا برے عقیدے وعمل کی وجہ سے کافر نہ قرار دیا گیا ہو۔

عقل: راوی میں جنون نہ ہو، وہ بہکی بہکی باتیں کرنے والا نہ ہو۔ بلکہ اس کی عقل سلامت ہو۔

بلوغ: راوی ایسا بچہ نہ ہو جو تمیز نہ کر سکے۔ اور بالغ بھی ہو۔

صدق: اپنے لہجے میں بھی سچا ہو اور امین ہو۔ حدیث رسول میں یا لوگوں کے ساتھ باتوں میں وہ جھوٹا نہ ہو۔

تقوی: راوی خدا خوفی سے ہر وقت سرشار ہو۔ اخلاق حسنہ اور عادات جمیلہ سے مزین ہو۔ فاسق کی صفات سے وہ بری ہو۔

شہرت: طلب حدیث اور اس کی روایت میں معروف ہو۔ اس کے ایسے ثقہ مشایخ ہوں جنہوں نے اس کی

توثیق کی ہو۔ اور ایسے شاگرد ہوں جو اس سے روایت میں بھی جانے پہچانے ہوں۔ راوی مجہول العین ہو نہ مجہول الحال۔

معدل کی شروط:

معدل کے لئے درج ذیل شروط لکھی گئی ہیں:

۱۔ معدل خود عادل ہو۔ فاسق نہ ہو۔ ورنہ اس کی تعدیل قبول نہ ہوگی۔

۲۔ معدل خود بیدار مغز ہو، اگر غافل ہے تو راوی کے ظاہری حالات سے دھوکہ کھا سکتا ہے۔

۳۔ معدل اسباب تعدیل کی معرفت رکھتا ہو۔ جو صفات قبول ورد کو نہ جانتا ہو اس کی تعدیل صحیح نہیں۔

۴۔ متقی اور پرہیزگار ہو۔ ورنہ وہ تعصب اور خواہشات نفس سے باز نہیں رہے گا۔

جرح وتعدیل کے قاعدے:

۱۔ تمام صحابہ عادل ہیں۔ اس لئے ان پر جرح نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ وہ سب اللہ تعالی کی طرف سے ﴿أولئک هم الصادقون﴾ کا اعزاز پانے کے بعد عادل ہیں۔

۲۔ جس راوی کی تعدیل وتوثیق پر اجماع ہو چکا ہے اس پر کسی قسم کی جرح قبول نہیں کی جائے گی۔ جیسے امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اور امام بخاری ومسلم رحمہم اللہ کی ذات ہے۔

۳۔ ثقہ، متقن اور اسباب جرح وتعدیل کی صحیح معرفت رکھنے والے کی جرح یا تعدیل قبول کی جائے گی۔

۴۔ راوی کے تزکیہ دینے والوں کی معین تعداد شرط نہیں بلکہ ایک مزکی بھی اس کے عادل ہونے کی شہادت دے سکتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ شہادت دینے اور روایت کرنے میں اور ان دونوں کی شرائط میں فرق ہے۔

۵۔ محض کسی ثقہ راوی سے کسی راوی کا روایت کرنا اس راوی کے عادل ہونے کی دلیل نہیں۔

۶۔ جرح بغیر ذکر سبب قبول کی جا سکتی ہے بشرطیکہ جارح خود ایک ثقہ، پسندیدہ اور اسباب جرح کی معرفت رکھتا ہو۔ کچھ علماء کے ہاں جرح بغیر سبب بتائے قبول نہیں ہو سکتی۔ اس کی دو صورتیں ہیں:

أ۔ راوی کا ایک عیب بیان کر دینا ہی کافی ہے جو مشکل کام نہیں۔ جب کہ کسی کے مناقب بیان کرنے میں تفصیلات درکار ہوتی ہیں۔

ب۔ اسباب جرح مختلف لوگوں کے ہاں مختلف ہو سکتے ہیں۔ اس لئے جارح صرف وہی سبب بیان کرے جو

راوی کو مجروح بناتا ہو۔ اس طرح اسے ماننے یا نہ ماننے کا فیصلہ جلد اور آسانی ہو سکے گا۔

۷۔ کسی حدیث کے موافق کسی عالم کا عمل یا اس کا فتوی حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں اور نہ ہی اس کے راوی کی توثیق ہوا کرتی ہے۔

مراتب جرح وتعدیل:

متقدم علماء نے اپنے اپنے دور میں جرح وتعدیل کے جو مراتب قائم کئے انہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ رجال حدیث کی تحقیق وتنقید کا سلسلہ کہیں یا کسی زمانہ میں تھما نہیں بلکہ اس میں مزید تنقیح وتہذیب ہوتی رہی ہے۔ امام ابن ابی حاتم، حافظ ذہبیؒ امام ابن الصلاح، امام نووی، حافظ عراقی وغیرہ نے اپنی رجال حدیث کے ستونوں کے تنقیدی الفاظ کو اپنی تنقیحات میں مرتب کر کے جرح وتعدیل کے معتدل میزان قائم کئے۔ جنہیں امام ابن حجر رحمہ اللہ نے التقریب کے مقدمہ میں بہت احسن طریقے سے مزید نکھارا اور مرتب کیا ہے۔

تعدیل کے چھ مراتب ہیں۔ جن کی ترتیب یہ ہے:

۱۔ **أوثق الناس:** توثیق راوی کے لئے ایسے لفظ کا استعمال جو انتہائی اعلی ہو۔ یا افعل التفضیل ہو یعنی أفعل کے وزن پر وہ لفظ آئے۔ جیسے: أَوْثَقُ النَّاسِ لوگوں میں سب سے زیادہ ثقہ انسان۔ أَضْبَطُ النَّاسِ: سب سے زیادہ ضابط، فُلَانٌ إِلَيْهِ الْمُنْتَهَى فِي التَّثَبُّتِ: فلاں راوی پر ثقاہت ختم ہے۔ تعدیل کے لئے یہ الفاظ راوی کے سب سے اعلی معیار عدالت کو واضح کرتے ہیں۔ اسی سے ملتے جلتے یہ الفاظ بھی ہیں: فلَانٌ لَا يُسْأَلُ عَنْهُ! فلاں! اس کے بارے میں پوچھا ہی نہیں جاسکتا۔ یا فُلَانٌ لَا يُسْأَلُ عَنْ مِثْلِهِ۔ فلان! اس جیسے کے بارے میں نہیں پوچھا جاسکتا۔

۲۔ **ثقة ثقة:** توثیق کے لئے ایک ہی صفت یا اس سے ملتی جلتی صفت کو دوسری بار بیان کر کے اس پر مزید زوردار اور پختہ تر کیا جاتا ہے۔ جیسے: ثِقَةٌ ثِقَةٌ، یا ثِقَةٌ ثَبْتٌ۔

۳۔ **ثقة ، حُجَّةٌ:** ایسا توثیقی لفظ جو عدالت وضبط دونوں کی گواہی دے رہا ہو مگر اس میں تاکید نہ ہو جیسے: ثقہ، یا حجۃ وغیرہ۔ امام ابن معین اگر لا بَأْسَ بِهِ کے ریمارکس کسی کے بارے میں دیں تو یہ طے شدہ امر ہے کہ وہ ان کے نزدیک ثقہ ہے۔

۴۔ **صَدُوق:** ایسے الفاظ جو راوی کی تعدیل تو کریں مگر اس کے مکمل ضبط کی شہادت نہ دیں۔ جیسے: صَدُوقٌ،

مَأمونٌ، لَا بَأسَ بِهِ، صَدُوقٌ إِنْ شاءَ اللّٰهُ یامَحَلُّهُ الصِّدْقُ وغیرہ۔اس کی حدیث حسن کہلاتی ہے۔

۵۔**فلان شیخ**:ایسے الفاظ جس میں راوی کی توثیق معلوم ہو نہ تجریح۔جیسے:فُلَانٌ شَیْخٌ یارَوَی عَنهُ النَّاسُ۔ ان دو(۵،۴)راویوں کو بطور اعتبار لیا جاتا ہے۔

۶۔**صالح الحدیث**: وہ لفظ جو تعدیل کی بجائے جرح کے قریب کا معنی محسوس کرائے۔جیسے:صَالِحُ الْحَدِیثِ،یایُکْتَبُ حدیثُه۔صُوَیْلِحٌ۔

جرح کے بھی چھ مراتب ہیں جن کے الفاظ کی ترتیب درج ذیل ہے:

۱۔**فِیهِ مَقَالٌ**: ایسے الفاظ جرح جن میں نرمی ہو یہ ضعف کی انتہائی ہلکی مگر تعدیل کے قریب کی صورت ہے۔جیسے:فِیهِ مَقَال:اس کے بارے میں کچھ اقوال ہیں۔یافُلَانٌ لَیِّنُ الْحَدِیثِ۔فلان حدیث میں نرم ہے۔یاغَیرُهُ أَوْثَقُ مِنهُ:دوسرا اس سے زیادہ ثقہ ہے۔متابعت یا شاہد میں اسے تسلیم کیا جاتا ہے اور اگر منفرد ہو تو پھر نہیں۔

۲۔ **فُلَانٌ لَا یُکْتَبُ حَدِیثُهُ**: ایسے الفاظ جو راوی کی عدم کتابت حدیث کی صراحت کردیں۔جیسے:فُلَانٌ لَا یُکْتَبُ حَدِیثُهُ۔فلان سے حدیث نہیں لکھی جاتی۔یا لَا تَحِلُّ الرِّوَایةُ عَنْهُ۔فلاں سے روایت جائز نہیں۔یاوَاهٍ بِمَرَّةٍ۔وہ تو بہت ہی واہی ہے۔

۳۔ **رَدُّوا حَدِیثَهُ**: ایسے الفاظ جن میں راوی کے ناقابل حجت ہونے کی صراحت ہو یا اس سے ملتے جلتے الفاظ ہوں جن سے راوی کا شدید ضعف سامنے آتا ہو۔جیسے:رَدُّوا حَدِیثَهُ اس کی حدیث علماء نے رد کردی۔ضَعِیفٌ جِداً:بہت ہی ضعیف۔یالَهُ مَنَاکِیرُ:اس کی بہت سی منکر روایات ہیں۔

۴۔ **مُتَّهَمٌ بِالْکَذِبِ**: وہ الفاظ جن کے ذریعے علماء نقد نے راوی پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا جیسے: مُتَّهَمٌ بِالکِذْبِ:جھوٹ میں وہ متہم ہے۔اتَّهَمُوهُ:اسے علماء نے متہم کیا ہے۔یَسْرُقُ الْحَدِیثَ:وہ حدیث چوری کرتا ہے۔یاسَاقِطٌ، مَتْرُوكٌ، لَیْسَ بِثِقَةٍ وغیرہ۔

۵۔**کَذَّابٌ**: ایسے الفاظ جو راوی کے جھوٹا ہونے کو مبالغہ کی حد تک بتاتے ہوں جیسے: کَذَّابٌ بہت ہی زیادہ جھوٹا، وَضَّاعٌ بہت ہی زیادہ گھڑنے والا۔یَضَعُ الحدیثَ : وہ حدیث گھڑتا ہے۔یا دَجَّالٌ سب سے زیادہ دھوکہ دینے والا۔

۶۔**أَکْذَبُ النَّاسِ**: وہ الفاظ جو راوی کے عادۃً جھوٹا ہونے کے بارے میں آگاہ کریں۔یہ جرح کی انتہائی اعلیٰ قسم

ہے۔ جیسے: أَكْذَبُ النَّاسِ۔ لوگوں میں سب سے زیادہ جھوٹا۔ رُكْنُ الْكِذْبِ: جھوٹ کا ستون۔ یا إِلَيْهِ الْمُنْتَهَى فِي الْكِذْبِ۔ جھوٹ کی انتہاء اسی تک ہے۔

تعارض جرح وتعدیل: اس کا مطلب ہے کہ نقاد محدثین میں سے کچھ نے راوی کی تعدیل کی اور کہا: إنه ثقة: کہ وہ بلاشبہ ثقہ ہے۔ جبکہ کچھ یہ کہہ دیں: إِنَّهُ ضَعِيفٌ: وہ بلاشبہ ضعیف ہے۔

نوٹ: یہ تعارض اس فقہی یا اجتہادی مسئلے کے تعارض سے کم تر ہے جس میں فقہاء کرام عِنْدَهُ، عِنْدَهُمَا کہتے ہیں۔ مثلاً: وَمُدَّةُ الرَّضَاعَةِ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ ثَلٰثُونَ شَهراً وعِنْدَهُمَا سَنَتَانِ: مدت رضاعت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تیس ماہ ہے جبکہ امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک دو سال ہے۔ کیونکہ فقہ یا اجتہاد میں قوی دلیل کی ترجیح ہوتی ہے جب کہ جرح وتعدیل میں قوی وضاحت راجح ہوتی ہے۔

تعارض کی صورتیں: علماء نے اس کی چار صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

پہلی صورت: راوی کے بارے میں جرح اور تعدیل مبہم سی ہو۔ یعنی نہ جرح کا سبب بتایا گیا ہو اور نہ ہی تعدیل کا۔ اگر کوئی مبہم جرح کو قبول کرنے کا سوچتا ہے تو مبہم تعدیل کو بھی اصولاً وہ رد نہیں کرسکتا۔ ایسے ابہام میں راجح کو قبول کرنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ مثلاً راوی کو عادل کہنے والا کون ہے اور اس پر جرح کرنے والا کون؟ راوی کی ذاتی معلومات کسی اور سے مل جائیں یا جرح وتعدیل کے اسباب کا علم ہو جائے یا کثرت کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ ابہام دور ہوسکتا ہے۔

دوسری صورت: جرح اور تعدیل دونوں مفسر ہوں۔ یعنی ان کے بارے میں جرح اور تعدیل کے اسباب مفصل بیان شدہ ہوں۔ ایسی صورت میں جرح کو قبول کیا جائے گا اس لئے کہ جارح کے پاس علم زیادہ ہے۔ ہاں اگر معدل یہ کہہ دے: مجھے اس جرح کا سبب بھی معلوم ہے مگر وہ اب زائل ہو چکی ہے تو پھر معدل کا قول لیا جائے گا۔ امام خطیب بغدادی (الکفایۃ: ۱۲۳) میں فرماتے ہیں:

> اتَّفَقَ أَهْلُ الْعِلْمِ عَلَى أَنَّ مَنْ جَرَّحَهُ الْوَاحِدُ أَوِ الإِثْنَانِ، وَعَدَّلَهُ مِثْلَ عَدَدِ مَنْ جَرَّحَهُ، فَإِنَّ الْجَرْحَ أَوْلَى بِهِ۔ اہل علم کا اتفاق ہے کہ جس راوی کو ایک یا دو علماء حدیث جرح کردیں اور اسی طرح اس کی ایک یا دو علماء تعدیل کردیں تو جرح، تعدیل کی نسبت زیادہ اولیت رکھے گی۔

اس کی علت اور وجہ بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

وَالْعِلَّةُ فِي ذَلِكَ: أَنَّ الْجَارِحَ يُخْبِرُ عَنْ أَمْرٍ بَاطِنٍ قَدْ عَلِمَهُ، وَيُصَدِّقُ الْمُعَدِّلَ، وَيقولُ لَهُ: قَدْ عَلِمْتُ مِنْ حَالِهِ الظَّاهِرَةِ مَا عَلِمْتَهَا، وَتَفَرَّدْتُ بِعِلْمٍ لَمْ تَعْلَمْهُ مِنْ اخْتِبَارِ أَمْرِهِ، وَإِخْبَارُ الْمُعَدِّلِ عَنِ الْعَدَالَةِ الظَّاهِرَةِ لَا يَنْفِيْ صِدْقَ قَوْلِ الْجَارِحِ فِيْمَا أَخْبَرَ بِهِ، فَوَجَبَ لِذَلِكَ أَنْ يَكُونَ الْجَرْحُ أَوْلَى مِنَ التَّعْدِيْلِ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جارح ایک اندرونی معاملے کی خبر دے رہا ہوتا ہے اور معدل کی تصدیق کر رہا ہوتا ہے۔ اور گویا وہ اسے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ تم نے اس کے بظاہر حال کو جانا اور کہا اور میں نے اس کے بارے میں وہ جانا جو تم نہ جان سکے۔ معدل کی اس ظاہری عدالت کی خبر کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جارح کی معلومات کی نفی کر رہا ہے۔ اس لئے جرح، تعدیل سے اولی ہوگی۔

علمائے حدیث اس مبہم جرح کو قبول کرنے سے گریزاں ہیں جو تعدیل سے متعارض ہو۔ ہاں جب جرح، مفسر اور سبب کو واضح کرے تو پھر وہ تعدیل پر اسے مقدم رکھتے ہیں کیونکہ جارح مجروح کے اس حال کی خبر دے رہا ہوتا ہے جو وہ جانتا ہے اور یہ بلاشبہ معدل کے قول سے زائد ایک علم ہے۔ علماء حدیث بعض اوقات راویوں پر ایسی جرح کر دیتے ہیں جو اصولاً ان کی روایت کو رد نہیں کرتی اس لئے جرح کا مفسر قبول کرنا اولی ہے۔ ابن الصلاح (مقدمہ علم الحدیث:۱۰۶) میں لکھتے ہیں:

وأَمَّا الْجَرْحُ فَإِنَّهُ لَا يُقْبَلُ إِلَّا مُفَسَّرًا أَو مُبَيَّنَ السَّبَبِ، لِأَنَّ النَّاسَ يَخْتَلِفُونَ فِيمَا يُجَرِّحُ، فَيُطْلِقُ أَحَدُهُمْ الْجَرْحَ بِنَاءً عَلَى أَمْرٍ اعْتَقَدَهُ جَرْحاً، وَلَيْسَ بِجَرْحٍ فِي نَفْسِ الأَمْرِ، فَلَابُدَّ مِنْ بَيَانِ سَبَبِهِ، لِيَنْظُرَفِيهِ أَهُوَ جَرْحٌ أَمْ لَا؟ رہی جرح، تو وہ مفسر اور سبب کو بیان کرنے والی ہی قبول کی جائے گی۔ کیونکہ علماء جرح کرنے میں مختلف ہیں ان میں سے کوئی ایسی چیز کے بارے میں جرح کر دیتا ہے جو اس کے نزدیک تو جرح ہے مگر حقیقت میں وہ جرح نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ جاننا کہ آیا یہ جرح بھی ہے یا نہیں؟ سبب کی وضاحت ہونا ضروری ہے۔

مثال: امام شعبہؒ نے ابوالزبیر محمد بن مسلم بن تدرس کی روایت یہ کہتے ہوئے ترک کر دی کہ وہ اچھی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اور جو کتاب ہشیمؒ نے ان سے سنی تھی شعبہؒ نے اسے بھی پھاڑ ڈالا تھا۔ اور اپنے شاگرد رشید سوید بن عبدالعزیز کو منع کر دیا کہ ان سے حدیث اخذ کریں۔ امام طیالسیؒ نے شعبہؒ سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے: دنیا

میں اس سے بہتر کچھ نہ لگتا تھا کہ میں ابوالزبیر سے سوال کروں۔ میں اس غرض کے لئے مکہ آیا۔ میں بیٹھا ہوا تھا کہ محمد کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے کچھ پوچھا۔ محمد نے جو جواب دیا تو اس میں خوامخواہ کا الزام بھی لگا دیا۔ کسی نے کہا: ابوالزبیر! کیا تم ایک مسلمان پر الزام لگاتے ہو؟ انہوں نے جواب میں کہا: اس نے مجھے غصہ جو دلایا۔ شعبہؒ کہتے ہیں تو میں نے اس پر انہیں کہا: کیا مطلب جو آپ کو غصہ دلائے آپ اس پر الزام لگا دیں گے؟ میں تو آپ سے کچھ بھی روایت نہیں کروں گا۔

نوٹ: علماء حدیث کا کہنا ہے کہ شعبہؒ نے جو جرح کی وہ کسی خاص وجہ سے تھی جب کہ ابوالزبیر کا ضبط ایک دوسری شے ہے جس کا انکار کسی کو بھی نہیں۔ مزید علماء نے ان کی تعدیل فرمائی ہے اور شیخین نے ابوالزبیر کی احادیث کو روایت کیا ہے۔ پھر دوسری طرف امام شعبہؒ نے جابر بن یزید جعفی جیسے رافضی کی توثیق کی ہے: صَدُوقٌ فِي الْحَدِيثِ۔ اور کبھی کہا: إِذَا قَالَ حَدَّثَنَا فَهُوَ أَوْثَقُ النَّاسِ۔ جب کہ اس کے بارے سب جانتے ہیں کہ وہ واہی تباہی انسان تھا، جھوٹ بولتا تھا، یہ جرح مفسر باور کراتی ہے کہ ان علماء کو جعفی کے عقائد وعدالت اور اس کے ضبط کے بارے میں جو کچھ علم ہو سکا وہ امام شعبہ کو نہیں ہو سکا۔

تیسری صورت: تعدیل مبہم اور جرح مفسر ہو۔ ایسی صورت میں جرح قبول کر لی جائے گی وجہ یہ ہے کہ جارح کے پاس معدل سے زائد علم ہے۔

چوتھی صورت: جرح مبہم ہو اور تعدیل مفسر۔ یہاں تعدیل کو لے لیں گے اور جرح کو رہنے دیں گے۔

نوٹ: ان چار صورتوں کے بعد بھی ایک یہ صورت ہو سکتی ہے کہ جب ایک راوی کے بارے میں جرح مفسر اور تعدیل میں تعارض ہو تو کسی ایک کو دوسرے پر بالکل ترجیح نہ دی جائے بلکہ ایسی صورت میں معدل اور جارح کے مقام ومرتبہ، تجربہ ومہارت کو پرکھا جائے۔ پھر ان حالات وواقعات اور الفاظ واسباب پر غور کیا جائے جن کی بناء پر ان حضرات سے راوی کے بارے میں ایسے تنقیدی الفاظ ادا ہوئے۔ ورنہ احتیاطاً ترجیح، جرح کو ہی دی جائے۔ الغرض ایک راوی کے بارے میں اگر تعدیل وتجریح میں تعارض ہو تو علماء کے اس بارے میں تین اقوال ہیں:

۱۔ جرح کو تعدیل پر مقدم کریں گے خواہ معدلین کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو۔ (الکفایۃ: ۱۷۷، ارشاد الفحول: ۶۸)

۲۔ اگر معدلین زیادہ ہوں تو تعدیل کو جرح پر مقدم کیا جائے گا۔ یہ قول ضعیف ہے۔ (الکفایۃ: ۱۷۷، المحصول: ۴، ۴۱۱)

۳۔ جرح و تعدیل میں ایسا تعارض ہو کہ کسی کو بھی دوسرے پر مرجح کے بغیر ترجیح نہ دی جا سکے۔ (شرح الفیۃ العراقی: ۱، ۳۱۲)

جس راوی کے بارے میں کوئی جرح یا تعدیل صادر نہ ہوئی ہو مگر شیخین یا ان میں سے کسی ایک نے اس سے احتجاج کیا ہو تو ایسا راوی ثقہ ہوگا۔

ایسی جرح کو قبول کرنے میں توقف کیا جائے جس کا سبب عقیدہ میں اختلاف ہو یا معاصرین کی باہمی منافست ہو۔

رہی یہ بات کہ ایک ہی راوی کے بارے میں ایک ہی امام حدیث کے اقوال میں تعارض ہو اس وقت کیا کرنا چاہئے؟ اس کے لئے ہم اوپر لکھ آئے ہیں اور مزید تفصیل کے لئے فتح المغیث اور قواعد فی التحدیث کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

☆☆☆☆☆

صحیح یا ضعیف حدیث کو معلوم کرنے کا آسان طریقہ

تدوین حدیث، احوال رواۃ اور مفاہیم متن پر جب صحاح وسنن، مسانید، کتب الرجال اور شروح حدیث لکھ دی گئیں تو ہر حدیث کی صحت وضعف کو متعین کرنے کا ایک معیار بھی از خود متعین ہو گیا۔ امام ابن حجرؒ جو تخریج حدیث کے طویل دورانئے کا مسک الختام سمجھے جاتے ہیں صحیح وضعیف حدیث کو پہچاننے میں ان کے پیش کردہ مراتب کو محدثین نے انتہائی معتدل اور وقیع گردانا ہے۔ یہ مراتب انہوں نے متقدم علماء کے الفاظ جرح وتعدیل سے ماخوذ و متعین کئے ہیں جس کا تذکرہ انہوں نے اپنی معروف کتاب تقریب التہذیب میں کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی بھی حدیث کے بارے میں یہ معلوم کرنا آیا یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف؟

۱۔ سب سے پہلا کام یہ کیجئے کہ اس حدیث کے تمام راویوں کی ایک فہرست بنائیے اور ان کے تراجم میں مذکور اہم نکات کو لکھ لیجئے جیسا کہ تقریب میں انہوں نے ہر راوی کے تذکرہ کے آخر میں لکھے ہیں۔

۲۔ اگر کوئی راوی تقریب میں مذکور مراتب کے نمبر سات تا بارہ میں شامل ہوتا ہے تو یہ حدیث از خود ضعیف ہوگی۔ اور نا قابل قبول بھی۔

۳۔ ہر راوی کے سن وفات کو بھی نوٹ کیجئے تا کہ یہ معلوم ہو کہ جس سے روایت کر رہا ہے اسے یہ ملا بھی ہے؟ اگر نہیں ملا تو یہ روایت منقطع ہوگی اور ضعیف و نا قابل قبول۔

۴۔ راوی کے زمانہ کا موازنہ بھی اس کے بتائے ہوئے شیخ کے زمانہ سے کیا جائے تا کہ اس کے دعوائے روایت کا ثبوت مل جائے ورنہ یہ راوی پانچویں اور چھٹے مرتبے میں شامل ہو کر اپنی روایت سمیت ضعیف و مردود ہو جائے گا۔ اور اگر راوی چوتھے مرتبہ یا اس سے اوپر والے مرتبے سے جا ملتا ہے تو یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہو گا کہ آیا اس راوی کی کوئی استثنائی صورت تو نہیں؟ اگر ایسا نہیں تو پھر یہ روایت مرسل ہو گی اور دیگر راویوں کو پرکھنے کے لئے بطور ممکنہ مددگار کے ایک طرف رکھ دی جائے گی۔

۵۔ اگر حدیث کی سند بہ ظاہر متصل ہو مگر اس کا ایک آدھ راوی چوتھے یا پانچویں مرتبہ کا ہو تو ایسی حدیث حسن کہلائے گی اور بطور استدلال کام آئے گی۔

۶۔ اگر اس روایت کے تمام راوی ایک تا تین مرتبے سے تعلق رکھتے ہوں تو ایسی روایت صحیح ہو گی اور ہر حسن روایت پر ترجیح پا جائے گی۔

۷۔ دیگر اسانید حدیث کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے کیونکہ ہو سکتا ہے وہ کسی نچلے درجے کی روایت کو تقویت بخش دیں اور وہ حدیث حسن لغیرہ تا صحیح لذاتہ تک جا پہنچے۔

نوٹ: ان مراتب کو کتاب کے ص نمبر ۲۵۶-۷ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

خدا لگتی کی بات

جب فقہاء کرام کسی قول کے حکم پر اجماع کر لیں تو وہ سوائے حق کے اور کچھ نہیں ہوتا اسی طرح اہل الحدیث بھی جب کسی حدیث کے صحیح ہونے پر متفق ہو جائیں تو وہ سوائے سچائی کے اور کچھ نہیں ہو گی۔ مطلوب کے خفی اور جلی پر ہر ایک کے اپنے اپنے استدلال و براہین ہیں جو ان کے علماء ہی جانتے ہیں۔ اللہ تعالی بھی انہیں ایسے قضایا میں صواب کی راہ سجھاتا ہے جس پر بہت سے شرعی دلائل ہیں اور جسے ہونے والی شے کے تجربے سے ہم پہچان سکتے ہیں کہ اللہ تعالی نے صحابہ کرام کے دلوں میں ایمان کو لکھ دیا اور اپنی روح (رحمت) سے ان کی مدد فرمائی۔ جب انہوں نے اپنی دوستی کا معیار اللہ اور اس کے رسول سے سچی محبت کے ساتھ ظاہر کیا اور دشمنی کا معیار ان کی حکم عدولی کو جانا۔

خراج تحسین

گروہ ایک جویا تھا علم نبی کا　　لگایا پتا اس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا　　کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کیے جرح و تعدیل کے وضع قانون
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

اسی دھن میں آساں کیا ہر سفر کو　　اسی شوق میں طے کیا بحر و بر کو
سنا خازن علم دین جس بشر کو　　لیا اس سے جا کر خبر اور اثر کو
پھر آپ اس کو پرکھا کسوٹی پہ رکھ کر
دیا اور کو خود مزا اس کا چکھ کر

کیا فاش راوی میں جو عیب پایا　　مناقب کو چھانا مثالب کو تایا
مشائخ میں جو قبح نکلا جتایا　　ائمہ میں جو داغ دیکھا بتایا
طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا
نہ ملا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

رجال اور اسانید کے جو ہیں دفتر　　گواہ ان کی آزادگی کے ہیں یکسر
نہ تھا ان کا احساں یہ اک اہل دین پر　　وہ تھے اس میں ہر قوم و ملت کے رہبر
لبرٹی میں جو آج فائق ہیں سب سے
بتائیں کہ لبرل بنے ہیں وہ کب سے

مسدس حالیؒ

مصادر کتاب

۱۔ الباعث الحثيث	از امام ابن کثیرؒ
۲۔ تدريب الراوى	از امام سیوطیؒ
۳۔ميزان الاعتدال	از امام ذہبیؒ
۴۔تذكرة الحفاظ	از امام الذہبی
۵۔ سِيَرُ أعْلامِ النُّبَلاَءِ	از امام ذہبی
۶۔ كفاية الحفظة شرح المقدمة الموقظة	از ابواسامۃ الہلالی

الہدیٰ پبلی کیشنز کی مطبوعات

کتب

- قرآن مجید (اردو لفظی ترجمہ)
- منتخب آیات قرآنیہ
- منتخب سورتیں
- منتخب سورتیں اور آیات
- تعلیم القرآن القراءۃ والکتابۃ
- قرآن کریم اور اس کے چند مباحث
- حدیث رسولؐ ایک تعارف ایک تجزیہ
- حفاظت حدیث کیوں اور کیسے؟
- قال رسول اللہ ﷺ
- رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا
- صدقہ وخیرات
- حسن اخلاق
- فتنوں کے دور میں کیا کرنا چاہیے؟
- محمد رسول اللہ معمولات اور معاملات
- عربی گرامر
- اسلامی عقائد
- فقہ اسلامی ایک تعارف ایک تجزیہ
- میرا جینا میرا مرنا
- آخری سفر کی تیاری
- بیوگی کا سفر
- ابوبکر صدیقؓ
- والدین ہماری جنت
- حصول علم اور خواتین

پمفلٹس

- نماز باجماعت کا طریقہ
- نمازِ فجر کے لیے کیسے بیدار ہوں؟
- جمعہ کا دن مبارک دن
- نماز استسقاء
- درودوسلام ۔۔۔ الصلاۃ علی النبی ﷺ
- غسل میت اور کفن پہنانا
- اظہار محبت کیسے؟
- ان حالات میں کیا کریں؟

دعائیں

- قرآنی اور مسنون دعائیں
- وایاک نستعین
- نبی اکرمؐ کے صبح وشام کے اوراد
- نماز کے بعد کے مسنون اذکار
- نماز تہجد کے لیے دعائے استفتاح
- حصول علم کی دعائیں
- فہم قرآن میں مددگار دعائیں
- آیات شفا
- مقبول دعائیں
- سفر کی دعائیں
- دعائے استخارہ
- صالح اولاد کے لیے دعائیں
- نظر بد اور تکلیف کی دعائیں
- سوتے میں وحشت کی دعائیں
- دشمن کے شر سے حفاظت کی دعائیں
- میت کی بخشش کی دعاء

اسلامی مہینے

- محرم الحرام
- صفر کا مہینہ اور بدشگونی
- رجب اور شب معراج
- شعبان المعظم
- روزے کے احکام
- رمضان المبارک مسنون دعائیں
- رمضان المبارک اور خواتین
- عید الفطر
- حج بیت اللہ
- رہبر حج
- زادِ راہ
- لبیک عمرہ
- عشرہ ذوالحجہ، عیدالاضحٰی اور قربانی
- تکبیرات
- عید کارڈز

پوسٹرز

- نماز فجر کے لیے کیسے بیدار ہوں؟

جائزہ لسٹ

- صلوۃ ٹائم
- نبی کریمؐ کے لیل ونہار کی روشنی میں
- رسول اللہ ﷺ سے میرا تعلق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الھدیٰ ایک نظر میں

الھدیٰ انٹرنیشنل ویلفیئر فاؤنڈیشن پاکستان، قرآن وسنت کی تعلیم اور خدمت خلق کے کاموں میں 1994ء سے کوشاں ہے۔ الحمدللہ آج نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے کئی ممالک میں اس کی شاخیں اسی مقصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ فاؤنڈیشن کے تحت درج ذیل شعبہ جات کام کر رہے ہیں۔

شعبۂ تعلیم وتربیت: اس شعبہ کے تحت قرآن وسنت کی تعلیم اور طالبات کی تربیت وکردار سازی کے لیے مختلف دورانیے کے درج ذیل کورسز کروائے جاتے ہیں:

- تعلیم القرآن: مکمل قرآن مجید کا لفظی ترجمہ وتفسیر، تجوید، حدیث وسیرت النبی ﷺ اور فقہ العبادات پر مشتمل کورسز ہیں۔
- ناظرہ وتجوید اور تحفیظ القرآن: قرآن مجید کو درست پڑھنے اور حفظ کے کورسز ہیں۔
- تعلیم الحدیث: صحیح بخاری، ریاض الصالحین کے منتخب ابواب اور علوم الحدیث پر مبنی ہیں۔
- روشنی کا سفر: یہ کورس کم پڑھی لکھی لڑکیوں کے لیے اسلامی تعلیمات پر مشتمل کورس ہے۔
- روشنی کی کرن: ناخواندہ خواتین ولڑکیوں کی تعلیم وتربیت کورس ہے۔
- ریالٹی بیچ: انگریزی زبان میں ہفتہ وار تعلیمی پروگرام ہے۔
- منارالاسلام: بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے ہفتہ وار پروگرام اور ناظرہ قرآن کی تعلیم کے لیے مفتاح القرآن پروگرام ترتیب دیا گیا ہے۔
- فہم القرآن: رمضان المبارک میں روزانہ ایک پارہ کے ترجمہ اور فہم پر مبنی پروگرام ہے۔
- سمر کورسز: گرمیوں کی چھٹیوں میں ہر شعبہء زندگی سے تعلق رکھنے والی ہر عمر کی خواتین، لڑکیوں اور بچوں کے لیے مختصر دورانیے کے کورسز پڑھائے جاتے ہیں۔
- الھدیٰ کیمپس اور برانچز میں تدریس کے علاوہ گھر بیٹھے بذریعہ خط وکتابت اور آن لائن تعلیم حاصل کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

شعبۂ نشر و اشاعت: قرآن و سنت کی تعلیم کو عامۃ الناس تک پہنچانے کے لیے الہدیٰ پبلی کیشنز کے تحت مختلف موضوعات پر کتب، کارڈز، کتابچے اور پمفلٹس چھپوائے جاتے ہیں اور ان کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی شائع کیا جاتا ہے۔

- قرآن مجید کی قراءت، ترجمہ و تفسیر، حدیث و سیرت النبی ﷺ، مسنون دعاؤں اور روزمرہ زندگی کے مسائل سے متعلق رہنمائی پر مبنی آڈیو کیسٹس (Audio)، سی ڈیز (c.d) اور وی سی ڈیز (v.c.d) تیار کی جاتی ہیں۔ اسی طرح ریڈیو، ٹی وی اور کیبل چینلز پر چلانے کے لیے بھی پروگرام تیار کیے جاتے ہیں۔
- تحریری اور صوتی مواد مندرجہ ذیل ویب سائٹس: www.farhathashmi.com www.alhudapk.com سے بلا معاوضہ ڈاؤن لوڈ کر کے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

شعبۂ خدمت خلق: کے تحت متعدد معاشرتی خدمات سرانجام دی جا رہی ہیں۔ مثلاً

- ذہین اور مستحق طلبہ کے لیے تعلیمی وظائف
- کچی بستیوں میں تعلیمی اور رفاہی کام
- روزگار کی فراہمی ٹھیلے اور سلائی مشینیں مہیا کر کے
- بیوہ اور نادار خواتین کے لیے ماہانہ وظائف
- میرج بیورو بلا معاوضہ سہولت
- دینی و سماجی رہنمائی
- کفن کی دستیابی
- خاتون کی میت کو غسل دینے کا بندوبست
- رمضان المبارک میں راشن کی فراہمی
- عیدالاضحیٰ کے موقع پر اجتماعی قربانی
- کنوؤں کی کھدائی کے ذریعے خشک علاقہ جات میں پانی کی فراہمی
- فری میڈیکل کیمپوں کا قیام
- مستحق افراد کے لیے ماہانہ راشن اور کپڑوں کی تقسیم
- قدرتی آفات کے موقع پر ممکنہ ضروری امداد

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ضابطے اور اصول جو حدیث رسول کی بحث و تحقیق کے لئے متعارف ہوئے نہایت معتدلانہ ہیں۔ یہ مختصر اور مدلل مصطلحات اس سارے علم کا نچوڑ ہیں جو خیر الکلام ما قل و دل کی عکاس ہیں۔ یہ کن لینا۔۔ یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف وموضوع۔۔ بہت آسان ہے مگر ان مصطلحات کے پس منظر میں اس محنت اور محتاط تحقیق کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جو ماہرین فن نے اپنے حافظے سے یا کتب کے انبار میں بیٹھ کر ایک ایک راوی اور ایک ایک متن کا مطالعہ کر کے ان میں صحیح ترین یا گئی گذری حدیث کا انتخاب کیا۔ اور اسے ایک نام دیا۔ یہ بے لاگ ضابطے ہیں جو کسی بھی علم کو نتھارنے کے لئے اس کے ماہرین کو وقت ضرورت کام دے سکتے ہیں جس میں سوائے صحابہ رسول کے اور کسی کو استثناء حاصل نہیں۔

ISBN 978-969-8665-51-7

04010004

پبلی کیشنز
AL-HUDA PUBLICATIONS